قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ۔ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ۔ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ۔
وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ (البروج)

مذہب کے نام پر

خون

مرزا طاہر احمد

انتساب

اُن معصوم روحوں کی یاد میں

جو

اس دنیا کی زندگی میں

انسان کے ظلم واستبداد

کا

نشانہ بنی رہیں

فہرست

مذہب کے نام پر خون

پیش لفظ

عقائد کا اختلاف تو دنیا میں ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا اور انسان اس بارہ میں کلیۃً آزاد ہے اور اپنے دلی یقین کے مطابق جو عقیدہ چاہے اپنائے اور اپنی نجات جن نظریات میں چاہے تصور کرے مگر یہ حق کسی کو نہیں دیا جا سکتا کہ اپنے عقائد کو جبراً کسی پر ٹھونسنے کی کوشش کرے یا ایسے عقائد کے مطابق عمل پیرا ہو جو ظلم اور تعدی کی تعلیم دیتے ہوں۔ یہ طریق جب بھی اختیار کیا جائے گا ہمیشہ ایک لامتناہی فساد کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

اختلافات معقول حد تک دور کرنے یا سچائیوں کو پھیلانے کا ایک اور صرف ایک طریق ہے کہ امن اور سلامتی کے ماحول میں ہر تعصب سے پاک ہو کر ایک دوسرے تک اپنے خیالات کو پہنچایا جائے اور ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو دیانتداری کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ جس قدر اختلافات شدید ہوں گے اسی قدر اس معاملہ میں حلم، بردباری اور متانت کی زیادہ ضرورت ہو گی۔ اور اس بات کی ضرورت ہو گی کہ اشد ترین مخالف کے معاملہ میں بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور نظریاتی اختلافات پر سیخ پا ہو کر نعرہ ہائے جنگ بلند کرنے کی عادت ترک کر دی جائے۔

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے دوسرے مشرقی ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی ایسی پاکیزہ اور پُرامن فضاء کا فقدان ہے اور ایک ایسے کم تربیت یافتہ گھوڑے کی طرح جو ذرا سی تیز قدمی کے اشارہ پر اپنی ''چال'' کے سب قواعد

بھول کر سر پٹ ہو جانے کا عادی ہو ہم بھی اپنی اختلافی گفتگو میں ضبط اور بردباری کے سب دائرے توڑ کر نکل جاتے ہیں۔

ان چند صفحات میں ان نظریات اور طریقہ ہائے عمل کا ایک تجزیاتی مطالعہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جو بار ہا ملکی فضا کو مکدّر کرنے کا موجب بن چکے ہیں اور بن رہے ہیں۔

مرزا طاہر احمد

پیش لفظ

(جدید ایڈیشن)

۱۹۵۳ء میں پاکستان کی سرزمین میں فرقہ واریت کے جو کڑوے بیج بوئے گئے تھے بعد کے سیاسی طالع آزماؤں نے ان کی آبیاری کی اور آج یہ حال ہے کہ سارے ملک میں فرقہ واریت کی خاردار جھاڑیاں پھیل گئی ہیں جن سے لاکھوں افراد لہولہان ہوئے اور ملک سے امن اور یکجہتی رخصت ہو گئے ہیں اور آج عالمی سطح پر مسلمانوں کو دہشت گرد اور جہاد کو جارحیت کے مترادف سمجھا جاتا ہے لیکن کیا واقعی اسلام دہشت پسندی اور قتل و غارت گری کی تعلیم دیتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسلام کے تو معنی ہی امن و سلامتی کے ہیں۔ قرآن کریم کی تعلیمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ تو فرد، معاشرہ، قوم اور بین الاقوامی سطح پر صلح و آشتی اور امن و سلامتی کی ضمانت دیتے ہیں لیکن پھر یہ فاسد افکار کیسے مسلمانوں کے اذہان میں داخل ہوئے اور کون اس کا ذمہ دار ہے اسلام کے نادان دوست یا متعصب مستشرقین؟ ان سوالات کا جواب آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔

یہ کتاب سب سے پہلے دسمبر ۱۹۶۲ء میں اردو زبان میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۸۹ء میں اس کا انگریزی ترجمہ MURDER IN THE NAME OF ALLAH کے نام سے شائع ہوا تو اہل مغرب کی اسلام کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے اس میں متعدد ابواب کا اضافہ کیا گیا۔ زیر نظر ایڈیشن میں ان ابواب کا اردو ترجمہ شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب اردو اور انگریزی کے علاوہ عربی، روسی اور دنیا کی مشہور زبانوں میں اب تک شائع ہوئی ہے اور متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ اس کا مطالعہ آپ کو اصل حقائق تک پہنچنے میں مدد دے گا۔ انشاء اللہ العزیز

ناشر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

انسان کی تاریخ خاک وخون میں لتھڑی پڑی ہے ۔اس دن سے لے کر آج تک جب قابیل نے ہابیل کوقتل کیا تھااس قدر خون ناحق بہایا گیا ہے کہ اگر اس خون کو جمع کیا جائے تو آج روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے کپڑے اس خون میں رنگے جاسکتے ہیں بلکہ شائداس پر بھی وہ خون بچ رہے اور ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کے لباس بھی لالہ رنگ کرنے کے لئے کافی ہومگر مقام حیرت ہے کہ اس پر بھی آج تک انسان کی خون کی پیاس نہیں بجھی!

قابیل کے ہاتھوں ہابیل کاقتل وہ پہلا خون ناحق ہے جس کا ذکر قرآن اور بائیبل نے آج تک ہمیں عبرت دلانے کے لئے محفوظ کر رکھا ہے اور یہ ذکر اس دن تک محفوظ رہے گا جس دن آخری انسان صفحہ ہستی سے نابود کیا جائے گا اور زمین کی صف لپیٹ دی جائے گی ۔لیکن انسان جب تاریخی پس منظر میں انسانی کردار کا مطالعہ کرتا ہے اور پھر آج کی دنیا میں اپنے حال، اپنے گردوپیش پر ایک نظر دوڑاتا ہے تو یہ انکشاف ایک طعنہ بن کر اس کے دل میں پھانس کی طرح چبھنے لگتا ہے کہ انسان پہلے بھی ظالم تھا اور آج بھی ظالم ہے۔ پہلے بھی جابر تھا اور آج بھی جابر ہے۔اس کی سفاکی کی داستان طویل ہے اور اس داستان کے ابواب لامتناہی ہیں اور وہ خون کی پیاس جو قابیل کے دل میں بھڑکی تھی آج بھی ان گنت سینوں میں بھڑک سکتی ہے۔ یہ وہ آگ ہے کہ جو ہزاروں سال کی سیرابی کے بعد بھی ٹھنڈی نہ ہوسکی!

انفرادی قتلوں کی مثالیں بھی لاتعداد ہیں ، بے شمار ہیں اس خون اجتماعی کی مثالیں بھی جو قوموں نے قوموں کے بہائے ،سمندر کی نہ تھکنے والی لہروں کی طرح ایک خطہ ارض کے بسنے والوں نے دوسرے خطہ ارض کے بسنے والوں پر چڑھائیاں کیں اور ہجوم در ہجوم اور غول در غول غارت گروں کے لشکر نئے ممالک کی تسخیر کے لئے نکلے۔قیصر نے بھی خون بہایا اور کسریٰ نے بھی۔اسکندر اعظم کے

ہاتھ بھی خون سے رنگین ہوئے اور نیرو کے بھی۔اور ہلاکو اور چنگیز کے ہاتھوں بغداد کی تباہی آج تک تاریخ کے اوراق کو شفق رنگ بنائے ہوئے ہے۔

یہ خون کبھی عزت وناموس کے نام پر کئے گئے کبھی بغض وعناد کی بناء پر۔کبھی رزق کی تلاش میں نکلی ہوئی فاقہ کش قوموں نے یہ مظالم ڈھائے اور کبھی محض تسخیر عالم جابر شہنشاہوں کا مطمح نظر تھی۔ پھر ایسا بھی بہت مرتبہ ہوا کہ یہ خون ریزیاں خود خدا کے ہی نام پر کی گئیں اور مذہب کو آڑ بنا کر سفاکانہ بنی نوعِ انسان کا خون بہایا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے اور اپنے کردار کا یہ رخ دیکھ کر انسان کا دل بسا اوقات یاس ونا امیدی سے بھر جاتا ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا اسی لئے انسان کو پیدا کیا گیا تھا؟ ایک مذہب تھا کہ جس سے یہ توقع تھی کہ انسان کو انسانیت کے آداب سکھائے گا مگر خود اس کا دامن بھی خون آلود نظر آتا ہے۔

یہ سوال طبعاً دل میں پیدا ہوتا ہے اور معاً خلق آدم کے اس واقعہ کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے جس کا ذکر قرآن اور بائیبل دونوں میں موجود ہے۔قرآن کریم اس واقعہ کو یوں بیان فرماتا ہے کہ:۔

> وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرة:۳۱)
>
> ’’اس وقت کو یاد کر، جب تیرے ربّ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں ۔فرشتوں نے کہا کہ کیا تو وہاں ایک ایسا شخص بنائے گا جو اس میں فساد کرے اور خون بہائے حالانکہ ہم تو تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور قدوسیت کے گن گاتے ہیں ۔خدا تعالیٰ نے فرمایا میں زیادہ جانتا ہوں ان امور کو جن کی تمہیں کچھ خبر نہیں۔‘‘

خدا تعالیٰ اور فرشتوں کا یہ مکالمہ پڑھ کر کچھ دیر کے لئے تو انسان ایک عجیب شش وپنج میں مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ مذہب کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے تو بظاہر فرشتوں ہی کی بات درست معلوم

ہوتی ہے اور انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ اگر فرشتوں کا قول درست تھا تو خدا تعالیٰ نے پھر کیوں ان کے مشورہ کو ٹھکرا دیا اور اس اعتراض کو رد فرما دیا جو اس کی نیابت یعنی سلسلہ نبوت پر وارد ہوتا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کے حقیقی نائب یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم اس کی زد میں آتے تھے۔ایک طرف اگر ہم مذہب کی تاریخ کا مطالعہ کریں خواہ دنیا کے کسی حصہ سے تعلق رکھتی ہو، شمال کی ہو یا جنوب کی، مشرق کی ہو یا مغرب کی، ہمیں مذہب کے نام پر کئے ہوئے ایسے ایسے ہولناک مظالم کا پتہ چلتا ہے کہ ان کے پڑھنے سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور نظر مذہبی قدروں سے مایوس ہو کر تھکی ہاری لوٹ آتی ہے۔اس وقت دل میں کچھ اس قسم کے خیالات منڈلانے لگتے ہیں کہ ؎

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

مذہب جس سے توقع تھی کہ وہ انسانیت کو فساد اور خون ریزی سے نجات دلائے گا وہ تو خود ہی انسانیت کے خون میں ملوث نظر آتا ہے۔

دوسری طرف جب خدا تعالیٰ کے اس قطعی فیصلہ کی طرف انسان کی نظر اٹھتی ہے کہ مذہب ہرگز فساد اور خون ریزی کی غرض سے قائم نہیں کیا جا رہا بلکہ یہ خیال کم علمی کی پیداوار ہے اور سراسر بے بنیاد ہے تو اگر چہ تعجب کم نہیں ہوتا مگر یاس کی تاریکی میں امید کی ایک کرن پھر روشن ہو جاتی ہے۔ انسان خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ خدا تعالیٰ کے اس فیصلہ کو دیکھتا ہے کہ وہی نائب حقیقی جس سے متعلق فرشتوں نے اس شبہ کا اظہار کیا تھا کہ وہ زمین میں فساد کرے گا خدا تعالیٰ کے حضور مصلح اعظم کا مقام پاتا ہے اور اس کے مذہب کا نام ہی ''اسلام'' رکھا جاتا ہے یعنی سلامتی اور امن کا مذہب۔سوال مگر پھر بھی قائم رہتا ہے یہ مانا کہ عالم الغیب خدا کا فیصلہ درست ہے اور باقی سب اندازے غلط مگر پھر وہ مقام کونسا ہے جہاں پہنچ کر تاریخ مذاہب پر دوڑنے والی ایک سرسری نظر ٹھوکر کھا جاتی ہے اور وہ مغالطہ کیا ہے جس میں پڑ کر بعض مذہب کے مخالفین یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ مذہب امن کے نام پر فساد اور سلامتی کے نام پر خون ناحق کی تعلیم دیتا ہے۔

قرآن کریم نہایت ہی لطیف پیرائے میں اس مغالطہ کی نشاندہی کرتا ہے اور بڑی وضاحت

کے ساتھ بار بار مذاہب کی تاریخ کے مختلف حوالہ جات سے یہ ثابت فرماتا ہے کہ مذہب کے نام پر ظلم کرنے والے ہمیشہ یا تو لا مذہب ہوا کرتے ہیں یا پھر وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر حقیقی مذہب کا شائبہ بھی باقی نہیں ہوتا اور جن کے مذہب امتدادِ زمانہ سے بگڑ کر کچھ کا کچھ بن چکے ہوتے ہیں یا پھر ایسے مذہبی علماء اس ظلم کے ذمہ دار ہوتے ہیں جن کا مذہب سے تعلق محض نام کا ہوتا ہے اور ان کے دل روحانیت، رحمت، شفقت اور خدمت خلق کے پاکیزہ مذہبی جذبات سے عاری ہو کر چالاکی، ریاکاری اور سفاکی کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔ پس ایسے مذہبی راہنماؤں کی بداعمالیاں مذہب کی طرف منسوب کرنا مذہب پر ایک بڑا بھاری ظلم ہے اور حق بات یہی ہے کہ وہ خدا جو تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے کسی مذہب کے ماننے والوں کو اپنے بندوں پر ظلم کی تعلیم نہیں دے سکتا۔

قرآن کریم نے تاریخ عالم سے بعض مثالوں کو پیش فرما کر تصویر کا رخ ہی یکسر بدل دیا ہے اور پانسے کو ایسا پلٹا ہے کہ الزام دینے والے خود موردالزام بن گئے۔ چنانچہ قرآن کریم اپنے دعویٰ کی تائید میں انبیاء کے ابتدائی زمانہ کو ایک معیار اور کسوٹی کے طور پر پیش فرماتا ہے اور بار بار مختلف انبیاء کی جماعتوں کا ذکر کر کے ان کے تاریخی حالات سے یہ استدلال فرماتا ہے کہ مذہب کی طرف سے اگر کوئی ظلم روا رکھا جاتا تو ظاہر بات ہے کہ سب سے زیادہ ظلم کرنے والے خود مذہب کے بانی ہوا کرتے یا ان کے وہ متبعین ہوتے جنہوں نے اس مذہب کو خود اس مذہب کے بانی سے سیکھا اور اسی سے تعلیم پائی اور اسی کے اسوہ کے مطابق اپنے اعمال اور اخلاق کو ڈھالا نہ کہ وہ لوگ جو ان لوگوں کے بہت بعد پیدا ہوئے اور یا تو انہوں نے مذہب کو بگڑی ہوئی حالت میں دیکھا اور اسی کی تقلید کرتے رہے یا اپنی اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے اپنے ہی خیالات کی پیروی کرتے رہے اور اپنی مذہبی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا لیکن بظاہر یہ سب کچھ مذہب ہی کے نام پر کیا گیا۔

مذہب کی جو تاریخ قرآن کریم بیان فرماتا ہے اس میں بار بار ہمیں ایسے نظارے نظر آتے ہیں کہ ظلم تو کیا جا رہا ہے مذہب کے نام پر مگر کیا جا رہا ہے لا مذہب لوگوں کی طرف سے۔ تشدد تو کیا جا رہا ہے خدا کے نام پر مگر کیا جا رہا ہے ایسے لوگوں کی طرف سے جو خدا کے حقیقی تصور سے ہی ناآشنا تھے۔ چنانچہ قرآن کریم حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام سے متعلق فرماتا ہے کہ جب نوحؑ نے

دنیا کو ہدایت اور نیکی کی طرف بلایا تو نوحؑ ظالم نہیں تھے بلکہ وہ لوگ ظالم تھے جو بزور بازو نوحؑ کی آواز کو دبا دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان لوگوں نے حضرت نوحؑ کے پیغام کو سن کر کہا:۔

لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ يٰنُوۡحُ لَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمَرۡجُوۡمِيۡنَ (الشعراء:۱۱۷)

کہ اے نوح! اگر تم اپنے اس مذہب سے باز نہ آئے اور اپنا موجودہ رویہ تبدیل نہ کیا تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔

گویا قرآن کریم کی رو سے مذہب کے نام پر ظلم سچے مذہب کے ماننے والوں پر ہوا ہے سچے مذہب کے ماننے والوں نے نہیں کیا۔ پھر حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال آتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے امن اور محبت اور ہمدردی اور حلم کے ساتھ دنیا کو خدا کے سچے رستے کی طرف بلایا۔ ان کے ہاتھ میں کوئی تلوار نہیں تھی، کوئی تشدد کا حربہ نہیں تھا، کوئی ظلم کا ذریعہ نہیں تھا لیکن ابراہیم کی قوم کے سرداروں نے بھی وہی کچھ کہا جو اس سے پہلے نوحؑ کے زمانہ کے لامذہب لوگوں نے کہا تھا۔ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ (مریم:۴۷) کہ ''اگر اپنے اس عقیدہ اور تبلیغ سے باز آ جاؤ تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہیں ضرور سنگسار کر دوں گا۔'' یہ الفاظ آذر نے حضرت ابراہیمؑ سے کہے تھے۔ اب دیکھئے کہ بعینہٖ وہی الفاظ جو حضرت نوحؑ کے زمانے کے لامذہب لوگوں نے حضرت نوحؑ سے متعلق استعمال کئے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کے لامذہب لوگوں نے بھی حضرت ابراہیمؑ سے متعلق انہیں الفاظ میں دھمکیاں دیں، اسی طرح تحقیر کا نشانہ بنایا گیا، ویسا ہی ان سے تمسخر کیا گیا اور پہلوں کی طرح ان کو بھی زدوکوب کیا گیا اور عذاب دیئے گئے مگر وہ حلم اور صبر کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ حضرت ابراہیمؑ پر بھی ایک مخالفت اور فتنے کی آگ بھڑکا دی گئی اور ظاہراً رنگ میں بھی ان کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال کر زندہ جلانے کی کوشش کی گئی۔

حضرت لوطؑ کے وہ منکرین جو مذہب کی حقیقت سے ناآشنا تھے انہوں نے بھی مذہب ہی کا نام لے کر حضرت لوطؑ اور حضرت لوطؑ کے ماننے والوں پر ظلم ڈھائے اور ان کو بھی اسی قسم کی دھمکیاں دی گئیں۔ چنانچہ حضرت لوطؑ کے نہ ماننے والوں نے آپؑ کو اپنے ملک سے نکالنے کی دھمکی دی اور

بار بار حملہ کر کے چڑھ آتے رہے اور دھمکاتے رہے اور ڈراتے رہے کہ کسی طرح یہ اپنے مذہب کی پر امن تبلیغ سے باز آ جائیں۔ اور حضرت شعیبؑ کے مخالفین نے بھی یہی طریق اختیار کیا اور حضرت شعیبؑ سے کہا لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ (الاعراف:۸۹) کہ اے شعیب! یا تو ہم تم کو اور جو لوگ تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنے شہر سے نکال دیں گے یا تم ہمارے مذہب میں ضرور واپس آ جاؤ گے۔ یعنی تم پر اتنی شدت کی جائے گی، اتنی سختی کی جائے گی کہ زندگی تم پر اجیرن ہو جائے گی۔ تم نے ارتداد کا جو طریق اختیار کیا ہے یعنی ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کی پیروی شروع کر دی ہے یہ طریق تمہیں بہر حال بدلنا پڑے گا اس لئے ہم تمہیں یہ موقع دے رہے ہیں اور تمہیں متنبہ کر رہے ہیں۔ ’’اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ؟‘‘ حضرت شعیبؑ نے فرمایا کہ کیا اس صورت میں بھی ہمارا دل تمہارے مذہب کی تائید نہ کرتا ہو؟ کیا اس طرح بھی دنیا میں کسی کو کسی مذہب کا پیرو اور پابند کیا جاتا ہے؟ دل گواہی دیتا ہو کہ وہ مذہب جھوٹا ہے اور بے اختیار اس مذہب سے بھاگ کر کسی پُر امن مذہب کی امان میں آ جانا چاہتا ہو تب بھی کیا اسے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے دل کی گواہی کے خلاف، اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف ایک ایسے عقیدہ کو قبول کرلے جس پر اس کا دل تسلی نہیں پاتا؟

’’قتل مرتد‘‘ کے خلاف حضرت شعیبؑ کی یہ ایک ایسی چٹان کی طرح مضبوط اور ناقابل تردید دلیل ہے کہ آج تک اس کا جواب کسی سفاک سے بن نہیں پڑا کیونکہ ہر انسانی عقل اور ہر انسانی دل اس امر پر ہمیشہ سے شاہد ہے کہ تلوار کو نہ کبھی پہلے دلوں پر حکومت نصیب ہوئی نہ کبھی آئندہ ہوگی۔ اسے ہڈیوں اور گوشت پوست پر تو اختیار حاصل ہو جاتا ہے مگر عقل اور جذبات اور عقائد کی دنیا تک اس کی کوئی رسائی نہیں۔ یہ انسانی فطرت کی ایک غیر مبدل آواز ہے اور یہ بنیادی فطرت وہی ہے جو آدمؑ کو عطا ہوئی تھی اور دنیا کا سب سے آخری انسان بھی اسی فطرت پر مرے گا۔ انسان کی یہ فطرتی آواز کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی اور وہ مظلوم جن کو مذہب کے نام پر مذہب سے ناآشنا رہنماؤں نے مرتد ٹھہرا کر واجب القتل قرار دیا ہے ان کے دلوں کی آواز ہمیشہ اسی طرح بلند ہوتی رہے گی کہ کیا تم ہمیں اپنے بگڑے ہوئے عقائد کو ماننے پر اس وقت بھی مجبور کر رہے ہو جبکہ ہمارا دل ان سے یکدفعہ

بے زار ہو چکا ہے؟ مگر حسرت کا مقام ہے کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے اور مذہب کے نہ ماننے والوں نے ہر نبی اور اس کی قوم پر ارتداد کے فتوے لگائے، انہیں واجب القتل قرار دیا اور ظلم وستم کی وہ وہ راہیں ایجاد کیں کہ ان کے ذکر سے بھی انسانیت شرما جاتی ہے۔

پھر دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام اور آپؑ کے متبعین سے بھی یہی ہوا اور فرعون نے بھی وہی کہا جو اس سے پہلے گزشتہ قوموں کے نام نہاد مذہبی لیڈر کہا کرتے تھے اور وہی ظلم کی راہ اختیار کی جو خدا کے برگزیدہ بندوں سے متعلق ازل سے ظالم اختیار کرتے آئے تھے۔ چنانچہ فرعون نے اپنے متبعین کو حکم دیا:۔

اُقْتُلُوْا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ (المومن:۲۶)

کہ اے میرے مطیع اور فرمانبردار ارباب اقتدار! ان لوگوں کو جو موسیٰؑ پر ایمان لائے جبر کے ساتھ باز رکھو اور ''ان کے بیٹوں کو تو قتل کر دو اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھو۔''

پس دیکھئے کہ مذہب کے نام پر جرم ارتداد کی یہ سزا بھی انبیاءؑ کی جماعتوں نے نہیں دی بلکہ انبیاءؑ کی جماعتوں کو دی گئی۔ پھر اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی کیسے کیسے مظالم کا نشانہ بنایا گیا یہاں تک کہ دشمنوں نے عملاً ان کو سولی پر چڑھا کر مارنے کی کوشش کی اور ان کے ماننے والوں پر بھی کئی قسم کے مظالم ڈھائے۔ پس یہ سلسلہ ظلم وستم جو آج تک مذہب کے نام پر روا رکھا گیا ہے اور جس کا نام ہمیشہ ارتداد کی سزا رکھا گیا اس کی ہرگز کوئی سند بھی مذہبی صحیفوں میں نہیں ملتی۔ میری مراد ہے ان صحیفوں میں نہیں ملتی جو صحیفے خدا تعالیٰ نے اپنے انبیاءؑ پر اتارے ان کی بگڑی ہوئی صورت میں انبیاءؑ کے گزر جانے کے سینکڑوں سال بعد اگر بعد کے بددیانت لوگوں نے ان میں کتر بیونت کر کے یا اپنے خیالات ٹھونس کر ان میں ظلم کی تعلیم بھر دی ہو تو خدائی صحیفے اس سے بری الذمہ ہیں۔

قرآن کریم نے تاریخ مذاہب کے ناقابل تردید حوالہ جات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انبیاءؑ اور ان پر ایمان لانے والے مخلصین دنیا کے مظلوم ترین لوگ تھے جن پر شدید مظالم ڈھائے گئے لیکن انہوں نے نہایت صبر اور استقامت کے ساتھ محض خدا کی خاطر ان مظالم کو برداشت کیا۔ اس تاریخ کو

پڑھنے کے بعد دنیا کا کوئی انسان جو ذرا سی عقل بھی اپنے اندر رکھتا ہو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مذہب کی طرف سے مذہب کو چھوڑنے پر ظلم روا رکھا جاتا رہا ہے۔خدا کے انبیاء ؑ تو ایک مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب میں داخل ہونے کی تعلیم دیتے ہیں ۔ جب وہ خود یہ تعلیم دیتے ہیں تو وہ یہ کس طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ محض اس بناء پر کہ کوئی شخص کسی مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں داخل ہو رہا ہے اس پر کسی قسم کا ظلم یا جبر روا رکھا جائے ۔قرآن کریم سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ظلم صرف انہی پر نہیں کیے جاتے جو انبیاءؑ پر ان کے دور اوّل میں ایمان لاتے ہیں بلکہ انبیاءؑ کے گزرنے کے سینکڑوں سال بعد بھی ان کے ماننے والوں پر بسا اوقات اس زمانہ کے ظالم لوگ ظلم کرتے ہیں اور یہ ظلم بھی مذہب ہی کے نام پر کیا جاتا ہے مگر حقیقۃً خدا تعالیٰ کی مرضی یا تائید ان کو حاصل نہیں ہوتی اور مذہب سے اس ظلم کو دور کا علاقہ بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس ضمن میں قرآن کریم اصحاب کہف کی مثال بیان فرماتا ہے۔ یہ وہ عیسائی لوگ تھے جو تین صدیوں تک عیسائیت کے مخالفین کے ظلم وستم کا نشانہ بنے رہے۔ ان کو اتنا تنگ کیا گیا، ایسے ایسے شدید مظالم ان پر ڈھائے گئے کہ ان کی یاد سے آج بھی سینوں میں دل خون ہو جاتے ہیں ۔میں نے خود وہ عمارتیں دیکھی ہیں جن عمارتوں میں ان عیسائیوں پر ظلم ڈھائے جاتے تھے۔ان کو کولی سَیم COLLISIUM کہا جاتا ہے۔ پرانے رومن زمانوں میں یہ ایک قسم کے تھیئٹرز ہوا کرتے تھے یعنی تماشا گاہیں۔ جہاں پہلوانوں کی لڑائیاں یا شیروں اور بھینسوں کی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔

جس زمانہ کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے اس زمانہ میں انہی تماشا گاہوں کو عیسائیوں پر ظلم کرنے کا ایک ذریعہ بنالیا گیا اور ایک طرف تو پنجرے میں بھوکے شیر یا دوسرے جنگلی درندے جن کو کئی کئی دن فاقے دے کر رکھا جاتا تھا بند ہوا کرتے تھے اور دوسری طرف پنجروں میں وہ عیسائی بند ہوتے تھے جن سے متعلق اس زمانے کے مذہبی رہنماؤں کا یہ فتویٰ تھا کہ یہ مرتد ہیں کیونکہ انہوں نے ایک دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو پنجروں میں یہ ''مرتدین'' تھے۔وہ بھوکے تھے، وہ بھی ننگے تھے، وہ بھی کئی کئی دن تک پانی اور روٹی سے محروم رکھے جاتے تھے جس سے ان کی کمزوری اس حد تک بڑھ جاتی تھی کہ ان کے لئے کھڑا ہونا دشوار ہو جاتا تھا۔اور اس کے برعکس

بھوکے اور پیاسے درندے اور بھی خون خوار ہو جاتے تھے اور بھوک کی شدت سے غضبناک ہو کر ایک وحشیانہ جنگلی چیخ کے ساتھ بجلی کی کوندوں کی طرح اپنے شکار پر لپکتے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی ہڈیاں تک چبا جاتے تھے تب وہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہال قہقہوں سے گونج جاتا تھا کہ ہاں یہ ہے مرتدین کی سزا۔ اور اس شام وہ قہقہے لگاتے ہوئے، مذاق کرتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹا کرتے تھے یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ فتنہء ارتداد کو مٹانے کا بس یہی ایک مؤثر طریق ہے۔

کبھی بھوک کے ستائے ہوئے بھینسے ان پر چھوڑے جاتے تھے جنہیں غیر مانوس ماحول اور انسانوں کے جم غفیر کا اجنبی منظر وحشت سے دیوانہ کر دیتا تھا۔ اور جب وہ ان مظلوم عیسائیوں کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھتے تھے تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا اور بے پناہ نفرت اور غیظ و غضب کی آگ ان کے سینوں میں بھڑک اٹھتی تھی اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگتی تھی۔ چنانچہ وہ سر پھینک کر اپنے تنفس کی مخصوص انتقامی آواز کے ساتھ جو چوپاؤں کے سانس کی نسبت سانپوں کی پھنکار کے زیادہ مشابہ ہوتی ہے اپنے نحیف و نزار شکار پر حملہ آور ہوتے تھے اور کبھی انہیں اپنے سینگوں میں پروتے اور کبھی اپنے سُموں کے نیچے روند ڈالتے تھے اور ان مظلوموں کی درد میں ڈوبی ہوئی آہیں تماش بینوں کے شور میں کھو جاتی تھیں لیکن ان ''مومنین'' کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور ان فاقہ کشوں کے نحیف لڑکھڑاتے ہوئے قدم ان کے ایمانوں کو ڈگمگا نہ سکے۔ پس وہ بے مثال ایمانی جرأت کے ساتھ یقینی موت کی طرف بڑھتے رہے اور کبھی تو درندوں کے منہ کا نوالہ بن گئے اور کبھی جنگلی بھینسوں کے سینگوں کا ہار ہو گئے۔

یہ ظلم مختلف وقتوں میں برابر تین صدیوں تک عیسائیوں پر توڑے گئے یہاں تک کہ جب انہوں نے دیکھا کہ روئے زمین پر ہمارے لئے کوئی سر چھپانے کی جگہ نہیں تو وہ سطحِ زمین کو چھوڑ کر زیر زمین غاروں میں چلے گئے۔ وہ غاروں کے چوہوں اور کیڑوں مکوڑوں اور سانپوں اور بچھوؤں میں تو رہ سکتے تھے مگر سطح زمین پر بسنے والے انسانوں میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ تھی کیونکہ یہ موذی جانور جبہ پوش مذہبی رہنماؤں کی نسبت ان کے لئے کم خطرناک تھے۔

ان زیر زمین بسنے والے ''اصحاب کہف'' کے علاوہ قرآن کریم ایسے ابتدائی موحّد عیسائیوں

کا بھی ذکر کرتا ہے جنہیں لا مذہب حکمرانوں کی طرف سے مذہب ہی کے نام پر زندہ آگ میں جلا دیا گیا محض اس جرم کی پاداش میں کہ وہ خدائے عزیز وحمید پر ایمان لائے تھے۔ چنانچہ ان کا ذکر کرتے ہوئے سورۃ البروج میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ۔ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ۔ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ۔ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ۔ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ۔ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ۔ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ۔ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (البروج:۲تا۱۰)

جس کا آزاد ترجمہ یہ ہے کہ:۔

’’قسم ہے برجوں والے آسمان کی اور موعود دن کی اور ایک عظیم الشان گواہی دینے والے کی اور اس عظیم الشان ہستی کی جس کی گواہی دی گئی کہ خندقوں والے ہلاک ہو گئے یعنی خندقوں میں وہ آگ بھڑکانے والے جس میں خوب ایندھن جھونکا گیا تھا۔ اور کیا ہی ہولناک تھا وہ وقت جب وہ ان کھائیوں کے کنارے بیٹھے ہوئے جلتے ہوئے مومنین کا نظارہ کر رہے تھے اور ان سے ان کی ناراضگی کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ وہ خدائے عزیز وحمید پر جو آسمان اور زمین کا مالک ہے ایمان لے آئے تھے اور خدا تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے۔‘‘

قرآن کریم اس امر کے ثبوت میں کہ مذہب کے نام پر ظلم کرنے والے دراصل خود بے دین ہوا کرتے ہیں ایک اور ناقابل تردید ثبوت پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ خدا کے نام پر خدا ہی کی عبادت سے روکتے ہیں اور ان کا یہ ظلم ان مومنین کے نزدیک تمام جسمانی اذیتوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا

(البقرۃ:۱۱۵)

کہ ان مذہب کے جھوٹے دعویداروں سے بھی زیادہ ظالم کوئی ہوسکتا ہے کہ خدا کا نام

لے لے کر خدا ہی کی عبادت سے روکتے ہیں اور مسجدوں میں اس کے ذکر کو بلند کرنے سے منع کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ ویران ہو جائیں۔''

غرضیکہ قرآن نے نہایت لطیف پیرایہ میں مذہب پر پڑنے والے اس خونی الزام کو رد ّفرمایا ہے اور یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ اس مقدس نام پر دنیا میں مکروہ ترین مظالم ڈھائے گئے سچے مذاہب کے سچے متبعین کو اس ظلم و تعدی سے کلیۃً بری الذمہ قرار دیا ہے۔

یہ تو گزشتہ انبیاءؑ کے ساتھ انسانوں کا سلوک تھا جب کہ ابھی خدا کے نور کا کامل ظہور نہیں ہوا تھا لیکن جب اس کامل ظہور کا وقت آیا اور جزیرہ نمائے عرب کے افق سے وہ ابدی صداقتوں کا سورج طلوع ہوا تو بھی ان بے دین ظالموں نے اپنے تیور نہ بدلے۔ جب وہ دنیا کا سردارؐ آیا جس کی ہزاروں سال سے آدم زادوں کو انتظار تھی اور جس کی راہ تکتے تکتے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اس دنیا سے گزر گئے۔ وہ جس کی خاطر کائنات کو پیدا کیا۔ جس کی شریعت سب شریعتوں سے زیادہ روشن اور جس کی شان سب نبیوں سے بلند اور بالا تھی۔ وہ انسانیت کا شرف، وہ خدا کے جلال اور جمال کا مظہر، وہ سب نبیوں سے زیادہ معصوم نبیؐ جب دنیا میں ظاہر ہوا تو اس کو بھی ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا اور ایسے دردناک ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا کہ اس کی نظیر تاریخ مذاہب میں نظر نہیں آتی۔

وہ سارے مظالم جو گزشتہ انبیاءؑ پر علیحدہ علیحدہ توڑے گئے تھے اس ایک نبیؐ اور اس کی جماعت پر توڑے گئے۔ انہیں چلچلاتی دھوپ میں تپتی ریت پر ننگے بدن لیٹایا گیا اور ان کی چھاتیوں پر دہکتے ہوئے پتھروں کی سلیں رکھی گئیں۔ انہیں مکہ کی پتھریلی گلیوں میں مرے ہوئے جانوروں کی طرح رسیاں باندھ کر گھسیٹا گیا۔ سال ہا سال تک ان کے مقاطعے کئے گئے۔ انہیں بھوک اور پیاس کی شدید اذیتیں پہنچائیں گئیں۔ کبھی ان کو تنگ اندھیری کوٹھڑیوں میں قید کیا گیا اور کبھی ان کے اموال و متاع لوٹ کر گھروں سے نکال دیا گیا۔ کبھی بیویوں کو خاوندوں سے چھڑایا گیا کبھی خاوندوں کو بیویوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ مقدس حاملہ عورتوں کو اونٹنیوں سے گرا کر ان پر قہقہے لگائے گئے اور وہ اس صدمے سے جاں بحق ہو گئیں۔ ان پر عبادت کے دوران اونٹوں کی اوجھڑیاں پھینکی گئیں۔ ان کو گالیاں دی گئیں اور گلیوں کے اوباشوں نے ان کی تحقیر اور تذلیل کی۔ دنیا کے ذلیل ترین آوارہ

لونڈوں نے جھولیوں میں بھر بھر کر ان پر پتھر برسائے ۔ یہاں تک کہ دنیا کا مقدس ترین خون طائف کی گلیوں میں بہنے لگا۔ ان کو زہر دیئے گئے۔ ان پر شعلہ آسا جنگوں کی آگ بھڑکا دی گئی اور تلواروں کے نیچے قربانیوں کی طرح ذبح کیا گیا۔ ان پر تیروں اور پتھروں کی بارشیں برسائی گئیں اور احد کی سرزمین گواہ ہے کہ سنگ دل سفاکوں نے کائنات کی معصوم ترین ہستی کا بدن پے در پے زخموں سے چھلنی کر دیا۔ ہاں ان کو نیزوں میں پرویا گیا اور ان کے سینے چیر کر ان کے جگر چبا لئے گئے اور وہ کام جو روم کے سفاک بادشاہ جنگل کے درندوں سے لیا کرتے تھے عرب کے درندہ صفت انسانوں نے خود کر کے دکھا دیئے۔

مذہب کے نام پر یہ بے مثال خون ریزی صرف اس لئے کی گئی کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ رَبُّنَا اللّٰہُ ''ہمارا ربّ اللہ ہے'' اور مذہب کے نام پر یہ خون ریزی صرف اس لئے کی گئی کہ مشرکین مکہ کے نزدیک یہ لوگ ''مرتد'' تھے۔ چنانچہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ کا اور آپؐ کے ماننے والوں کا نام مشرکین نے صابی رکھ دیا تھا۔ صابی ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اپنا آبائی دین چھوڑ کر کوئی نیا دین اختیار کر لے۔ چنانچہ اس ''فتنہ ارتداد'' (نعوذ باللہ من ذالک) کو دبانے کے لئے انہوں نے وہ سارے طریق اختیار کئے جو ان سے پہلے مذہب کے نہ ماننے والے انبیاءؑ اور ان کی جماعتوں کے خلاف اختیار کرتے آئے تھے۔ ایک لمبا زمانہ ہے ان تکلیفوں کا جو مذہب کے نہ ماننے والوں نے مذہب کے علمبرداروں کو دیں بلکہ ایک ایسی قوم کو دیں جو مذہب کے آسمان پر چاند اور سورج بن کر چمکے تھے، جو مذہبی ارتقاء کی انتہا تھے، جن کے طے شدہ مقامات سے آگے اور کوئی مقام نہ تھا، جن سے بہتر لوگ نہ کبھی کسی پہلے مذہب نے پیدا کئے تھے نہ آئندہ کبھی اس دنیا میں ظاہر ہو سکتے ہیں لیکن وہ نبی، وہ خالق کائنات کا شاہکار اور اس کے شیدائی نہایت ہی صبر اور حلم کے ساتھ اور غیر معمولی قوت برداشت کے ساتھ ان مظالم کو سہتے رہے اور اُف تک نہ کی اور اپنے دکھوں اور اپنی قربانیوں اور اپنے بہتے ہوئے خون سے یہ ثابت کر دیا کہ ظالم اور فسادی مذہب کے مخالفین ہوا کرتے ہیں مذہب کے ماننے والے نہیں۔

صرف اسی پر بس نہیں کی بلکہ صبر و تحمل کی صفات کے لاثانی اظہار کے بعد رحم اور شفقت اور

عفو کے وہ کمال دکھائے کہ عقل انسانی حیران ٹکٹکی باندھے دیکھتی ہے کہ یہ کون لوگ تھے اور کیسے ان ارفع مقامات تک جا پہنچے۔ چنانچہ اس وقت جب کہ خدائی نصرت کے وعدوں کے ایفاء کا وقت آیا اور کفار مکہ کی گردنیں ان کے ہاتھ میں دی گئیں۔ جب دس ہزار قدوسیوں کی چمکتی ہوئی تلواروں کی زد میں عرب کے سفاک سرداروں کے بدن کانپنے لگے تو مکہ کی اینٹ اینٹ گواہ ہے کہ تاریخ عالم نے ایک عجیب معاملہ دیکھا اور قتل عام کے فرمان کے بجائے مکہ کی فضاؤں میں لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (یوسف: ۹۳) کے شادیانے بجنے لگے۔ اس روز دنیا کے ظالم ترین انسان معاف کئے گئے۔ تپتی ریت پر بے کس غلاموں کو لٹانے والے بھی معاف کئے گئے۔ چلچلاتی دھوپ میں مکہ کی گلیوں میں ناداروں کو گھسیٹنے والے بھی معاف کئے گئے۔ اس روز معصوم انسانوں پر پتھروں کی بارش برسانے والے بھی معاف کئے گئے اور قاتل اور فسادی اور بدعہد اور لٹیرے بھی معاف کر دیئے گئے اور ابھی کچھ مدت نہ گزری تھی ان سنگ دلوں کو بھی معاف کر دیا گیا جنہوں نے معزز انسانوں کے سینے چیر کر ان کے دل اور جگر چبا لئے تھے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر آدمؑ سے لے کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور تک کی ساری مذہبی تاریخ بھی مٹا دی جائے اور آپؐ کے وصال سے لے کر آج تک کی تاریخ کو بھی ملیا میٹ کر دیا جائے تو بھی اس بزرگ نبیؐ کی چند سالہ تاریخ ہی اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ مذہب انسان کو ہرگز نفرت نہیں سیکھاتا۔ ظلم و تعدی اور شقاوت اور سفاکی کے سبق نہیں دیتا بلکہ اس کے برعکس رحم اور شفقت اور صبر اور بردباری کی تعلیم دیتا ہے۔

صرف اسی پر بس نہیں کی بلکہ وہ رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ ظلم کے انسداد کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھا اور خدا سے وحی پا کر ہمیشہ ہمیش کے لئے یہ اعلان عام کر دیا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین کے نام پر کوئی جبر جائز نہیں اور اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ حق اپنے نورانی چہرہ کے ساتھ ممتاز ہو گیا اور کجی کے ساتھ اس کے اشتباہ کا کوئی سوال باقی نہیں رہا۔

یہ اعلان اس پس منظر میں ایک عجیب اعلان نظر آتا ہے۔ایک طرف تو ظالم ہیں جو ظلم وتعدی کے ساتھ چند کمزور اور ناتواں لوگوں کو ’’ارتداد‘‘ کے جرم کی سزا میں صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں اور مجبور کر رہے ہیں کہ یہ نیا مذہب چھوڑ و اور اپنے پہلے مذہب میں واپس آجاؤ اور دوسری طرف اس مذہب کے ماننے والے جب قوت پکڑ جاتے ہیں تو باوجود اس قوت کے ان کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا (البقرۃ:۲۵۷) کہ دین میں کوئی جبر نہیں حق اپنی تمام صداقتوں کے ساتھ واضح ہو چکا ہے اور کجی کا رستہ ایک ایسا رستہ ہے جسے حق کے ساتھ مشتبہ نہیں کیا جاسکتا.... پس جو خدا تعالیٰ پر ایمان لائے گا اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے ایک مضبوط کڑے پر اس کا ہاتھ پڑ جائے جس کڑے کے لئے ٹوٹنا نہ لکھا ہو۔یہ اعلان کتنا شاندار اور کیسا پرامن اعلان ہے!

پس اے مذہب کے نام پر ظلم کرنے والو! تم مذہب کی حقیقت ہی سے ناآشنا ہو۔مذہب تو دلوں کی تبدیلی کا نام ہے۔مذہب کوئی سیاسی جماعت نہیں، مذہب کوئی قوم نہیں، مذہب کوئی ملک نہیں، مذہب تو وہ پاک روحانی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے آتا ہے جو دلوں کی گہرائیوں میں ہوتی ہے اور جس کا تعلق روح کے ساتھ ہے۔کوئی تلوار اور کوئی طاقت اور کوئی جبر اور کوئی تشدد خواہ کتنا ہی ہیبت ناک کیوں نہ ہو دلوں کو تبدیل کرنے کی اتنی بھی طاقت نہیں رکھتا جتنی ایک حقیر چیونٹی بلند و بالا پہاڑوں کو اپنی جگہوں سے ٹلانے کی رکھتی ہے۔پھر ایک دوسری جگہ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ اعلان فرمایا کہ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف:۳۰) کہ کہہ دو کہ حق تو تمہارے ربّ کی طرف سے آچکا اس کے بعد کسی جبر کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔حق تو کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو دلوں کو اپنی صداقت کے ساتھ منوائے جس کا لوہا روحیں مانیں۔جس کا جسم کے جبر و تشدد کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔پس فرمایا کہ یہ اعلان کردو کہ حق تمہارے ربّ کی طرف سے آچکا فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اب تمہیں اختیار ہے چاہو تو ایمان لاؤ چاہو تو ایمان نہ لاؤ۔

پھر ایک دوسری جگہ فرمایا: اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (الدھر:۳۰) کہ یہ تو ایک نصیحت کی بات ہے فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا پس اس نصیحت سے متأثر ہو کر جو

چاہے وہ اپنے ربّ کا رستہ پکڑ لے۔ کتنی عمدہ اور پیاری تعلیم ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس کے بعد بھی لوگ یہ تصور کس طرح کر سکتے ہیں کہ مذہب ظلم اور جبر اور تشدد کی تعلیم دیتا ہے۔

ایک اور مقام پر مزید وضاحت کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلِ اللّٰهَ اَعۡبُدُ مُخۡلِصًا لَّهٗ دِیۡنِیۡ (الزمر:۱۵) کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تو اعلان کر دے کہ میں تو اپنے ربّ کی پورے خلوص کے ساتھ عبادت کرتا ہوں یعنی میرا تو سب کچھ اسی کا ہو گیا ہے اور میرا دین اسی کے لئے خالص ہے۔ فَاعۡبُدُوۡا مَا شِئۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ (الزمر:۱۶) رہے تم تو جس کی چاہو اس کے سوا عبادت کرتے پھرو مجھے تو اپنا رستہ مل گیا ہے۔ کیسی عجیب تعلیم ہے امن کی۔ اس کے ہوتے ہوئے مذہب کے نام پر کسی ظلم کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ پھر فرمایا لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِيَ دِيۡنِ (الکافرون:۷) کہ تمہارے لئے تمہارا دین ہے وَلِيَ دِيۡنِ میرے لئے میرا دین ہے۔ چنانچہ مذہب کے علمبردار ہمیشہ بلا استثناء ایک ہی دعویٰ رکھتے رہے اور اس دعوے کا ہمیشہ اپنے اعمال سے ثابت کرتے چلے آئے۔ مذہب کے نہ ماننے والے بھی اس کے مقابل پر ایک ہی نعرہ رکھتے رہے کہ ظلم اور جبر کے ساتھ اس فتنہ ارتداد کا دروازہ بند کر دو اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے طریق پر عمل کرتے رہے یعنی ظلم اور جبر اور تشدد کے ساتھ عملاً انہوں نے مذاہب کو دبانے کی کوشش کی۔

اسی مضمون کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے خدا تعالیٰ نے ایک اور جگہ یعنی سورہ یونس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِي الۡاَرۡضِ كُلُّهُمۡ جَمِيۡعًا (یونس:۱۰۰) اگر تیرا ربّ چاہتا تو اس کو جبر کی کیا ضرورت تھی وہ تو مالک ہے، خالق ہے، کامل اختیار رکھتا ہے اپنی تخلیق پر۔ اگر وہ چاہتا لَاٰمَنَ مَنۡ فِي الۡاَرۡضِ كُلُّهُمۡ جَمِيۡعًا سطح ارض پر ہر طرف ہر جگہ رہنے والے ایک دن میں ایک ہی آن میں ایمان لے آتے۔ تو یہ ہو کس طرح سکتا ہے کہ ایسا کامل قدرتوں کا حامل خدا تلوار کے زور سے کسی کو مومن بنانے کی کوشش کرے؟ اگر اس کی تقدیر کا تقاضا یہی ہوتا کہ سب انسانوں نے، خواہ ان کی مرضی ہو یا نہ ہو ایمان ضرور لانا ہے خواہ ان کے دل ٹیڑھے ہوں یا سیدھے انہوں نے اسلام ضرور قبول کرنا ہے تو اس کا بس ایک ارادہ، ایک حکم ہی کافی تھا پھر کون تھا جو اس کی اطاعت سے سرمو فرق کر سکتا؟ مگر خدا تعالیٰ کی کتاب ازلی میں یہ مقدر نہیں

تھا۔ تخلیق آدم میں کارفرما اس کی باریک در باریک حکمتوں کے تقاضے کچھ اور تھے۔

ان حکمتوں کے تقاضے کیا تھے؟ یہی کہ ہر شخص ایمان لانے یا نہ لانے کے فیصلہ میں آزاد ہے اور کوئی کسی دوسرے کو اس بارے میں مجبور نہیں کرسکتا۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعلیم دی گئی وہ یہ تھی اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس:۱۰۰) کیا تو لوگوں کو مجبور کرسکتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں؟ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (یونس:۱۰۱) حالانکہ صورت یہ ہے کہ کوئی شخص بھی ایمان نہیں لاسکتا مگر اس وقت جبکہ خدا کا اذن ہو جائے۔ یعنی صرف وہی لوگ ایمان لائیں گے جن سے متعلق خدا کا یہ فیصلہ ہو کہ یہ اس لائق ہیں کہ انہیں ایمان کی نعمت سے متمتع کیا جائے مگر سخت حسرت اور افسوس کا مقام ہے کہ باوجود اس کے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بغیر استثناء کے سارے کے سارے مذہبی آزادی کی تعلیم دیتے رہے اور اپنے اعمال سے اور اپنی زندگیوں سے یہ ثابت کر دکھایا کہ سچے مذہب کے نام لیوا مظلوم بن کر زندہ رہا کرتے ہیں ظالم بن کر نہیں اور مذاہب اخلاق سے دلوں کو فتح کیا کرتے ہیں تلوار کے زور سے نہیں مگر بعد کے آنے والے بڑے بڑے جبہ پوشوں نے جو مذہبی علماء یا پیر فقیر کہلاتے تھے کہیں وہ راہب کا نام استعمال کرتے تھے کہیں پادری کا۔ کہیں انہیں منتری کہا جاتا تھا کہیں مہنت۔ مذہب کے ان اجارہ داروں نے جو درحقیقت مذہب کی رو سے کلیتہً ناآشنا تھے اپنے مظلوم انبیاءؑ کا نام لے لے کر ان کی ہی ناموس کی حفاظت کا ادّعا کرتے ہوئے ایسے ایسے مظالم دنیا میں ڈھائے کہ انسانیت ان کو دیکھ کر سرنگوں ہو جاتی ہے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا اور آپؐ کے ظہور کے بعد بھی ایسا ہی ہوا اور آج تک ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ آج سے چند سو سال پہلے عیسائیت نے یا یوں کہنا چاہیے کہ بگڑی ہوئی عیسائیت کے بگڑے ہوئے علمبرداروں نے، بڑے بڑے پادریوں نے اور بڑے بڑے بشپس اور کارڈینلز نے مذہب کے نام پر عیسائی دنیا میں جو ظلم کئے ہیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں اور اس دور میں انسانوں کو دکھ دینے کے جو جو طریقے عیسائی مذہب کے علمبرداروں نے ایجاد کئے وہ اتنے خوفناک ہیں کہ ان کو معلوم کرنے کے بعد انسان ورطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ کیا انسانیت ذلت کی ایسی اتھاہ گہرائیوں میں بھی اتر سکتی ہے؟ کیا دل سختی میں اتنے بھی بڑھ سکتے

تھے کہ ہیرے کی کنیوں سے زیادہ سخت ہو جائیں لیکن ایسا ہی ہوا اور خود عیسائی مؤرخین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عیسائیت کے نام پر جو مظالم بعض مظلوم بندوں پر ڈھائے گئے انسانیت ان کے تصور سے شرماتی ہے۔

انگلستان میں مجھے خود ان ظلم کے آلات میں سے بعض کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔لندن میں ایک نمائش ہے جس کا نام ہے میڈم ٹوسو MADAME TOUSSAUD یعنی میڈم ٹوسو کی بنائی ہوئی چیزوں کی نمائش۔وہاں ایک فرانسیسی خاتون مادام توسو نے بھی دنیا کے بڑے بڑے نیک آدمیوں کے بت بھی بنا کر رکھے ہوئے ہیں اور بدآدمیوں کے بھی۔یہ بت ایسی عمدگی سے بنائے ہوئے ہیں کہ بالکل زندہ انسانوں کے مشابہ نظر آتے ہیں اور بعض دفعہ یہ دھوکہ لگ جاتا ہے کہ بت نہیں ہیں بلکہ انسان ہیں۔چنانچہ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اجنبی کسی سپاہی کو کھڑا دیکھ کر اس سے رستہ پوچھنے کے لئے بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندہ سپاہی نہیں بلکہ سپاہی کا بت ہے۔چنانچہ بڑے بڑے نیک کام کرنے والوں یا مشہور لوگوں کے بت بھی وہاں موجود ہیں اور بڑے بڑے سفاک اور ظالم انسانوں اور بدنام مجرموں کے بت بھی وہاں موجود ہیں۔صرف یہی نہیں بلکہ ان ظالموں کے آلات ظلم کو بھی اپنی اصلی صورت میں اکٹھا کر کے رکھا گیا ہے چنانچہ وہ اصل مشینیں بھی وہاں موجود ہیں جن کے ذریعہ عیسائیت کے علمبردار بعض لوگوں کو ارتداد کی سزائیں دکھ دیا کرتے تھے یا ارتداد کے جرم کا اقبال کروانے کے لئے مظالم ڈھایا کرتے تھے تاکہ ان ظلموں اور دکھوں سے تنگ آ کر وہ لوگ اپنے جرم ارتداد کو تسلیم کر لیں۔وہ مظالم اتنے خوفناک تھے کہ بلا استثناء لوگ یا تو ان ظلموں کی حد سے بڑھی ہوئی اذیت سے سسک سسک کر وہیں جان دے دیا کرتے تھے اور یا پھر اپنے جرم کے اقبال ہی کو غنیمت جانتے تھے۔وہ یہ بہتر سمجھتے تھے کہ انہیں زندہ آگ میں جلا دیا جائے بہ نسبت اس کے کہ سپین کی انکوئیزیشن یا فرانس کی انکوئیزیشن کے ہاتھوں میں وہ ناقابل برداشت ظلم سہہ سہہ کر جان دے دیں۔ان مشینوں میں سے جو لنڈن کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی ہیں بعض ایسی ہیں جن کے اوپر پردہ پڑا ہوا ہے اور یہ لکھا ہوا ہے کہ عورتیں اور بچے ان کو نہ دیکھیں یعنی وہ ظلم کے طریقے اتنے خوفناک ہیں کہ منتظمین کے نزدیک عورتوں اور بچوں کا ان کو دیکھنا بھی ایک ناقابل برداشت امر ہے

اوران کی طبیعت پر نہایت گہرااورمہلک اثر چھوڑنے کا موجب بن سکتا ہے۔

میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان مشینوں کو دیکھا اور میں نے سوچا کہ انسان بھی خدا تعالیٰ کی کیسی حیرت انگیز تخلیق ہے کہ ترقی اور تنزل دونوں میں انتہاء تک پہنچ جاتا ہے۔ایک طرف تو جب بلند پروازی اختیار کرتا ہےتو بام نبوت پر قدم رکھ دیتا ہے اور اپنے آقا، خالق اور مالک سے ہمکلام ہوجاتا ہےاور دوسری طرف جب وہ گرتا ہےتو بگڑے ہوئے مذہبی جبہ پوش علماء کی صورت میں دنیا پر ایک لعنت بن کر گرتا ہے۔ایک طرف مجھے اس مظلوم مسیحؑ کی تصویر نظر آئی جو صلیب کی خوفناک اذیتوں سے کراہتے ہوئے ایلی ایلی لما سبقتنی کی دردناک آواز بلند کررہے تھے۔انہوں نے صرف اس جرم کی سزا میں صلیب کی اذیتیں برداشت کیں کہ ان کی قوم کے نزدیک وہ ارتداد اختیار کر چکے تھے۔دوسری طرف وہ سفاک عیسائی جبہ پوش مذہبی رہنما مجھے نظر آئے جنھوں نے اسی مظلوم کے نام پر بےکس اور بےاختیار انسانوں پر اسی ارتداد کے جرم میں ایسے ایسے خوفناک مظالم ڈھائے کہ صلیب کا ظلم بھی ان ظلموں کے سامنے بے حقیقت ہوکر رہ جاتا ہے۔میں نے سوچا کہ کیا اسلام کے اس اعلان عام کے بعد کہ اے بنی نوع انسان! خوش ہو جاؤ کہ اسلام ہمیشہ ہمیش کے لئے امن کا اعلان کرتا ہےاور مذہبی ظلم وتشدد کا ہمیشہ ہمیش کے لئے قلع قمع کرتا ہے۔لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین میں کوئی جبر نہیں، دین کے نام پر دکھ دینا حرام ہے۔قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ۔اسلام کا تو یہ حال ہے کہ گویا عقل و دانش کا ایک درخشندہ سورج طلوع ہوگیا۔ایک واضح اور کھلی کھلی ہدایت آ گئی۔میں نے سوچا کہ اس واضح اور غیر مبہم امن کے اعلان کے بعد بھی کیا کسی مسلمان کے ذہن میں یہ تصور آ سکتا ہے کہ اسلام مذہب کے نام پر جبر روا رکھتا ہےتو میری نظر اس زمانہ کے علماء کی طرف اٹھی اور شرم سے جھک گئی اور میرا دل درد سے بھر گیا کہ آج اس زمانہ میں بھی ایسے مذہبی رہنما موجود ہیں جو اس رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ کی طرف منسوب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں..... وہ جسے زندگی بھر دردناک مظالم کا نشانہ بنایا گیا لیکن ظلم کا جواب اس نے ظلم سے نہ دیا بلکہ کمال صبر اور عفو اور مغفرت کے وہ نمونے دکھائے کہ مافوق البشر دکھائی دیتے ہیں۔

یہ اسی رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ کی غلامی کا دم بھرتے ہوئے بھی اس کی تمام صفات حسنہ سے

عاری ہیں ۔ ان کے دل رحمت سے خالی اور ظلم سے بھرے ہوئے ہیں اور ان کے سینوں میں غیظ وغضب کے سمندر موج زن ہیں اور مذہب کے نام پر سختی اور تشدد کو روا رکھنا تو اب ان کے عقائد میں داخل ہو چکا ہے۔

وہ اسی آسمانی پانی کا واسطہ دے کر جو دلوں کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے آیا تھا بےعلم عوام کے سینوں میں غیظ وغضب کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ وہ اسی امن کے شہزادہ کا نام لے لے کر جس نے عرب کی خونی سرزمین سے اپنے خون کی قربانیاں دے کر قتل ناحق کو یکسر مٹا ڈالا تھا اسی کے ماننے والوں کو بےکسوں کے قتل پر آمادہ کرتے ہیں۔ وہ اسی امین کی محبت کو انگیخت کر کے جس کے گھر غارت گروں نے لوٹ لئے دنیا کو غارت گری کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ جس نے غیروں اور بدکرداروں کی بیبیوں کی عصمت کی بھی حفاظت کی۔ ہاں وہ سب حیاداروں سے زیادہ حیادار جو بےحیائی کو یکسر نابود کرنے کے لئے آیا تھا آج اسی عصمت مجسم کی ناموس کے نام پر سالہا سال کی بیاہتا عورتوں کو اپنے خاوندوں پر حرام اور غیروں پر حلال کر دیتے ہیں۔ وہ عابدوں کا سردار جس نے باطل مذاہب کے معبدوں کی بھی حفاظت کی آج ان مذہبی رہنماؤں نے خود اسی کا کلمہ پڑھنے والے عابدین کے ایک گروہ کی مسجدوں کے انہدام کے فتوے دیئے۔ اور یہ سب ظلم جسے وہ نبیوں کا سردار مٹانے کے لئے آیا تھا خود اسی مظلوم نبی کے نام پر کئے جانے لگے۔ کیا کوئی بھی مسلمان یہ تصور کر سکتا ہے کہ اگر آج ہمارا آقاؐ ہم میں موجود ہوتا (خدا کی بےشمار رحمتیں اور درود ہوں اس محسن پر) تو وہ اپنی امت کے اس حال کو دیکھ کر خوش ہوتا؟ نہیں نہیں۔ ایسا مت خیال کرو کیوں کہ یہ اس حسن واحسان کے مجسمہ کی توہین ہے۔ کیا کوئی بھی مسلمان یہ وہم دل میں لا سکتا ہے کہ وہ اپنی امت کے علماء کو تلقین کرتا کہ سٹیجوں پر چڑھ کر ایک دوسرے کے بزرگوں کی تذلیل اور توہین کرو اور انہیں کہتا کہ ہاں اور گالیاں دو۔ گندے بہتان لگاؤ اور الزام تراشو اور پردہ دار، عفت مآب بیبیوں کے نام لے لے کر ایسے مغلّظات بکو کہ ایک لامذہب بھی ان کو سن کر شرمانے لگے۔ کیا کوئی بھی مسلمان یہ وہم دل میں لا سکتا ہے کہ وہ سلامتی کا شہزادہ اپنے علماء کو ایسے ہیجان آمیز خطبات دینے کی تلقین کرتا جس سے بستیوں کا امن اٹھ جائے اور ایسی شعلہ نوائیوں کا حکم دیتا کہ جس سے بےکسوں اور کمزوروں کے گھروں اور اموال کو خود ان کے سمیت نظر آتش کر دیا

جاتا اور کہتا کہ ابھی بس نہ کرو اور مرتدین کی مسجدیں مسمار کردو جن کے اسلام کا کوئی جز تمہارے اسلام سے مختلف ہے اور ان کے مردوں کو بھی قتل کردو اور ان کی عورتوں کو بھی کیونکہ فتنہ ارتداد کو مٹانے کا بس یہی ایک روحانی طریق ہے۔

خدارا اپنے دلوں کو ٹٹولو اور جواب دو کہ کیا کوئی بھی مسلمان ایک لمحے کے لئے یہ تصور کر سکتا ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں۔ مجھے اس خدا کی قسم ہے کہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور مکہ کی گلیوں کی ایک ایک اینٹ گواہ ہے جن پر مظلوم غلاموں کو ارتداد کی سزا میں مرے ہوئے جانوروں کی طرح گھسیٹا گیا تھا اور صحرائے عرب کی ریت کے سلگتے ہوئے ذرے گواہ ہیں اور وہ جھلستی ہوئی پتھر کی سلیں گواہ ہیں جنہیں ان بے کسوں کی چھاتیوں پر رکھا جاتا تھا کہ یہ اطوار سید ولد آدمؐ کے اطوار نہیں اور یہ اخلاق اس مقدس رسولؐ کے اخلاق نہیں۔ اور مجھے قسم ہے اس خدا کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور طائف کی سنگلاخ زمین کا ایک ایک پتھر گواہ ہے جس پر سید ولد آدمؐ کا خون ٹپکا تھا کہ میرے مظلوم آقاؐ نے کبھی مذہب کے نام پر جبر کی تعلیم نہیں دی۔ عفت کے نام پر عصمتوں کو لوٹنے کا حکم نہیں دیا اور عبادت کی آڑ میں معبدوں کو مسمار کرنے پر انگیخت نہیں کیا۔ پھر کیوں نہ میری آنکھ شرم سے جھک جائے اور کیوں نہ میرا دل درد سے بھر جائے کہ اسی مقدس ذات کی طرف منسوب ہونے والے آج بھی ایسے بے درد راہنما موجود ہیں۔

اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ
وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُۨ (الحج:۴۰)

اشاعت اسلام
کے
دو۲ نظریے!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کے اشاعت اسلام کے طریق کے بارہ میں دنیا میں دو۲ نظریات پائے جاتے ہیں:۔

۱۔ معاندین اسلام کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگیں جارحانہ جنگیں تھیں اور اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔

مگر

۲۔ غیر جانبدار تحقیق یہ ہے کہ:۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اشاعت اسلام کی غرض سے تلوار نہیں اٹھائی اور آپؐ کی تمام جنگیں مدافعانہ جنگیں تھیں۔ اسلام پھیلا ہے تو محض آپؐ کی روحانی اور اخلاقی قوتوں سے۔

اشاعت اسلام کے بارہ میں مولانا مودودی اور بعض غیروں کے نظریات

ظلم کی انتہاء یہ ہے کہ بعض مسلمان ''رہنما'' جبر وتشدّد کے نظریہ کو صرف اپنے تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ ہمارے پاک آقا ؐ کو بھی اس میں ملوث کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے دین اور اس کی قوت قدسیہ کو بھی اپنے کھوکھلے دلائل اور کرم خوردہ قوتوں کی طرح ایسا کمزور جانتے ہیں کہ گویا اگر تلوار اس کے قبضہ قدرت میں نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی وہ عظیم روحانی تبدیلی پیدا نہ کرسکتا جو عرب سے پھوٹنے والے اس روحانیت کے سرچشمہ نے چند سالوں میں کر کے دکھا دی تھی۔ ان کے نزدیک اس مظلوم نبیؐ کی دفاعی جنگیں محض اپنے مذہب کو پھیلانے کے لئے ایک جارحانہ اقدام تھا اور اس کی مکی زندگی کا دور محض ایک ناطاقتی کی دلیل تھی۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے امیر مولانا مودودی نہایت واشگاف الفاظ میں رقم طراز ہیں:۔

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے وعظ و تلقین کا جو مؤثر سے مؤثر انداز ہوسکتا تھا اسے اختیار کیا۔ مضبوط دلائل دیئے، واضح حجتیں پیش کیں، فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت سے دلوں کو گرمایا۔ اللہ کی جانب سے محیّر العقول معجزے دکھائے۔ اپنے اخلاق اور پاک زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا اور کوئی ذریعہ ایسا نہ چھوڑا جو حق کے اظہار و اثبات کے لئے مفید ہوسکتا تھا لیکن آپ کی قوم نے آفتاب کی طرح آپ کی صداقت کے روشن ہوجانے کے باوجود آپ کی دعوت

قبول کرنے سے انکار کر دیا...... لیکن جب وعظ وتلقین کی ناکامی کے بعد داعی اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی ......تو دلوں سے رفتہ رفتہ بدی اور شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا۔ طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے۔ روحوں کی کثافتیں دور ہوگئیں اور صرف یہی نہیں کہ آنکھوں سے پردہ ہٹ کر حق کا نور صاف عیاں ہو گیا بلکہ گردنوں میں وہ سختی اور سروں میں وہ نخوت بھی باقی نہیں رہی جو ظہور حق کے بعد انسان کو اس کے آگے جھکنے سے باز رکھتی ہے۔

عرب کی طرح دوسرے ممالک نے بھی جو اسلام کو اس سرعت سے قبول کیا کہ ایک صدی کے اندر چوتھائی دنیا مسلمان ہوگئی تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام کی تلوار نے ان پردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے[۱]۔''

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔یعنی وہ گندہ اور سخت بہیمانہ الزام جو اسلام کے اشد ترین متعصّب دشمنوں کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات پر لگایا جاتا تھا جسے یورپ کے یاوہ گو مستشرقین گزشتہ صدی تک عیسائی دنیا میں اچھالتے رہے اور اسلام سے دلوں کو متنفر کرتے رہے وہ آج خود ایک مسلمان ''راہنما'' کی طرف سے اس مقدس رسولؐ کی پاک ذات پر لگایا جا رہا ہے ایک ایسے راہنما کی طرف سے جسے ''مزاج شناس رسولؐ '' ہونے کا دعویٰ ہے۔ گو الفاظ کو میٹھا بنانے کی کوشش کی گئی ہے، گو تلوار کی اس مزعومہ فتح کو پر شوکت بنا کر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر گولی وہی کڑوی اور ناپاک اور زہریلی گولی ہے جو اسلام کے دشمنوں کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھینکی جاتی تھی۔ یہ وہی پتھر ہے جو اس سے پہلے جارج سیل اور سمتھ اور ڈوزی نے آنحضرتؐ پر پھینکا تھا اور وہی الزام ہے جو مسٹر گاندھی نے آنحضورؐ پر اس وقت لگایا تھا جب وہ اسلام کی تعلیم سے ابھی پوری طرح آشنا نہیں تھے اور محض دشمنان اسلام کی کہی ہوئی باتوں کو سن کر یہ تأثر قائم کر لیا تھا۔ چنانچہ مسٹر گاندھی کے الفاظ میں:۔

''اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج

---

[۱] الجہاد فی الاسلام صفحہ ۱۳۷، ۱۳۸

بھی تلوار ہے۔''

اور ڈوزی کہتا ہے کہ:۔

''محمدؐ کے جرنیل ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لے کر تلقین کرتے تھے۔''

اور سمتھ کا دعویٰ ہے کہ جرنیلوں کا کیا سوال خود

''آپؐ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لے کر مختلف اقوام کے پاس جاتے ہیں۔''

اور جارج سیل یہ فیصلہ دیتا ہے کہ:۔

''جب آپؐ کی جمعیت بڑھ گئی تو آپؐ نے دعویٰ کیا کہ مجھے **ان پر حملہ کرنے اور بزورِ شمشیر بت پرستی مٹا کر دینِ حق قائم کرنے کی اجازت منجانب اللہ مل گئی ہے۔**''

ان سب دشمنانِ اسلام کی آوازوں کو سنیئے اور پھر مولانا مودودی کی مندرجہ بالا عبارت کا مطالعہ کیجئے۔ کیا یہ بعینہ وہی الزام نہیں جو اس سے پہلے بیسیوں دشمنانِ اسلام نے رسولِ معصومؐ کی ذات پر لگایا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک اور اس سے بھی زیادہ آپؐ کی قوتِ قدسیہ پر حملہ کرنے والا۔ آپ دشمنانِ اسلام کی عبارتیں پڑھ کر دیکھ لیجئے کہیں بھی آپ کو آنحضرتؐ کی قوتِ قدسیہ کی مزعومہ کمزوری اور معجزات کی ناطاقتی کا ایسا ہولناک نقشہ نظر نہیں آئے گا جیسا مولانا مودودی نے کھینچا ہے یعنی آپؐ کی مسلسل تیرہ سال کی دعوتِ اسلام تو دلوں کو فتح کرنے سے قاصر رہی مگر تلوار اور جبروت نے دلوں کو فتح کرلیا۔ وعظ و تلقین کے مؤثر سے مؤثر انداز تو صحرائی ہواؤں کی نظر ہو گئے مگر نیزوں کی اَنی نے دلوں کی گہرائیوں تک اسلام پہنچا دیا۔ آپؐ کے ''مضبوط دلائل'' تو عقلِ انسانی میں جاگزیں نہ ہو سکے مگر گُرزوں کی مار، خودوں کو توڑ کر ان کی عقلوں کو قائل کر گئی۔ واضح بحثیں ان کی قوتِ استدلال کو متأثر نہ کرسکیں مگر گھوڑوں کی ٹاپوں نے ان کو اسلام کی صداقتوں کے تمام راز سمجھا دیئے۔ فصاحت بلاغت بے کار گئی اور زورِ خطابت دلوں کو اس درجہ گرما نہ سکا کہ اسلام کا نور ان کے دلوں میں چمک اٹھتا حتیٰ کہ خود عرش کے خدا کی طرف سے

ظاہر ہونے والے محیر العقول معجزے بھی خائب و خاسر رہے اور ایک ادنیٰ سی پاک تبدیلی بھی پیدا نہ کر سکے لیکن ...... ''جب داعی اسلام نے تلوار ہاتھ میں لی......'' اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ کس قدر مضحکہ خیز ہے یہ تصور اور کیسے تحقیر آمیز الفاظ ہیں کہ جن کو پڑھ کر رونا آتا ہے کہ یہ ایک ''اسلامی راہنما'' کے قلم سے نکلے ہیں جو رسولؐ کی محبت کا دعویدار ہے۔ مولانا کے ان الفاظ کو پڑھیے اور ''میزان الحق'' کے کینہ توز مصنف پادری فنڈر کے ان الفاظ کا مطالعہ کیجئے:۔

''اب حضرت محمدؐ تیرہ سال تک نرمی و مہربانی کے وسائل سے اپنے دین کی اشاعت میں کوشش کر چکے تھے...... لہٰذا اب سے آنحضرت'' اَلنَّبِیُّ بِالسَّیْفِ'' کہلائے یعنی نبی تیغ زن بن گئے اور اس وقت سے اسلام کی مضبوط ترین و کارگر دلیل تلوار ہی قرار پائی[1]۔''

''اگر ہم حضرت محمدؐ اور ان کے تابعین کے چال چلن پر غور کریں تو ایسا معلوم ہوگا کہ اب وہ خیال کرنے لگ گئے تھے کہ عقبہ کے موضوع و مقبول اخلاقی قواعد کی پابندی ان کے لئے ضروری نہ تھی۔ اب خدا ان سے فقط یہی ایک بات طلب کرتا تھا کہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور تیغ و تیر اور خنجر و شمشیر سے قتل پر قتل کرتے رہیں[2]۔''

اور اس کے بعد یہ مصنف مسیحؑ کی مظلومی کا بڑے فخر سے نعوذ باللہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزعومہ جبر کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

''آپ کو خداوند یسوع مسیح کلمۃ اللہ اور حضرت محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم۔ راقم) میں سے ایک کو پسند کرنا ہے۔ یا تو اس کو پسند کرنا ہے جو نیکی کرتا پھرا یا اس کو جو ''اَلنَّبِیُّ بِالسَّیْفِ'' کہلاتا ہے[3]۔

پھر مولانا مودودی کی تائید میں ایک اور اسلام دشمن مسٹر ہنری کو پی کے مندرجہ ذیل الفاظ پڑھیے:۔

''......**اور اپنی نبوت کے تیرہویں سال** آپ نے اس امر کا اظہار کیا کہ خدا نے

---

[1] (میزان الحق صفحہ ۴۶۸) [2] (میزان الحق صفحہ ۴۹۹) [3] (تتمہ میزان الحق)

مجھ کو نہ صرف بغرض مدافعت جنگ کرنے کی اجازت دی ہے بلکہ **اپنا دین بزورِ شمشیر پھیلانے کی بھی اجازت دی ہے**[۱]۔''

اور ڈاکٹر اے سپرنگر کے یہ الفاظ پڑھیئے جو مولانا مودودی کی ہم خیالی میں اس رائے کا اظہار کرتے ہیں:۔

''اب پیغمبر (صلعم) نے فتنہ کے دفع کرنے کے لئے اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کا قانون خدا کے نام سے شائع کیا اور اس وقت سے یہ قاعدہ آپ کے (نعوذ باللہ) **خونی مذہب کا نعرۂ جنگ** ہو گیا[۲]۔''

وہ دشمنانِ اسلام جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید ترین معاندین میں شمار ہوتے ہیں۔ بغض و عناد سے جن کے سینے کھولتے ہیں جو نفرت کی آگ میں جلتے ہیں اگر وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جبر کا الزام لگائیں تو تعجب نہیں۔ غم تو بہت ہوتا ہے مگر تعجب نہیں۔ ہاں تعجب ان پر ہے اور حیف ہے ان پر جو اس معصوم اور مظلوم رسولؐ کی پیروی کا دم بھر کر بھی آپؐ کی مقدس ذات پر بربریت کا الزام لگانے کی جسارت کرتے ہیں۔

مولانا مودودی کے نزدیک نہ کبھی پہلے اسلام میں یہ طاقت تھی کہ محض اپنے حسن و جمال سے تلوار کی مدد کے بغیر دلوں کو فتح کر سکے اور نہ آج یہ طاقت ہے۔ چنانچہ اپنے رسالہ ''حقیقت الجہاد'' میں رقم طراز ہیں:۔

''کوئی ایک مملکت بھی اپنے اصول و مسلک کے مطابق پوری طرح عمل نہیں کر سکتی جب تک کہ ہمسایہ ملک میں بھی وہی اصول و مسلک نہ رائج ہو جائے۔ لہٰذا مسلم پارٹی کے لئے اصلاحِ عمومی اور تحفّظ خودی دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطہ میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنے پر اکتفاء نہ کرے بلکہ جہاں تک اس کی قوتیں ساتھ دیں اس نظام کو تمام اطراف میں وسیع کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک طرف اپنے

۱؎ اہل عرب کی سپین کی تاریخ از ہنری کو پی جلد اوّل صفحہ ۳۹ مطبوعہ بوسٹن۔ ماخوذ از مقدمہ تحقیق الجہاد صفحہ ۳۱

۲؎ ماخوذ از مقدمہ تحقیق الجہاد بحوالہ تاریخ محمدی صفحہ ۲۰۷ مطبوعہ الہ آباد ۱۸۵۱ء

افکار ونظریات کو دنیا میں پھیلائے گی اور تمام ممالک کے باشندوں کو دعوت دے گی کہ اس مسلک کو قبول کریں جس میں ان کے لئے حقیقی فلاح مضمر ہے۔ **دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہوگی وہ لڑکر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دے گی اور ان کی جگہ اسلامی حکومت قائم کرے گی۔''**

اس عبارت کو جناب مولانا صاحب کی پہلی عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے بے اختیار گاندھی جی کی یہ رائے ذہن میں ابھر آتی ہے کہ:۔

''اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے کہ اس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔''

اور آنحضرتؐ کی اس مصنوعی خیالی تصویر کی طرف دھیان منتقل ہو جاتا ہے جو واشنگٹن ارونگ نے اپنی مصنفہ ''سیرت محمد'' (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پہلے ہی صفحہ پر چسپاں کی ہے اور جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ہاتھ میں تلوار لئے اور ایک ہاتھ میں قرآن لئے ہوئے دکھایا گیا ہے اور معاً دل میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ مولانا کے نزدیک بھی اسلام اور اس کے مقدس رسولؐ کا تصور واشنگٹن اورنگ کے تصور سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

پس ایک طرف تو یہ مسلمان ''عالم'' ہے کہ دنیا کے معصوم ترین نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اشد ترین مخالفین کا ہمنوا ہو کر ظلم اور تعدی اور جبر اور بغاوت کے الزام لگا رہا ہے اور دوسری طرف ہمیں بے شمار ایسے انصاف پسند غیر مسلم مفکرین کا گروہ نظر آتا ہے جو باوجود شدید اختلاف کے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہرگز تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ اپنے ظاہری و باطنی حسن اور عظیم اخلاق قوت کے زور سے دلوں پر فتح یاب ہوا۔ چنانچہ مولانا اور معاندین اسلام کے محررہ بالا اقتباسات کے بعد بے محل نہ ہوگا کہ ہم بعض انصاف پسند غیر مسلموں کی رائے بھی پیش کر دیں۔ یہ سب کے سب اسلام کے حامی و مداح نہیں ہیں بلکہ بعض ایسے بھی ہیں کہ خفیف سے خفیف موقع سے فائدہ اٹھا کر بھی اسلام پر حملہ کرنے سے نہیں چوکے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دفاعی جنگوں پر گہری تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد انہیں بے اختیار یہ تسلیم کرنا پڑا کہ:۔

"**اکثر متعصب مخالفین اسلام** خصوصاً گمراہ کن پروپیگنڈا کرنے اور **ملک میں آتشِ فتنہ وفساد کے بھڑکانے والے** کہا کرتے ہیں کہ حضرت محمدؐ صاحب مدینہ جا کر طاقت وقوت حاصل کر کے اپنی اس بناوٹی تعلیم رحم ومروت کو باقی نہ رکھ سکے بلکہ اپنے زندگی کے اہم مقصود (طلب دنیا، حکومت ومرتبہ، مال ودولت وغیرہ) کے حصول کے لئے بڑے زور کے ساتھ **تلوار وقوت کا استعمال کیا بلکہ ایک خونی پیغمبر بن کر دنیا میں تباہی وبربادی مچائی اور اپنے اس بناوٹی صبر وضبط کے معیار سے گر گئے** لیکن یہ ان کوتاہ بین مخالفوں کی (جن کو خواہ مخواہ کا بغض اسلام اور مسلمانوں سے ہے) **تنگ نظری اور پکپاشت روپی اگیان** کا پردہ جو ان کی نگاہوں پر پڑا ہوا ہے اور **بجائے نور کے نار۔ حسن کے قبح۔ اچھائی کے برائی ہی تلاش کرتے رہتے ہیں اور ہر ایک خوبی کے اعلیٰ مرتبہ وتعلیم کو ایسی بری شکل وصورت میں پیش کرتے ہیں جن سے ان کی بدباطنی اور سیاہ قلبی کا بخوبی پتہ چلتا ہے**[1]۔"

یہ اقتباس ایک غیر مسلم مقرر جناب پنڈت گیانیندر صاحب دیوشرما شاستری کی ایک تقریر سے لیا گیا ہے جو انہوں نے ۱۹۲۸ء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر گورکھ پور میں فرمائی تھی۔ کچھ آگے چل کر یہی پنڈت صاحب اسلام کی فیصلہ کن طاقت کے بارہ میں اپنی تحقیق کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

"مخالفین اندھے ہیں۔ ان کو نظر نہیں آتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) کی تلوار رحم ومروت تھی۔ دوستی اور درگزر تھی جو مخالفین پر پورے طور پر کارگر ہوتی اور ان کے قلب کو پاک وصاف کر کے مثل آئینہ بنا دیتی جس کی کاٹ اس مادی تلوار سے بڑی زبردست اور تیز ہوتی[2]۔"

اس اقتباس کے بعد کسی رائے زنی یا موازنہ کی ضرورت نہیں رہتی مگر دل سے بے اختیار یہ

---

[1] دنیا کا ہادی اعظم غیروں کی نظر میں صفحہ ۵۷

[2] دنیا کا ہادی اعظم غیروں کی نظر میں صفحہ ۶۱

آہ نکل جاتی ہے کہ کاش مولانا مودودی اپنے ''آقا'' کے بارہ میں اتنے ہی انصاف سے کام لیتے جتنا کرشنؑ کے ایک غلام نے لیا ہے۔ایک نہیں بلکہ بیسیوں حضرت کرشنؑ کے غلاموں نے جب تاریخ اسلام پرغور کیا تو ہمارے آقاؐ کی بے پناہ قوت حسن و احسان کومحسوس کیا اور یہ کہے بغیر ان سے بن نہ پڑی کہ:۔

''لوگ کہتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلا مگر ہم ان کی اس رائے سے موافقت کا اظہار نہیں کر سکتے کیونکہ زبردستی سے جو چیز پھیلائی جاتی ہے وہ جلدی ظالم سے واپس لے لی جاتی ہے(تعجب ہے کہ مولانا کی نظر''مزاج شناس نبوت'' انسانی فطرت کے اس ظاہر و باہر نکتہ کونہیں پاسکی۔ناقل) **اگر اسلام کی اشاعت ظلم کے ذریعے ہوئی ہوتی تو آج اسلام کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا۔لیکن نہیں۔ ایسا نہیں ہے** بلکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلام دن بدن ترقی پر ہے۔کیوں؟اس لئے کہ **بانی اسلام** (صلی اللہ علیہ وسلم۔ناقل) **کے اندر روحانی شکتی تھی۔منش ماتر** (بنی نوع انسان) **کے لئے پریم تھا۔اس کے اندر محبت اور رحم کا پاک جذبہ کام کررہا تھا۔نیک خیالات اس کی راہنمائی کرتے تھے**[1]۔''

مگر مولانا صاحب پھر بھی مصر ہیں کہ اسلام کی فیصلہ کن طاقت کا راز آپ کے روحانی اعجاز میں نہیں بلکہ تلوار میں مضمر تھا۔حیف!صد حیف!!کہ آپؐ کی مقدس زندگی کا وہ معجزہ جوایک غالی آریہ کی نظر سے بھی اوجھل نہ رہ سکا مولانا کی''پربصیرت آنکھ''اسے دیکھنے سے محروم رہ گئی۔''آریہ مسافر'' کی اسلام دشمنی سے کون واقف نہیں ہے۔یہ آریہ مذہب کا وہ ترجمان ہے جو ہمیشہ اسلام کی مخالفت پرکمر بستہ رہا مگر جب اس کے ایک مقالہ نویس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کی وجوہ پرغور کیا تو تلوار کی قوت کے الزام کوایک فرسودہ اور بے بنیاد اتہام کے طور پرٹھکرادیا اور آپ کے غلبہ کی وجہ محض یہ قرار دینے پر مجبور ہوگیا کہ آپ کی زندگی ایک مجسم معجزہ تھی چنانچہ وہ لکھتا ہے اور انسانی فطرت کی کیسی سچی اور پاک گواہی ہے کہ:۔

[1] ازقلم ایڈیٹر ست اُپدیشن لاہور مورخہ ۷ رجولائی ۱۹۱۵ء ماخوذ از برگزیدہ رسول غیروں میں مقبول صفحہ ۱۲، ۱۳

''**وہ شخص جس نے قریش کو ایمان کا جام شہادت پلایا ایک معجزہ تھا**......
اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم ۔ناقل) کی زندگی ایک معجزہ نہ ہوتی تو کون ہم کو ولید (غالباً خالد بن ولیدؓ مراد ہیں ۔ناقل) کی بے غرضانہ خدمات سے مستفید کرتا۔حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم ۔ناقل) نے جوش ایمان کا دریا موجزن کیا اور عرب کی جنگلی آبادی کو ایک واحد خدا کا پرستار بنایا[1]۔''

پھر لاہور میں ہونے والے آریہ سماج کے ایک جلسہ میں پروفیسر رام دیو صاحب سابق پروفیسر گروکل کانگڑی وایڈیٹر ویدک میگزین نے ہمارے آقا و مولا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے جانے والے اس مکروہ اتہام کو غلط قرار دیتے ہوئے کہ آپؐ نے اسلام تلوار سے پھیلایا تھا ان الفاظ میں اپنی تحقیق کا اظہار کیا:۔

''لیکن مدینہ میں بیٹھے ہوئے محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم ۔ناقل) نے ان میں جادو کی بجلی بھر دی ۔وہ بجلی جو انسانوں کو دیوتا بنا دیتی ہے ......اور یہ غلط ہے کہ اسلام محض تلوار سے پھیلا ہے۔ **یہ امر واقعہ ہے کہ اشاعت اسلام کے لئے کبھی تلوار نہیں اٹھائی گئی ۔اگر مذہب تلوار سے پھیل سکتا ہے تو آج کوئی پھیلا کر دکھادے**[2]''۔

اس آخری فقرہ میں کیسی لازوال سچائی بھری ہوئی ہے ''اگر مذہب تلوار سے پھیل سکتا ہے تو آج کوئی پھیلا کر دکھادے۔'' ہمارے مقدس آقا صلی اللہ علیہ وسلم پر جبر کا الزام لگانے والوں کے لئے لمحہ فکریہ اور چیلنج ہے اور مجھے قسم ہے اس ذات کی جس نے مذہب کو پیدا کیا کہ جب سے سلسلہ نبوت جاری ہوا ہے نہ کبھی پہلے کسی جابر متشدد نے اس چیلنج کا جواب دیا نہ آج دے سکتا ہے نہ کبھی آئندہ دے سکے گا اور ایک مودودی نہیں پچاس کروڑ مودودی بھی مل کر کوشش کریں تب بھی ایک انسان کے دل سے بھی تلوار کی قوت سے اس کا مذہب نکال نہیں سکتے ۔ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء

---

[1] آریہ مسافر اکتوبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۲، ۳ بحوالہ برگزیدہ رسولؐ غیروں میں مقبول صفحہ ۲۴
[2] اخبار پرکاش بحوالہ برگزیدہ رسولؐ غیروں میں مقبول صفحہ ۱۱

اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کے مخالفین کی طرف سے مذہب کو بزور تبدیل کرانے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار مرتبہ تلوار اٹھائی گئی مگر ہر بار خائب و خاسر رہی۔ وہ ہاتھ شل ہو گئے اور وہ تلواریں ٹوٹ گئیں اور مذہب ان کے سائے تلے بے خوف پھیلتا اور پھولتا اور پھلتا رہا۔ پھر ان سب نبیوں کے سردارؐ کے کب شایاں تھا کہ اس معصوم گروہ کے کامیاب طریقہ تبلیغ کو چھوڑ کر نا کام ظالموں کا وطیرہ اختیار کرتے۔ نہیں۔ ایسا مت کہو کہ یہ میرے آقا پر توڑے جانے والے سب ظلموں سے زیادہ ظلم ہے اور ایسا صریح ظلم ہے کہ غیر بھی بے اختیار پکار اٹھے کہ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ چنانچہ موسیو اوجین کلوفل نے آپؐ سے متعلق لکھا:۔

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) نے تمام دنیا کو فتح کرنا اور اسلام کا بول بالا کرنا چاہا مگر غیر مذاہب والوں پر کسی قسم کا جبر و ستم کرنا روا نہیں رکھا۔ ان کو مذہب اور رائے کی آزادی عطا کی اور ان کے تمدنی حقوق قائم رکھے[1]۔“

مسٹر گاندھی کو بھی جن کی فراست بڑی گہری تھی مزید تحقیق کے بعد آخر اپنی اس رائے کو تبدیل کرنا پڑا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور اپنے اخبار ”ینگ انڈیا“ کی ایک اشاعت میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ :۔

”میں جوں جوں اس حیرت انگیز مذہب کا مطالعہ کرتا ہوں **حقیقت مجھ پر آشکارا ہوتی جاتی ہے کہ اسلام کی شوکت تلوار پر مبنی نہیں۔**“

اور ڈاکٹر ڈی۔ ڈبلیو۔ لائٹز نے بھی خود قرآن ہی سے اس الزام کی تردید میں ایک مضبوط استدلال کرتے ہوئے لکھا:۔

”فی الواقع ان لوگوں کی تمام دلیلیں گر جاتی ہیں جو محض اس بات پر قائم ہیں کہ جہاد کا مقصد تلوار کے ذریعے سے اسلام کا پھیلانا تھا کیونکہ بخلاف اس کے سورہ حج میں صاف لکھا ہے کہ ”جہاد کا مدعا مسجدوں اور گرجاؤں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور زاہدوں اور عابدوں (تپشیروں) کی خانقاہوں (تپسیا شالاؤں) کو بربادی سے محفوظ رکھنا ہے[2]۔“

---

[1] اسلام اور علمائے فرنگ صفحہ ۹ بحوالہ برگزیدہ رسولؐ غیروں میں مقبول صفحہ ۱۱ [2] ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو اکتوبر ۱۸۸۶ء

پس تلوار کے زور سے اسلام پھیلانے کا الزام لگانے والوں سے میں خود قرآن ہی کے الفاظ میں پوچھتا ہوں ’’ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا ‘‘ (محمد:۲۵) ’’کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ یا دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں!‘‘

مگر مولانا کو کون سمجھائے کہ وہ اس دعویٰ پر مصر ہیں اور بانگ دہل مصر ہیں اور فنڈر اور سیل اور ہنری کوپی اور سمتھ اور ڈوزی اور سپر نگر کی ہمنوائی میں مصر ہیں اس اعلان پر کہ:۔

’’**یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا**۔ عرب جہاں **مسلم پارٹی** پیدا ہوئی تھی سب سے پہلے اسی کو اسلامی حکومت کا زیرنگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول اور مسلک کی طرف دعوت دی **مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا**۔ آنحضرتؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ **پارٹی کے لیڈر** ہوئے تو انہوں نے روم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومتوں پر حملہ کیا اور حضرت عمرؓ نے اس حملہ کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا[۱]۔‘‘

اگر یہ تحریر کسی اشترا کی تاریخ نویس کی ہوتی اور یہ پالیسی مارکس یا لینن یا سٹالن کی طرف منسوب کی جاتی اور ’’مسلم پارٹی‘‘ کی جگہ ’’کمیونسٹ پارٹی‘‘ کے الفاظ ہوتے تو مجھے کچھ تعجب نہ ہوتا اور میں بغیر کسی قلبی ہیجان کے اس عبارت کو پڑھ کر آگے گزر جاتا اور خیال بھی نہ کرتا کہ یہ کسی نے کیا لکھا ہے کاش ایسا ہی ہوتا مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ اور یہ ایک مسلم راہنما کی تحریر ہے جو واشگاف الفاظ میں اس مقدس ذات پر یہ اتہام لگا رہا ہے جس کی غلامی کا دعویٰ کرتا ہے۔

یہ مولانا مودودی کی تحریر ہے...... الفاظ واضح اور غیر مبہم ہیں۔ الزام سخت گھناؤنا اور بھونڈا ہے اور صرف ایک الزام نہیں بلکہ الزام پر الزام لگایا گیا ہے۔ اس تحریر کا پڑھنا بھی مجھ پر سخت گراں ہے اور اس کا لکھنا بھی۔ اور نا قابل بیان اذیت پہنچتی ہے جب اس فقرہ پر نظر پڑتی ہے

[۱] حقیقت جہاد صفحہ ۶۵

کہ دعوت اسلام تو بھیجی مگر:۔

''اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا......''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پالیسی تو ایک معصومانہ پالیسی تھی جو ایک نوزائیدہ بچہ کے دل کی طرح پاک وصاف تھی۔آپؐ نے تلوار اسی وقت اٹھائی جب آپؐ پر حد سے بڑھ کر مظالم توڑے گئے۔آپؐ کے ہاتھ سلامتی کے ہاتھ تھے اور جارحیت کی تلوار سے سراسر نا آشنا تھے۔شریف النفس غیروں نے بھی جب آپؐ کی اس پالیسی پر نگاہ کی تو اسے کلیتہً سلامتی اور امن اور دفاع کی پالیسی قرار دیا چنانچہ مودودی صاحب کے مندرجہ بالا الفاظ پڑھنے کے بعد اب ایک سکھ معاصر کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

''ابتدا میں آنحضرتؐ کے مخالفین نے جب آپؐ کا جینا اجیرن بنا دیا تو آپؐ نے اپنے پیروکاروں سے کہا کہ اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ چلے جاؤ یعنی اپنے کسی ہم وطن بھائی پر ہاتھ اٹھانے کی بجائے حضورؐ نے اپنا پیارا وطن چھوڑ نا منظور کر لیا۔لیکن آخر کار جب ان پر ظلم اور جبر کی حد کر دی گئی تو مجبوراً آپؐ نے اپنی اور اسلام کی حفاظت میں تلوار اٹھائی ...... یہ پرچار کہ دین کی اشاعت کے لئے جبر کرنا جائز ہے **ان احمق لوگوں کا عقیدہ ہے جنہیں نہ دین کی سمجھ ہے نہ دنیا کی۔وہ حقیقی سچائیوں سے دور ہونے کی وجہ سے اس غلط عقیدہ پر فخر کرتے ہیں**[1]۔''

اس پر میں کوئی مزید تبصرہ نہیں کرتا قارئین کا دل خود گواہی دے گا کہ دونوں میں سے کون سچا ہے ایک سکھ جریدہ نگار یا ''مزاج شناس نبوت''؟

---

[1] نواں ہندوستان دہلی اشاعت ۱۷۔۱۱۔۴۹

اشاعتِ اسلام پر جبر کا الزام
تاریخی شواہد کی روشنی میں

گزشتہ باب میں مولانا مودودی کا جو اقتباس نقل کیا گیا ہے (''لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعی اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی......'') یہ ان کی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے انسان بغیر کسی دقت کے اس نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے جس کا فکر اس کے ذاتی رجحانات اور قلبی کیفیات کا تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل ایک منصف اور قاضی کے طور پر عطا فرمائی ہے جو اس کے جذبات اور علم پر یکساں عدل کو جاری کرتی ہے اور اگر ایک طرف ان دونوں کو ایک دوسرے پر ناجائز دسترس سے باز رکھتی ہے تو دوسری طرف ان کے اندرونی توازن کو بھی قائم کرتی ہے لیکن اگر کسی کی نظر و فکر کا یہ قاضی غلط تربیت کی بناء پر غیر منصف ہو جائے یا آزاد نہ رہ سکے اور خود اپنے ہی جذبات کا غلام ہو کر رہ جائے تو ایسے شخص کی ذہنی دنیا میں ایک انتشار، لاقانونی اور بدنظمی کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اگر یہ غیر آزاد یا غیر منصف عقل کسی ایسے شخص میں پائی جائے تو جاہل مطلق ہو یا جذبات سے بالکل عاری ہو تو انسان کو بحیثیت اجتماعی اس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ مگر جس قدر بھی ایسے شخص کے پاس علمی مواد زیادہ ہو یا جذبات کی فراوانی ہو اسی قدر یہ غلط نتائج اخذ کر کے دنیا کے لئے ایک مصیبت اور ابتلاء کا موجب بن سکتا ہے۔ جب یہ قاضی کمزور ہو تو کبھی تو یہ اپنے جذبات کا غلام بن جاتا ہے اور کبھی ظاہری علم کا۔ کبھی تو ایک بھٹکتے ہوئے شاعر یا ایک جنونی کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے کبھی ایک خشک فلسفی یا ایک روحانیت سے عاری عالم کا روپ دھار لیتا ہے اور ان میں سے ہر صورت بنی نوع انسان کے لئے

ایک مصیبت اور خطرہ بن جاتی ہے۔

مولانا مودودی کی بعض کتب مثلاً ''الجہاد فی الاسلام'' کے مطالعہ سے میں نے یہ تاثر قائم کیا ہے کہ ان کے ہاں عقل کا قاضی آزاد نہیں بلکہ مخصوص ذاتی رجحانات کا تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مہیا شدہ علمی مواد سے جو نتائج اخذ کرتے ہیں وہ سخت مضطرب بلکہ باہم برسر پیکار ہیں۔ اسلام سے متعلق مولانا پہلے سے یہ تہیہ کئے بیٹھے ہیں کہ اس مذہب معصوم کو اگر پھیلایا جا سکتا ہے تو تلوار کے زور سے مگر مشکل درمیان میں یہ آن پڑتی ہے کہ اوّل تو قرآن اس نظریہ کے مخالف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے خلاف ہے دوسرے غیروں کی نظر کا کچھ کچھ ڈر وہ کیا کہیں گے کہ ''اسلام'' ایک ایسا بہیمانہ مذہب ہے۔ بہرکیف مولانا عجیب تذبذب میں مبتلا ہیں جو چاہتے ہیں وہ پوری طرح کہہ نہیں سکتے اور جو کہہ سکتے ہیں وہ دل کی پوری آواز نہیں۔ اسی الجھن میں پھنس کر مولانا نے ایک پیچ در پیچ طریق مافی الضمیر کے اظہار کا نکالا ہے۔ زیر بحث کتاب میں ابتداء تو اس دعویٰ سے کرتے ہیں کہ اسلام مذہب میں جبر کو روا نہیں رکھتا مگر انتہاء اس کے بالکل برعکس دعویٰ پر جا کر ہوتی ہے۔ اس کتاب کے شروع میں سارا زور یہ ثابت کرنے پر صرف کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگیں مدافعانہ جنگیں تھیں اور ان کی غرض یہ تھی کہ انسان کی آزادی ضمیر قائم کی جائے، جبر وتشدد کے ذریعہ اسلام کو دبانے کے لئے مخالفین کی تمام ناپاک کوششیں ناکام بنادی جائیں اور حق کو ان کی عائد کردہ قیود سے آزاد کیا جائے۔

<u>ایک قدم آگے</u> یہ پڑھ کر انسان کا دل خوش ہو جاتا ہے کہ بڑا ہی پاک مذہب ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ایسی آزاد اور پر امن تعلیم دیتا ہے اور انسان کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی خیالات میں پوری طرح آزاد ہے اور اس پر دوسرے مذہبی نظریات ٹھونسنے کے لئے ہر قسم کا جبر ناجائز ہے لیکن افسوس کہ یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی اور مودودی صاحب یہاں پہنچ کر پینترا بدلنے لگتے ہیں اور استدلال کا سارا دھارا اس طرف پھر جاتا ہے کہ کسی طرح اسلام کے ساتھ تشدد کے نظریات کو باندھا جائے۔ آپ یہ پڑھ کر حیران تو ضرور ہوں گے کہ اگر پہلے اس نظریے کو تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام کی جنگیں محض خود حفاظتی کی جنگیں تھیں اور مذہب میں جبر کے استعمال کے خلاف ایک

عملی احتجاج کے طور پر تھیں تو پھر اسی سانس میں یہ کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے کہ اسلام خود مذہب کے نام پر جبر روا رکھتا ہے۔ یہ سمجھنا آپ کے لئے اور میرے لئے مشکل ہو تو ہو مگر مودودی صاحب کے لئے مشکل نہیں۔ چنانچہ اس مقام پر اس امر کی پوری تسلی کر لینے کے بعد کہ مخالفین اسلام کا منہ دندان شکن جواب دے کر بالکل بند کر دیا گیا ہے، اب اپنوں میں بیٹھ کر دل کی بات کا اظہار شروع کرتے ہیں اور ایک حیرت انگیز قلب ماہیت TRANSFORMATION میں سے گزرتے ہوئے قرآن وحدیث کو مَن مانے معنی پہنا کر اور ناقابل فہم وجوہ جواز پیش کر کے آخر اس نتیجہ تک پہنچ ہی جاتے ہیں کہ مسلمان بنانے کے لئے تو جنگ بہر حال جائز نہیں مگر بری باتوں سے روکنے کے لئے ضرور جائز بلکہ فرض ہے۔ اور چونکہ غیر اسلامی ممالک اور تمدن میں بری باتیں ہوتی ہی ہیں اس لئے اسلام ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اپنے ملک میں آپس میں بری باتیں کرتا رہے۔ اس جبر کو تو انسانی آزادی میں دخل نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اسلام پھیلانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ تو محض بری باتوں سے روکنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔

<u>ایک اور قدم آگے</u> یہ فرما کر مولانا اپنے ذاتی رجحانات کے بہت قریب آجاتے ہیں مگر ابھی دل کی پوری بات نوک قلم پر نہیں آئی۔ بھلا اس میں کیا لطف ہوا کہ کسی کو بزور شمشیر بری باتیں کرنے سے منع کر کے انسان اپنا رستہ پکڑ لے۔ جب ایک دفعہ بری باتوں سے روکنے کی غرض سے تلوار ہاتھ میں پکڑ ہی بیٹھے تو پھر کیا اسی پر بس کر دیں گے؟ نہیں بلکہ اس کی کوئی اور غرض ہونی چاہیے اور وہ غرض ڈھونڈنی بھی کچھ مشکل نہیں۔ اگر قرآن کریم کی صرف ایک آیت کو محل سے بے محل کر کے اسے حسب منشا معنی پہنا دیئے جائیں تو باآسانی ایسا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہی آسان راستہ اختیار کرتے ہوئے مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

> ’’حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ میں اس قتال کی غرض وغایت کو اچھی طرح بیان کر دیا گیا ہے (جس قتال کو بری باتوں سے روکنے کی غرض سے شروع کیا گیا تھا ۔ناقل) اگر حَتّٰی یُسْلِمُوْا کہا جاتا تو البتہ غایت قتل یہ ہوتی کہ انہیں تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے لیکن حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ نے بتا دیا کہ **ان کا ادائے جزیہ پر راضی ہو جانا قتال کی**

آخری حد ہے اور اس کے بعد پھر ان کی جان و مال پر کوئی حملہ نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں[1]۔‘‘

قارئین اب تک میرے اس تمہیدی بیان کا مطلب بخوبی سمجھ چکے ہوں گے کہ غیر آزاد عقل کو جب علم پر کچھ دسترس حاصل ہو تو وہ دنیا کے سامنے عجیب مضطرب اور مہلک نتائج پیش کرتی ہے۔ تمسخر کی انتہاء ہے کہ ابتداء تو اس بیان سے شروع ہوتی ہے کہ اسلام ایک آزادی ضمیر کا مذہب ہے اور اسلامی جنگوں کی غرض صرف یہ تھی کہ مخالفین کی طرف سے مذہبی آزادی کو کچلا جا رہا تھا۔ وسط میں جا کر یہ نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ دراصل اسلام کے دو حصے ہیں اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے روکنا۔ بزور اچھی باتوں کا حکم دینا تو چونکہ آزادی ضمیر کے خلاف ہے اس لئے اسلام ایسا نہیں کرتا مگر بری باتوں کو چونکہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا اس لئے دنیا کے کونے کونے سے بزور شمشیر مٹانے کے لئے جنگ کا حکم دیتا ہے اور آخر پر نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ چونکہ بری باتوں کو مٹانے کی غرض سے جنگ کی گئی تھی اس لئے اسلام جزیہ لے کر راضی ہو جاتا ہے اور ’’پھر ان کی جان و مال پر کوئی حملہ نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں۔‘‘ یہاں پہنچ کر مولانا کو نصف اسلام یعنی بری باتوں سے روکنا بھی بالکل بھول جاتا ہے کیونکہ جزیہ مل گیا اور اصل غرض و غایت پوری ہو گئی۔ چنانچہ یہ ذکر کرنا بھی یاد نہیں رہتا کہ اس جگہ اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے سے کیا مراد ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں یا دونوں میں سے ایک۔

آخری چھلانگ لیکن ابھی تک بھی مولانا اپنے ما فی الضمیر کو پوری طرح ادا نہیں فرما سکے اور ایک آخری چھلانگ لگانی باقی ہے۔ مودودی فکر یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ اشاعت اسلام کو تلوار سے کوئی واسطہ نہ ہو اور تشدد کے بغیر بھی کوئی مذہب دنیا میں پھیل سکے۔ چنانچہ قتال کی غرض و غایت جزیہ حاصل کرنا بیان فرما کر یہ ثابت فرمانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اشاعت اسلام کے لئے تلوار بہر حال ناگزیر تھی۔ چنانچہ انگریزی کے اس محاورہ کے مطابق کہ ’’بلی بیگ سے باہر نکل آئی‘‘ CAT IS OUT OF THE BAG دل کی بات آخر باہر نکل ہی آتی ہے اور مولانا اچانک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] الجہاد فی الاسلام صفحہ ۹۳

مقدس نام پر اس الزام کے ساتھ جست لگاتے ہیں ''لیکن جب معجزات کی ناکامی کے بعد داعی اسلام نے تلوار ہاتھ میں لی......'' اور معاً وہ سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں جواب تک سینہ میں دبا پڑا تھا (افسوس کہ اس مقام سے پہلے اگر مولانا کے قدم تمسخر کی حدود میں اٹھ رہے تھے تو اس چھلانگ کے ساتھ ہی صریح ظلم وستم کی حد میں داخل ہو جاتے ہیں) اور اپنے مخصوص رنگ میں رات کو دن اور دن کو رات بتاتے ہوئے اشاعت دین کے اسی خونی تصور کو عین راستی اور حق دکھاتے ہیں۔ آخری نتیجہ ان تمام سیاہ کئے ہوئے صفحات کا یہ نکلتا ہے کہ:۔

''جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بنا تا ہے **اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کوئی حصہ نہیں ہے**[۱]۔''

کچھ دیکھا آپ نے کہ کہاں سے چلے تھے اور کہاں جا نکلے۔ کس غرض سے تلوار پکڑی تھی اور کہاں استعمال ہونے لگی؟

مولانا کی اس ڈپلومیسی کو دیکھ کر خود بخود ذہن ان ممالک کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اپنے دفاع کی غرض سے ہتھیار لے کر جارحانہ مہمات میں استعمال کرنے لگتے ہیں۔ مولانا کو اختیار ہے کہ جو چاہیں کریں اور جس طرح چاہیں سوچیں۔ صرف اتنی احتیاط لازم تھی کہ حاسد دشمن کے لئے جو پہلے دن سے ہی اسلام اور داعی اسلامؐ پر بشدت حملہ آور ہے اور موقع کی تلاش میں ہر آن چوکس و ہوشیار ہے خود اپنے ہاتھ سے قلعے کے دروازے نہ کھول دیتے!

اگر مولانا نے قرآن وحدیث کا مطالعہ نہ کیا ہوتا یا انہیں تاریخ اسلام کی کچھ بھی واقفیت نہ ہوتی تو میں اس خیال سے تسلی پا لیتا کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں لاعلمی میں کہہ رہے ہیں مگر افسوس کہ یہ کہنے کی بھی گنجائش باقی نہیں۔ علم سب اپنی جگہ پر ہے اور سب کچھ جان رہے ہیں لیکن باوجود اس کے کہ تاریخ اسلام کا ایک ایک ورق، ایک ایک لفظ اس نظریہ کو جھٹلا رہا ہے کہ اشاعت اسلام میں تلوار کو کوئی ذرہ بھر بھی دخل تھا۔ اسی نظریہ پر مصر ہیں اور ببانگ دہل مصر ہیں اور نہیں بتا سکتے کہ اگر دلوں کے زنگ دھونے کے لئے تلوار ایسی ہی ضروری تھی تو ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ کے دلوں کے زنگ کس تلوار

---

۱ الجہاد فی الاسلام صفحہ ۱۳۸

نے دھوئے تھے اور کس تلوار نے بلال حبشیؓ کے دل میں توحید کا نور داخل کیا تھا؟ پھر وہ تلوار کونسی تھی جس نے زید بن حارثؓ اور زبیر بن العوامؓ کو مسلمان کیا؟ اور وہ کونسی تلوار تھی جو حمزہؓ اور طلحہؓ کے دل کو ایمان بخش گئی؟ عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور ابوعبیدہ بن عبداللہؓ، عثمان بن مظعونؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ کے دل کس تلوار کی آب سے مصفّٰی کئے گئے؟ اور وہ سارے مہاجرینؓ اور وہ سارے انصارؓ جن کی تعداد ہزار تک جا پہنچتی ہے اور جن سے متعلق خود مولانا کو بھی تسلیم ہوگا کہ ان کے قبول اسلام میں کسی تلوار کے دخل کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ کس طرح تطہیر قلوب کے اس ضروری ہتھیار کے بغیر پاک دل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ کس طرح ان کے زنگ کھرچے گئے اور نیا رنگ چڑھانے کے لئے دل صقیل کئے گئے؟ مولانا! تاریخ اسلام پر ایک نظر ڈال کر بتائیے کہ کیا یہ درست نہیں کہ یہ مہاجرینؓ وانصارؓ جن کے قبول اسلام میں تلوار کے دخل کے آپ بھی منکر ہوں گے۔ یہی تو وہ اسلام کا پھل تھے جو پھل لگانے کے لئے بانی اسلامؐ دنیا میں تشریف لائے، یہ وہی تو ہیں جنہیں اسلام کا رسولؐ فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکتا تھا کہ اے بنی آدم! یہ ہیں وہ کائنات کا خلاصہ جسے پیدا کرنے کے لئے کائنات کو خلعت وجود بخشی گئی، یہی ہیں جنہیں آسمانِ ہدایت کے ستارے کہا گیا اور انہیں میں کچھ تھے جن سے متعلق بدر کے میدان میں پیغمبرؐ اسلام نے رو رو کر خدا کے حضور دعا کی کہ

اَللّٰھُمَّ اِنْ اَھْلَکْتَ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃِ فَلَنْ تُعْبَدَ فِی الْاَرْضِ اَبَدًا۔

''اے اللہ! اگر اس جماعت کو تو نے ہلاک ہونے دیا تو زمین میں پھر کبھی تیری عبادت نہ کی جائے گی۔''

یہ وہی عباد کی سرتاج جماعت تھی جن کے دل ربّ العرش کی تخت گاہ بن گئے اور سینے خدا کے ذکر سے معمور ہو گئے۔ یہ کون لوگ تھے اور یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ کیا یہ وہی عرب کے بسنے والے آزاد منش نہ تھے جن کے دل الاّ ماشاء اللہ قبول اسلام سے پہلے طرح طرح کی بدیوں کے پھندے میں گرفتار تھے اور شرک کا زنگ ان پر تہہ بہ تہہ چڑھا ہوا تھا جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روحانی پانی سے دھویا اور پاک وصاف کیا۔ پھر ان کے ظاہر و باطن کو خدا تعالیٰ کے رنگ میں خوب رنگین کر دیا یہاں تک کہ یہ رنگ ان کی روح کی گہرائیوں تک اتر گیا اور ایسا وافر ہوا کہ پیشانیوں

سے پھوٹنے لگا —— مگر ایک مرتبہ بھی اس عظیم روحانی انقلاب کے دوران میں داعی اسلامؐ کو آلاتِ جنگ کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کیا وہ بعد کے آنے والے مسلمان جو اسلام کے ایک عام روحانی غلبہ کے بعد مسلمان ہوئے ان ستاروں کی خاک پا کے برابر بھی تھے؟...... مولانا! آپ کہاں چلے گئے اور کن ویرانوں میں بھٹک گئے؟ سنیئے کہ میں خدا کی عظمت اور جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین اپنی اشاعت کے لئے کسی دوسرے سہارے کا محتاج نہ تھا۔ آج بھی نہیں ہے، آئندہ بھی کبھی نہ ہوگا۔

یہ آپ نے کیا کہا کہ تلوار کا کام "قلبہ رانی" ہے۔ اور یہ آپ نے کیا کہہ دیا کہ تلوار قبول ہدایت سے پہلے دلوں کے زنگ کو دور کرتی ہے۔ کیا آپ فطرت انسانی کی الف بے سے بھی واقف نہیں؟ کیا آپ اس کھلی ہوئی حقیقت سے بھی آشنا نہیں کہ تلوار سچائی کے بیج کے لئے قلبہ رانی نہیں کرتی بلکہ خود نفرت اور بغاوت کے بیج بوتی ہے اور فطرت انسانی کے انگ انگ کو زہر آلود کر دیتی ہے۔ نہیں نہیں۔ اسلام ہرگز تلوار کے زور سے دلوں پر قبضہ نہیں کرتا بلکہ خود اپنی ذات میں ایک کامل روحانی طاقت ہے جو اپنے حق کے زور سے ہر سرکش سے سرکش سر کو خم کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ بتایئے کہ عمرؓ کا سر کس نے خم کیا تھا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار نے یا سورہ طٰہٰ کی چند آیات کی تلاوت نے؟

مولانا کو اپنے اس متشدد نظریہ کی تائید میں کہ اسلام تنہا نہیں بلکہ تلوار کے سہارے سے ہی پھیل سکتا ہے تاریخ اسلام سے اگر کوئی دور کی گواہی مل سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ جب اسلام کو فتح مکہ کے بعد سیاسی غلبہ نصیب ہو گیا اور جنگ حنین نے حملہ آور دشمنوں کی رہی سہی طاقت بھی ختم کر دی تو اسلام بڑی تیزی سے پھیلنے لگا۔ یہ ہے وہ تنہا تاریخی دلیل جس کے کھونٹے پر یہ سارا نظریہ ناچ رہا ہے۔ آیئے ہم کچھ دیر کے لئے اس دلیل کو تسلیم کر کے دیکھیں کہ ان بعد کے آنے والے مسلمانوں کے دلوں کو تلوار نے کس درجہ زنگ سے پاک کیا تھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ وہی بعد کے آنے والے تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد سب سے پہلی خدمت اسلام یہ کی کہ اسلامی حکومت کے خلاف ایک عام علم بغاوت بلند کر دیا اور لشکر در لشکر مرکز اسلام کی طرف چڑھ

دوڑے۔ مولانا! آیئے اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے کہ اگر یہی وہ لوگ تھے جن کے سر تلوار نے خم کئے تھے اور جن کے دلوں کو زنگ سے خوب صاف کر کے اسلام کا نور قبول کرنے کے لئے تیار کیا تھا تو یہ زنگ تو دوڑا چلا آتا ہے اور دلوں کو پھر ہر سمت سے اپنی طرف لپیٹ میں لے رہا ہے اور دیکھئے کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اس مشکل وقت میں اسلام کے لئے دشمن کے تیروں کے سامنے اپنے سینے سپر کئے۔ کیا وہی ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علی نہیں تھے جن کے دلوں سے جاہلیت کے زنگ کو کسی تلوار نے نہیں چھڑایا تھا؟

میں نے مندرجہ بالا استدلال محض اس مفروضہ کو کچھ دیر تسلیم کرتے ہوئے پیش کیا ہے کہ یہی وہ لوگ تھے جن کے دلوں میں اسلام محض اپنی صداقتوں کے زور سے نہیں بلکہ تلوار کی مدد سے داخل ہوا تھا۔ تلوار نے پہلے ہل چلایا پھر اسلام نے بیج بو دیا [۱] تب کہیں جا کر اسلام کی فصل پیدا ہوئی۔ پس میں مولانا کو اس فصل کا پھل دکھا رہا تھا جو مبینہ طور پر تلوار کے ہل کی پیداوار تھی۔ اب میں قارئین کے سامنے وہ حقائق پیش کرتا ہوں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل عرب کے قبول اسلام میں نہ پہلے، نہ درمیان میں، نہ بعد میں کبھی بھی تلوار کو دخل نہیں ہوا۔ سب سے پہلے میں اسی گروہ کو لیتا ہوں جو سب سے بعد میں مسلمان ہوئے اور جن سے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے براہ راست تلوار کے خوف سے یا بالواسطہ اس کے اثر سے اسلام قبول کیا لیکن تاریخی حقائق پیش کرنے سے پہلے اس ضمن میں چند ایک تعارفی کلمات گوش گزار کرنے ضروری سمجھتا ہوں۔

تاریخ اسلام کے غیر متعصب آزاد مطالعہ کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلام کے پھیلانے میں تلوار کبھی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مددگار نہیں ہوئی بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ مسلمانوں کی دفاعی جنگیں جو سخت مجبوری کے عالم میں انسانی جان کی حفاظت کی غرض سے لڑی جا رہی تھیں اسلام کے بسرعت پھیلنے کے راستہ میں درحقیقت روک بن رہی تھیں اور یہ رکاوٹ کئی طریق پر پیدا ہوتی تھی۔ مثلاً:۔

(۱) ان لڑائیوں کو اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا تھا اور شریر النفس

---

[۱] مولانا مودودی اس طریق اشاعت کو اپنی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' کے صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹ پر پیش فرماتے ہیں۔

لوگ فرضی مظالم مسلمانوں کی طرف منسوب کر کے سخت اشتعال انگیز نظموں کے ذریعہ عرب میں آتش غیظ وغضب بھڑکا رہے تھے۔ چنانچہ کعب بن اشرف سے متعلق روایت آتی ہے کہ یہ بد بخت جنگ بدر کے بعد خاص طور پر اس غرض کے لئے مکہ پہنچا تھا کہ اپنی نظموں کے ذریعہ قریش کی آتش انتقام کو بھڑکائے۔ اسی طرح یہی کعب بن اشرف دوسرے قبائل عرب میں بھی مسلمانوں کے خلاف زہریلا مواد پھیلاتا رہا۔ اس کے علاوہ قریش کی طرف سے بھی مسلسل مسلمانوں کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کی جاتی رہی اور انہیں نعوذ باللہ ایک خونی لٹیروں کے گروہ کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔

(۲) حملہ آوروں میں سے جو مقاتل بھی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جاتے تھے ان کے پسماندگان عرب دستور کے مطابق انتقام کی قسمیں کھاتے تھے اور سارا کنبہ یا قبیلہ ان موتوں کا اسلام ہی کو ذمہ دار ٹھہراتا تھا اور ناحق یہ دین مظلوم ان کی نفرت کا نشانہ بن جاتا تھا۔

(۳) ان مخالفانہ حالات میں عرب کی اکثر آبادی تک اسلام کا پیغام پہنچانا اور دلوں سے غلط فہمیوں کو دور کرنا ایک امر محال بن گیا تھا جس کے نتیجہ میں لازماً تبلیغ ایک بہت ہی تنگ دائرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

(۴) جن لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچ سکا تھا اور وہ اس کی سچائی کے قائل بھی ہو چکے تھے ان میں سے بھی ایک کمزور دل طبقہ محض اس مخالفانہ ماحول سے ڈر کر اس کے اظہار سے رکا ہوا تھا اور ان لڑائیوں کی ایک دہشت دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔

(۵) انفرادی طور پر دشمنی کا ڈر نہ ہونے کی صورت میں بھی اسلام میں شمولیت ایک خاص جرأت اور مردانگی چاہتی تھی کیونکہ اس شمولیت کا مطلب مسلمانوں کی دفاعی جنگوں میں ان کے ساتھ شریک ہونے کے مترادف تھا اور مسلمانوں کی کمزوری کے پیش نظر دوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب تھا کہ کوئی جان بوجھ کر آنکھوں سے دیکھتے ہوئے موت کے منہ میں قدم رکھ دے۔

(۶) خود حفاظتی کے اقدامات کے سلسلہ میں مسلمانوں کا اتنا وقت صرف ہو جاتا تھا کہ انہیں تبلیغی مشاغل کے لئے بہت کم فرصت ملتی تھی۔

اگر میرا مندرجہ بالا دعویٰ درست ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ جونہی جنگ اپنے

ہتھیار ڈال دے اسلام کی اشاعت کی رفتار تیز تر ہو جائے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعینہٖ ایسا ہی ہوا اور اسلام کے آخری غلبہ سے پہلے بھی صلح کے دور میں اشاعت اسلام کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی۔ اگر کوئی شخص شبہ پر تل ہی بیٹھے تو فتح مکہ کا دن وہ پہلا دن ہے جس کے بعد یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ تلوار کے ذریعہ حاصل شدہ غلبہ کے نتیجہ میں اسلام قبول کرنے کی طرف لوگوں کا میلان ہوا مگر صلح حدیبیہ کے دور پر تو یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ صلح خود ظاہر نظر میں ایک کمزوری کی دلیل تھی اور دشمن اسے اپنی فتح کا نام دیتا تھا۔ اب دیکھئے کہ دعویٰ نبوت سے لے کر صلح حدیبیہ تک جو مصیبتوں اور بدامنی کا دور تھا تقریباً انیس سال کے عرصہ میں جس قدر لوگوں نے اسلام قبول کیا اس سے کہیں زیادہ تعداد میں صلح حدیبیہ کے دوسالہ دور میں لوگ مسلمان ہوئے۔ یہ موازنہ حیرت انگیز ہے مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ زیادہ سے زیادہ مسلمان مردوں کی تعداد جو صلح حدیبیہ سے پہلے کسی جنگ میں شریک ہوئی ہے وہ تقریباً تین ہزار افراد بنتی ہے۔ یہ بڑے سے بڑے تخمینہ کے مطابق اسلامی فوج کے ان سپاہیوں کی تعداد ہے جنہوں نے جنگ احزاب میں حصہ لیا۔ اس کے مقابل پر فتح مکہ کے موقع پر مسلمان لشکر کی تعداد دس ہزار قدوسیوں پر مشتمل تھی۔ ان مزید سات ہزار میں سے بہت ہی کم تھے جو جنگ احزاب اور صلح حدیبیہ کے درمیان مسلمان ہوئے اور یقیناً بھاری اکثریت نے صلح حدیبیہ کے دوسالہ امن کے دور میں ہی اسلام قبول کیا۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص ؓ اور حضرت خالد بن ولید سیف اللہ بھی اسی دور کے مسلمانوں میں سے ہیں۔

یہ موازنہ صاف ثابت کرتا ہے کہ جارحانہ جنگوں کا تو کیا سوال خود یہ دفاعی جنگیں بھی اشاعت اسلام کے لئے سخت مضر ثابت ہو رہی تھیں۔ کجا یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس غرض سے کسی قسم کے جنگ وجدال کا خیال بھی دل میں لاتے۔ اس کے علاوہ اس موازنہ سے یہ امر بھی صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ جب فتح مکہ اور پھر جنگ حنین کے بعد امن کا دور آیا تو اہل عرب کا جوق در جوق مسلمان ہونا کسی غلبہ کے اثر سے نہ تھا بلکہ صلح حدیبیہ کے دور کی طرح مسلمانوں کی پر امن تبلیغ کے نتیجہ میں تھا۔

اب رہا یہ سوال کہ ان بعد کے مسلمانوں نے حضرت ابو بکر ؓ کی حکومت کے خلاف کیوں

بغاوت کی؟ تو اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ دراصل اس دور کے اکثر مسلمانوں کو جو بدوی قبائل سے تعلق رکھتے تھے براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تربیت پانے کا کوئی موقع نہ مل سکا تھا بلکہ اکثر بدقسمت ان میں سے ایسے تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نورانی چہرہ کو ایک نظر دیکھا بھی نہ تھا۔

اس زمانہ میں سفر ایسے پُر مشقّت ہوا کرتے تھے کہ یہ ممکن نہیں تھا کہ دور دور کے قبائل کے تمام افراد فرداً فرداً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اس لئے عرب کے طریق کے مطابق مختلف قبائل یا تو کوئی تبلیغی وفد اپنے ہاں بلوا لیتے تھے یا اپنے وفود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھجوا دیا کرتے تھے جو کافی بحث مباحثہ کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچتے تھے اور پھر وفد کا جو بھی فیصلہ ہوتا تھا قوم اس کے پیچھے چلتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں سے بہت سے ایسے نومسلم تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تربیت تو درکنار صحابہ کبارؓ سے بھی تربیت حاصل نہ کر سکے تھے۔ اس پر مزید ابتلاء یہ آن پڑا کہ وہ سب ہادیوں کا راہنما اور ہدایتوں کا سورج ان بدقسمتوں کے قبول اسلام کے تھوڑی ہی دیر بعد غروب ہو گیا اور ایک نسبتی اعتبار سے افق عرب پر اندھیرا چھا گیا۔ تاریخ کے ان اوراق میں ہمارے لئے ایک گہرا سبق ہے کہ جب قومیں اپنے وقت کے نبی کا انکار کرتی ہیں اور بزور اس نور کو بجھانے کی کوشش کرتی ہیں تو اس دنیا میں ایک سخت دردناک سزا ان کو یہ ملتی ہے کہ ان کی اکثریت کو اس وقت ایمان نصیب ہوتا ہے جب وہ نبی ان سے جدا ہونے کو ہوتا ہے یا پھر اس سے بھی دیر میں اس نبی کے جدائی کے بہت بعد۔ پس کیا ہی بدنصیب ہیں وہ عشاق جو وصل کے دور میں تو ایک قابل صد محبت وجود سے نفرت کر رہے ہوں مگر جب فراق کی گھڑی آ پہنچے یا ہجر کی راتیں مسلط ہو جائیں تو ان کے قلوب میں شعلہ عشق بھڑک اٹھے۔

آیئے! اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعویٰ نبوت سے لے کر آپؐ کے وصال تک کی تاریخ اسلام تک ایک متجسّسانہ نظر ڈال کر دیکھیں کہ کسی دور میں شائد کسی اور طریق سے جبری طور پر مسلمان بنانے کا کوئی ثبوت ملتا ہو مثلاً ہو سکتا ہے کہ فتوحات کے معًا بعد خوف زدہ مخالفین کو بشدّت اسلام قبول کرنے کی تلقین کی گئی ہو یا ان کی جان بخشی یا آزادی کے لئے مسلمان ہونا بطور شرط

کے رکھ دیا گیا ہو۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو فتح مکہ تک تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

اوّل وہ انتہائی مظلومی کا دور جو دعویٰ نبوت سے لے کر ہجرت تک ممتد ہے اور جسے عرف عام میں مکی دور کہا جاتا ہے۔

دوسرے وہ مدنی دور جو سنہ ہجرت سے لے کر صلح حدیبیہ تک پھیلا ہوا ہے، یہ دور بھی دراصل ایک سخت مظلومی ہی کا دور ہے کیونکہ اگرچہ مسلمانوں کو دفاع کی اجازت دے دی گئی تھی مگر وہ اپنے دشمن کے مقابل پر کیا بلحاظ تعداد اور کیا بلحاظ جنگی ساز وسامان کوئی بھی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ خطہ عرب میں صرف مدینہ ہی ایک ایسی بستی تھی جہاں مسلمان جمعیت آباد تھی اور اس ایک بستی پر بھی ان کا مکمل قبضہ نہ تھا بلکہ یہود کے تین متموّل قبائل اس کے ایک بڑے حصہ پر قابض تھے اور اوس وخزرج کے تمام افراد بھی حلقہ بگوشِ اسلام نہ ہوئے تھے۔ان کی مثال ایسی ہی تھی جیسے ایک مضبوط پہلوان کے مقابل پر ایک کمزور بچہ کو اپنے دفاع کی اجازت دے دی جائے۔وہ پہلوان تو زرہ بکتر میں ملبوس ہو، اس کے ہاتھ میں نیزہ ہو اور تلوار زیب کمر ہو اور ایک قدآور جنگی گھوڑے پر سوار ہو مگر وہ بچہ ننگے پاؤں، نیم عریاں، ایک ٹوٹی ہوئی تلوار لے کر اس کے مقابل پر نکلے۔سارے عرب کی قوت تو مدینہ میں بسنے والے ان چند مسلمانوں کے مقابل پر بہت ہی زیادہ تھی۔صرف جنگ بدر ہی میں حملہ آور دشمنوں اور مسلمانوں کی دفاعی فوج کا موازنہ کیا جائے تو وہ کچھ اسی قسم کا موازنہ ہو گا۔پس اس دور کو بھی میں سخت مظلومی کا دور ہی کہوں گا۔مانا کہ دفاع کی اجازت مل چکی تھی۔

تیسرا دور وہ دور ہے جو صلح حدیبیہ سے شروع ہو کر فتح مکہ تک پھیلا ہوا ہے۔یہ صلح اور امن کا دور تھا جس میں کفار مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر کوئی حملہ نہیں کیا گیا تاہم یہود اور بعض دیگر قبائل کی عہد شکنیوں کے نتیجہ میں بعض غزوات وسرایا وقوع پذیر ہوئے۔

مکّی دور دور اوّل سے متعلق جو تیرہ سال کی انتہائی مظلومی کا عرصہ ہے اسلام کے اشد ترین معاندین بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ اس دور میں اسلام کی طرف سے کسی بھی غرض کے لئے تلوار اٹھائی گئی ہو۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ دشمنان اسلام کی تلواروں کے خوف کے باوجود بہت سے متلاشیان حق اسلام میں

داخل ہوتے رہے۔ پس مکہ میں ہونے والے تمام مسلمان جو بعد میں مہاجرین کہلائے اس الزام سے قطعاً بری ہیں کہ ان کے قبول اسلام میں تلوار کو کوئی دخل تھا۔

ہجرت تا صلح حدیبیہ دوسرے دور سے متعلق اس خیال سے کہ اس دور میں مسلمانوں نے اپنے دفاع کے لئے تلوار اٹھائی۔ شائد بعض بدظن طبیعتیں یہ کہہ سکیں کہ ہوسکتا ہے اس دفاعی تلوار کے خوف سے اسلام پھیلا ہو مگر اس دور کے اسلام قبول کرنے والوں پر اگر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ بھی ڈالی جائے تو یہ واہمہ اس طرح معدوم ہو جاتا ہے کہ جیسے طلوع آفتاب پر رات کی تاریکی۔

اس دور کے وہ مسلمان جو مدینہ کے باشندے تھے انصار کہلاتے تھے اور یہ تقریباً سارے کے سارے اوس اور خزرج کے قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ چند افراد نے یہود میں سے اسلام قبول کیا تھا اور کچھ وہ مسلمان تھے جو مدینہ کے علاوہ دوسری بستیوں کے رہنے والے تھے۔ مکہ میں بھی اسلام کی ترویج کلیتہً بند نہ ہوسکی تھی اور کفار مکہ کی شدید ایذاء رسانی کے باوجود وہاں قبول اسلام کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔

اس مدنی دور کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت انصار پر مشتمل تھی اور انصار کا بلا جبر و اکراہ اسلام قبول کرنا بھی ایک ایسی واضح اور نکھری ہوئی حقیقت ہے کہ دوست تو دوست دشمن بھی یہ کہہ نہیں سکتے کہ انصار کو مہاجرین کی تلوار نے مسلمان بنایا تھا یا ان کے قبول اسلام میں تلوار کو ذرہ بھر بھی کوئی دخل تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اوس و خزرج کے ساتھ سرے سے کوئی جنگ ہی نہیں لڑی ۔ پس بزور شمشیر مسلمان بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہود میں سے مسلمان ہونے والوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور ان میں سے بھی کسی پر اس شک کی گنجائش موجود نہیں کہ وہ تلوار کے خوف سے مسلمان ہوا، بلکہ ان کا مسلمان ہونا ایسے شدید مخالف اور خطرناک حالات میں ہوا جبکہ خود مسلمانوں کا مستقبل بھی بظاہر سخت مخدوش تھا۔ بیرونی قبائل کے نومسلمین بھی جن کی تعداد انصار کی نسبت بہت ہی تھوڑی تھی قطعاً کسی تلوار کے خوف سے مسلمان نہیں ہوئے بلکہ سخت خطرناک حالات میں اسلام قبول کیا۔

اب رہیں اس دور کی جنگیں اور مہمات تو ان کے نتیجہ میں تلوار کے ڈر سے مسلمان

ہونے والوں کی زیادہ سے زیادہ امکانی تعداد جنگی قیدیوں کی ہی ہو سکتی ہے۔اس امر کی چھان بین کے لئے ضروری ہے کہ ہم ہجرت سے لے کر صلح حدیبیہ تک کے تمام غزوات وسرایا پر نظر ڈالیں۔ ان غزوات وسرایا کی کل تعداد پچاس ہے۔

غَزْوَہ یا سَرِیَّہ سے بعض لوگ غلطی سے جنگ مراد لے لیتے ہیں لیکن یہ خیال لاعلمی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔غزوہ سے مراد محض ایسی مہم ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شریک ہوئے۔خواہ لڑائی ہو، چور ڈاکو کا تعاقب ہو یا دیکھ بھال کے لئے کوئی پارٹی باہر جائے وغیرہ وغیرہ۔اسی طرح سریہ سے مراد بھی مہمات ہی ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ سریہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شامل نہیں ہوئے۔اس کے علاوہ تبلیغی سفر بھی غزوہ اور سریہ میں شمار ہوتے ہیں اور کسی صحابیؓ کی انفرادی مہم بھی سریہ ہی کہلاتی ہے۔چنانچہ اس دور میں کل پچاس غزوات وسرایا ہوئے جن میں سے جنگ کہلانے کے مستحق صرف تین ہیں:۔جنگ احد، جنگ بدر اور جنگ احزاب۔ان پچاس میں سے ۴۲ میں کوئی اسیر نہیں ہوا۔جن آٹھ میں اسیر ہوئے ان میں سے قابل ذکر تعداد جنگ بدر کے اسیروں کی ہے۔کل ۷۲ اسیر تھے جن میں سے دو پرانے جرموں کی پاداش میں قتل کئے گئے اور باقی سب کو فدیہ لے کر آزاد کر دیا گیا۔ان میں سے بعض کا فدیہ یہ تھا کہ انصار بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔ جنگ احد میں کوئی دشمن قید نہیں ہوا نہ ہی جنگ احزاب میں کوئی قید ہوا۔غزوہ بنی مصطلق میں سو سے اوپر زن و مرد اسیر ہوئے مگر سب کو بلا معاوضہ و بلا شرط آزاد کر دیا گیا۔اس کے علاوہ چند ایک سریوں میں ایک ایک دو دو قیدی ہاتھ آئے جو بلا معاوضہ و بلا شرط رہا کئے گئے۔یہ سب حقائق وہ ہیں جو خود مولانا کو بھی تسلیم ہیں۔

مگر میں کہتا ہوں کہ اگر بفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ سب جنگی قیدی بزور شمشیر مسلمان بنا لئے گئے تھے تو بھی ان کی تعداد اتنی قلیل اور ناقابل ذکر ہے کہ اس کی مہاجرینؓ اور انصارؓ کے سواد اعظم کے مقابل پر کوئی بھی حیثیت نہیں اور اس کو بنیاد بنا کر وہ نتیجہ بہر حال مترتب نہیں ہوتا جو مولانا مودودی نے مرتب فرمایا ہے۔یہ انہیں زیب نہیں دیتا۔ایسی باتیں تو ان متعصب معاندین کا شیوہ ہے جو اپنے بغض باطنی سے مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام تراشی کے لئے تنکوں کے

سہارے ڈھونڈا کرتے ہیں۔

تیسرا دور۔صلح حدیبیہ تا فتح مکہ اس دور میں ہونے والے غزوات وسرایا کی تعداد بائیس ہے۔ ان میں سے صرف تین ایسے تھے جن میں جنگی قیدی ہاتھ آئے۔ایک سریہ حسمی (جمادی الآخرے ہجری) ہے جس میں حضرت زید بن حارثہؓ نے ہنید ڈاکواوراس کے ساتھی لیٹروں پر چڑھائی کی اور سولٹیروں کواسیر بنایا مگر توبہ کا وعدہ لے کر چھوڑ دیا اس کے علاوہ سریہ بنوکلاب اور سریہ بشیر بن سعد انصاری میں چند گنتی کے قیدی ہاتھ آئے مگران کے حالات نامعلوم ہیں۔

پس اس امر میں کوئی بھی شک نہیں کہ ہجرت سے لے کر فتح مکہ تک ایک بھی قیدی کو بزور شمشیر مسلمان بنانے کا ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی ان سے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ تلوار نے تو صرف زنگ صاف کیا تھا اس کے بعد اسلام کا رنگ ان کے دلوں پر چڑھایا گیا کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ انہیں پھر اسی زنگ آلود شرک کی دنیا میں واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔پھر کیا مولانا مودودی بتا سکتے ہیں کہ آخر وہ لوگ کون تھے جن کو اپنی تمام اخلاقی اور روحانی قوتوں کی ناکامی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ تلوار کی چمک دکھلا کر مسلمان بنایا تھا؟ وہ کب پیدا ہوئے؟ کس جگہ کے رہنے والے تھے؟ کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے؟ کیا انہیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟ اور اگر ان کا وجود محض مولانا کے تصور کی پیداوار ہے اور یقیناً انہی کے تصور کی پیداوار ہے تو پھر کیوں سید ولد آدمؐ پر ایسی سنگین اور بے بنیاد الزام تراشی سے نہیں رکتے؟ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مذہب میں جبر کے قائل ہوتے تو کیوں نوک خنجر پر ان بے بس قیدیوں کو مسلمان نہ بنالیا؟

بنوقینقاع ، بنونضیر اور بنوقریظہ مؤخر الذکر دونوں ادوار کے قیدیوں کی تعداد میں یہود قبائل بنوقینقاع ، بنونضیر اور بنوقریظہ کے قیدیوں کا شمار شامل نہیں جن کے ساتھ مختلف وقتوں میں مسلمانوں کو مقابلہ کرنا پڑا۔ان کا مختصر ذکر اب علیحدہ طور پر کیا جار ہا ہے۔

اس حصہ مضمون کا تعلق محض اس الزام سے ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبہ اسلام اخلاقی قوتوں کی بجائے تلوار کے زور سے ہوا تھا۔اور ہم اس وقت صرف اس امر کی چھان بین کر رہے ہیں کہ اس تمام جنگی دور میں کل کتنے ایسے قیدی ہاتھ آئے تھے جن کو بزور مسلمان

بنالیا گیا تھا یا جن کے قبول اسلام پر یہ شبہ بھی پڑ سکتا ہے۔

اب تک جو ہم نے جستجو کی ہے اس سے تو معاملہ بالکل برعکس نظر آ رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم قیدیوں کے گروہ کے گروہ دیکھیں جو مسلمانوں کی تلواروں کے نیچے کانپتے ہوئے **لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ** پڑھ رہے ہوں، نظر یہ آتا ہے کہ مسلمانوں کی تلواروں کی وجہ سے نہیں بلکہ دشمن کی تلواروں کے خوف کے باوجود اہل عرب مسلسل مسلمان ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہم دیکھتے یہ ہیں کہ باوجود اس کے کہ مظلوم مسلمان عملاً مدینہ کی ایک چھوٹی سی بستی میں قید ہیں اندر باہر سے بھی محفوظ نہیں اندر بیٹھے ہوئے یہود جب موقع پاتے ہیں شرارت کرتے ہیں اور باہر سے بھی محفوظ نہیں کیونکہ سارا عرب ان کی جان کا دشمن ہو رہا ہے مگر پھر بھی کچھ سرفروش ایسے ہیں جو مسلمان ہو ہو کر اس جماعت میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر مخالفت کو ایک آگ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے تو مدینہ میں مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ کے بیچ گویا ایک نقطہ کی طرح تھے جسے جلا کر بھسم کر دینے کے لئے اس آگ کی شوریدہ لپٹیں بار بار بلند ہوتیں اور اس کی طرف لپکتی تھیں۔ ایک غضب ناک اور مشتعل عرب کے درمیان مدینہ کی کمزور مسلمان اقلیت کی فی الواقع یہی مثال تھی۔ یہ میں اس دور کا ذکر کر رہا ہوں جسے دشمنان اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طاقت اور شمشیر کا دور کہتے ہیں۔ پس اس دور میں جو لوگ مسلمان ہو کر مدینہ آ بیٹھتے تھے وہ تو جلانے والوں کو چھوڑ کر جلنے والوں میں شامل ہونے آیا کرتے تھے۔ اکثریت کو چھوڑ کر اقلیت کی طرف بھاگتے تھے اور جو لوگ مدینہ کی طرف ہجرت نہیں کر سکتے تھے اور مخالف ماحول ہی میں رہنے پر مجبور تھے ان کی مثال بھی کچھ اس قسم کی تھی جیسے وحشی بھیڑیوں کے ایک غول میں کوئی بھیڑیا برضا و رغبت اچانک بھیڑ بن جائے۔ اس بے چارے کے متعلق یہ کہنا کہ ایک چھوٹے سے بھیڑوں کے گلہ نے جو ایک بھیڑیوں سے بھرے ہوئے جنگل میں گھرا ہوا تھا اسے ڈرا دھمکا کر اور مجبور کر کے بھیڑ بنایا ہے اور اس سے زیادہ تمسخر آمیز دعویٰ اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہود قبائل اور ان کے قیدیوں کا ذکر میں اس لئے الگ کر رہا ہوں کہ اس اندرونی خطرہ کی طرف بھی قارئین کی توجہ مبذول کراؤں جو ہر وقت مدینہ کے اندر سے انہیں لاحق تھا۔ یہ تینوں

قبائل ایسے بدعہد، کمینہ فطرت اور دغا باز تھے کہ امن میں بھی مسلمانوں کو چین نہیں لینے دیتے تھے اور جنگ کے زمانے میں تو ان کی شرارتیں غیر مشکوک غداری میں بدل جاتی تھیں۔ چنانچہ مسلمانوں سے دوستی کے معاہدہ کے باوجود اس وقت جبکہ مٹھی بھر مسلمان جنگ بدر میں حملہ آوروں سے برسر پیکار تھے۔ قبیلہ بنو قینقاع نے مدینہ بلوہ کیا اور فساد برپا کیا اور سراسر جھوٹی اور سراسیمہ کرنے والی خبریں پھیلائیں۔ آج بھی اس جرم کی سزا ہر رحمدل سے رحمدل حکومت کے نزدیک قتل کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی خصوصاً اس معاہدہ کے پیش نظر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی دور کے پہلے سال ہی میں یہود سمیت مدینہ کی تمام اقوام سے کیا تھا۔ یہ تمام غدار قتل کئے جانے کے سزاوار تھے۔ ''سیرت ابن ہشام'' جلد اوّل (مطبوعہ مطبع بولاق مصریہ) کے صفحہ ۱۷۸ پر یہ معاہدہ درج ہے۔ اس معاہدہ کی شرائط میں سے تین یہ تھیں:۔

☆ ''جنگ کے دنوں میں یہودی مسلمانوں کے ساتھ مصارف میں شریک رہیں گے۔

☆ کوئی شخص اپنے معاہد کے مقابل پر مخالفانہ کارروائی نہیں کرے گا۔

☆ مدینہ کے اندر کشت و خون کرنا اس معاہدہ کرنے والی سب قوموں پر حرام ہوگا۔''

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازراہ شفقت محض جلاوطنی کی سزا پر اکتفاء فرمائی۔ میرا ایمان ہے کہ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ بعد کے حملہ آوروں کے ساتھ مل کر یہ بدعہد یہود مسلمانوں کو اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچائیں گے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یہ سزا بھی نہ دیتے اور بالکل معاف فرما دیتے بہر حال امر واقعہ یہ ہے کہ اس قبیلے کو باوجود غلبہ کے بزور شمشیر مسلمان نہیں بنایا گیا۔

دوسرا یہودی قبیلہ جسے ارتکاب بغاوت پر اور اس جرم کی پاداش میں، کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی، جلاوطن کیا گیا، قبیلہ بنو نضیر تھا۔ چونکہ مسلمانوں کے خلاف شرارتوں میں اور عہد شکنی میں سارا قبیلہ شامل تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہلاک کرنے کی کوشش ایک منظم سازش کا نتیجہ تھی۔ اس لئے دراصل یہ کینہ توز بھی عہد شکنی کے نتیجہ میں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقدام قتل کے جرم میں انصاف اور خود بائبل کے قانون کے مطابق بھی جو یہود کا قانون تھا، اپنی زندگی کے حق سے محروم ہو چکے تھے لیکن ان کے ساتھ بھی اس لحاظ سے

غیر معمولی نرمی کا سلوک کیا گیا اور صرف شہر بدر کرنے پر اکتفاء کی گئی اور بہر حال یہ امر یقینی طور پر ثابت ہے کہ وہ تلوار کے زور سے مسلمان نہیں بنائے گئے۔

تیسرا بدقسمت یہودی قبیلہ بنو قریظہ ہے۔ اس قبیلہ کی غداری باقی تمام قبیلوں سے زیادہ سنگین تھی کیونکہ اس وقت جبکہ جنگ احزاب کے موقع پر دل ہلا دینے والے خطرات نے مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور مدینہ میں محصور قلیل التعداد مسلمانوں اور کفار کے عظیم حملہ آور لشکر کے درمیان صرف ایک تنگ خندق حائل تھی انہوں نے انتہائی کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خطرناک بدعہدی کی اور دشمن کے ساتھ خفیہ سازشیں کرنے لگے۔

اگر کوئی شخص آج اس خطرہ کا کچھ تصور باندھنا چاہے تو اس کا صرف ایک ہی طریق ہے کہ قرآن کریم کی ان آیات کا مطالعہ کرے جن میں خود خدا تعالیٰ اپنے الفاظ میں اس کا نقشہ کھینچتا ہے:۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۔ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (الاحزاب:۱۱،۱۲)

(جب وہ دشمن) تمہارے اوپر سے بھی (حملہ کرتے ہوئے) آئے اور نیچے سے بھی (یعنی بلندی کی طرف سے بھی اور ڈھلوان کی طرف سے بھی۔ یا معنوی لحاظ سے جب تمہاری نجات کے سارے دروازے بند ہو گئے۔ زمین بھی تنگ ہوگئی اور آسمان بھی) اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ یہ تھا وہ مقام اور وہ وقت جبکہ مومن آزمائے گئے اور شدید زلازل کے جھٹکوں میں انہیں مبتلاء کیا گیا۔

یعنی جس طرح خوفناک زلزلوں کے جھٹکوں کے وقت عمارتوں کی مضبوطی آزمائی جاتی ہے اور ان عمارتوں کے سوا جن کی دیواروں میں سیسہ پلایا گیا ہو یا فولادی بندھنوں سے مضبوط کی گئی ہوں اور وہ گہری بنیادوں پر مضبوط چٹانوں کی طرح قائم ہوں باقی تمام عمارتیں ان جھٹکوں کا شکار ہو کر پیوند خاک ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح مومنین کی اس عمارت کے لئے ایک دل ہلا دینے والی آزمائش کا دن تھا۔

یہ وہ وقت تھا کہ خدا تعالیٰ اہل مدینہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

''تم (اس شدید خطرہ کو دیکھ کر) اللہ تعالیٰ پر طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے تھے۔''

پس ایک طرف تو قرآنی بیان کے مطابق بیرونی خطرہ ایسا شدید تھا دوسری طرف اندرونی خطرہ کی یہ حالت تھی کہ منافق کھلم کھلا مومنوں کے حوصلے پست کرنے میں مصروف تھے۔اسی اندرونی خطرہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اگلی آیت میں فرماتا ہے:۔

وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا وَ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ...... الآیہ

(الاحزاب:۱۳،۱۴)

اور جب منافق اور دلوں کے مریض یہ کہہ رہے تھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے ہم سے دھوکہ کے سوا اور کوئی وعدہ نہیں کیا اور جب ان میں سے ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ یثرب کے رہنے والو! (بھاگنے کا تو کیا سوال) تمہارے لئے ٹھہرنے تک کی کوئی جگہ نہیں اس لئے (اپنے پہلے دین میں) پھر جاؤ۔

پس ان ہولناک ابتلاؤں کے وقت جبکہ مسلمانوں کو خطرات نے اوپر سے بھی آلیا تھا اور نیچے سے بھی۔اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔بنو قریظہ جن کو معاہدہ کی رو سے مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیے تھا، ان کی کمینگی اور غداری کا یہ حال تھا کہ حملہ آوروں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف عہد و پیمان کرنے لگے۔چنانچہ اس غداری کے نتیجہ میں جنگ احزاب کے بعد جب مسلمانوں نے ان پر غلبہ پالیا اور سزا کی تعیین کا وقت آیا تو ان بدبختوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ رحمۃ للعالمین کے ہاتھ میں چھوڑنے کی بجائے حضرت سعد بن معاذؓ کے ہاتھ میں دے دیا جن کے حکم سے سارے مرد تہ تیغ کئے گئے۔یہاں سوال زیر بحث یہ ہے کہ کیا ان کو بھی بزور شمشیر مسلمان بنایا گیا؟ نہیں! ہرگز نہیں۔پھر کیا میں مولانا سے یہ پوچھنے میں حق بجانب نہیں ہوں کہ آخر وہ کون لوگ تھے جو اسلام کی تلوار کے اثر سے مسلمان ہوئے؟

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ تاریخ کے سبق کے دوران یونیورسٹی آف لنڈن کے تاریخ کے ایک متعصب پروفیسر نے اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ظلم کا الزام لگایا۔ میں اور میرے ایک عزیز دوست میر محمود احمد صاحب ناصر اسے برداشت نہ کر سکے اور جواب دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پر اس پروفیسر نے کہا کہ یہاں بحث کا وقت نہیں تم کو جو کچھ کہنا ہو میرے کمرہ میں آ کر کہنا۔ مگر ہم نے اسے یہ جواب دیا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمارے آقاؐ پر حملہ تو تم برسرعام کرو اور جواب ہم علیحدگی میں دیں؟ چنانچہ جب ہم نے اس بارے میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی تو ایک یہودی طالب علم اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ ''اگرچہ میں یہودی ہوں اور سب سے زیادہ مجھے اس بات کا غصہ ہونا چاہیے تھا مگر یہ بحث سننے کے بعد میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اس واقعہ سے ہرگز کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ اوّل تو یہ فیصلہ ان کا نہیں تھا دوسرے سعد بن معاذؓ کا فیصلہ بھی میرے نزدیک درست تھا اور وہ غدار اسی لائق تھے کہ تہ تیغ کئے جاتے۔''

آج تک اس شریف النفس یہودی کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور میں تادم مرگ اس کا ممنون احسان رہوں گا اور ہمیشہ دل سے اس کے لئے دعا نکلتی رہے گی کہ اس نے انصاف کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور غیر معمولی شرافت اور جرأت کا اظہار کرتے ہوئے میرے محبوب آقاؐ کی بریت کی۔ مگر میری نظر ان لوگوں کی طرف لوٹتی ہے جن کے نزدیک بانی اسلام کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں قرآن تھا تو سینہ میں دل خون ہونے لگتا ہے۔

فتح مکہ صلح حدیبیہ تک کا دور ختم ہوا اور فتح مکہ کا دن آ گیا جو دراصل حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر سے ہر تشدد کے الزام کو دور کرنے کا دن تھا۔ اس دن آنحضورؐ نے کفار مکہ پر ایک عظیم فتح حاصل کی مگر کسی ایک شخص کو بھی تلوار کے زور سے مسلمان نہ بنایا۔ پس میں اسی دن کا واسطہ دے کر یہ الزام لگانے والوں سے پوچھتا ہوں کہ جب وہ نبیوں کا سردارؐ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ فاران کی چوٹیوں سے جلوہ گر ہوا اور مکے کو اس کی شوکت اور جلال نے ڈھانپ لیا تو وہ جبر کی تلوار کیوں زیر نیام چلی گئی۔ کیوں فتح مکہ کے دن جب مشرکین مکہ کی گردنیں اس رسولؐ کے ہاتھ میں دی گئیں۔

جب تلواروں کے سائے تلے سرکشوں کے سرخم کرنے کا وقت آیا اور نوک خنجر پر ایمان قلوب میں اتارنے کی مبارک گھڑی آ پہنچی۔ وہ ساعت جب کہ مسلمان فاتحین کے خوف سے عرب سرداروں کے جسم لرزاں تھے اور سینوں میں دل کانپ رہے تھے۔ جب مکہ کی بستی ایک دھڑکتا ہوا دل بن گئی تھی تو کیوں اس فاتحین کے سردار نے شمشیر کی قوت سے ان کو مسلمان نہیں بنا لیا؟ اگر ایسا نہیں کیا اور یقیناً نہیں کیا تو پھر حیرت ہے کہ کس دل کے ساتھ یہ لوگ اس سب محبوبوں کے محبوب اور اس بے مثال دلوں کے فتح کرنے والے سے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کی ہر قوت جاذبہ کی ناکامی کے بعد تلوار کی قوت کارگر ثابت ہوئی۔ مولانا کے دل کا حال میں نہیں جانتا کہ یہ لکھتے ہوئے اس پر کیا گزری تھی یا کیا گزر سکتی تھی مگر اے کاش! کہ ان کا قلم پھٹ جاتا اور سیاہی خون ہو جاتی۔

فتح مکہ کا دن تو وہ دن ہے کہ جو ابدالآباد تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات سے جبر و تشدد کے الزام کی نفی کرتا رہے گا۔ اس دن کی گواہی ایک ایسی پُرشوکت اور بلند بانگ گواہی ہے کہ کتنی ہی صدیاں گزر گئیں مگر آج بھی مؤرخین کے کان اس کو سنتے اور ان کے دل اس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ گواہی تو عیسائیوں نے بھی سنی اور اہل ہنود نے بھی اسے قبول کیا۔ پھر حیرت ہے کہ مولانا کے کان اس بے مثال دن کی آواز سننے سے کیوں محروم رہ گئے؟ اسی دن کی گواہی کا ذکر کرتے ہوئے ایک عیسائی مستشرق مسٹر سٹینلے لین پول لکھتے ہیں:۔

> ''اب وقت تھا کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) خونخوارانہ فطرت کا اظہار کرتے۔ آپ کے قدیم ایذا دہندے آپ کے قدموں میں آ پڑے ہیں۔ کیا آپ اس وقت اپنے بے رحمانہ طریقہ سے ان کو پامال کریں گے؟ سخت عقوبت میں گرفتار کریں گے یا ان سے انتقام لیں گے۔
>
> یہ وقت اس شخص کے اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہونے کا ہے۔ اس وقت ہم ایسے مظالم کے پیش آنے کے متوقع ہیں جن کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہوں اور جن کا خیال کر کے اگر ہم پہلے ہی سے نفرین و ملامت کا شور مچائیں تو بجا ہے۔
>
> مگر یہ کیا معاملہ ہے؟ ـــــ کیا بازاروں میں کوئی خون ریزی نہیں ہوئی؟ ـــــ

ہزاروں مقتولوں کی لاشیں کہاں ہیں؟ واقعات سخت اور بے درد ہوتے ہیں (کسی کی رعایت نہیں کرتے) اور یہ ایک واقعی بات ہے کہ جس دن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) کو اپنے دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی وہی دن آپ کو اپنے نفس پر سب سے زیادہ عالی شان فتح حاصل کرنے کا دن بھی تھا۔ قریش نے سال ہا سال تک جو کچھ رنج اور صدمے دیئے تھے اور بے رحمانہ تحقیر و تذلیل کی مصیبت آپ پر ڈالی تھی آپ نے کشادہ دلی کے ساتھ **ان تمام باتوں سے درگذر کی** اور مکہ کے تمام باشندوں کو ایک **عام معافی نامہ** دے دیا[1]۔''

یا شائد ہمارے بعض علماء کے دل کی آواز یہ کہے کہ مکہ کے تمام باشندوں کو ایک عام معافی نامہ دے دیا اور اہل مکہ کو بزور مسلمان بنانے کا ایک عظیم الشان موقع خود اپنے ہاتھوں سے کھو دیا —

مگر واقعات سخت اور بے درد ہوتے ہیں اور کسی کی رعایت نہیں کرتے۔ ہاں مگر واقعات سے آنکھیں موند لی جائیں تو......؟

اور واقعات سے آنکھیں موندی جا رہی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سراسر دفاعی جنگوں کو جارحیت اور تشدد کی جنگیں قرار دیا جا رہا ہے اور حد یہ ہے کہ یہ بے بنیاد الزام واضح تاریخی حقائق کے باوجود لگایا جاتا ہے۔

فتح مکہ سے لے کر وصال نبویؐ تک ممکن ہے کہ کوئی یہاں پہنچ کر اس وہم میں مبتلا ہو جائے کہ جبری مسلمان کہیں فتح مکہ کے بعد کی جنگوں میں نہ بنائے گئے ہوں...... مگر فتح مکہ کے بعد کی جنگوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اس وہم کی قلعی کھل جاتی ہے جو غالبؔ کے اس شعر کی مصداق ہے کہ ؎

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا!

چنانچہ فتح مکہ کے بعد کے غزوات و سرایا کے اعداد و شمار یہ ہیں:۔

فتح مکہ کے بعد ایسے سرایا جن میں نہ کوئی لڑائی ہوئی نہ کوئی اسیر ہوا نہ مال غنیمت ہاتھ آیا = ۳

---

[1] انتخاب قرآن مقدمہ صفحہ ۶۷

ایسے غزوات یا سرایا جن میں جنگی قیدی ہاتھ آئے = ۴

جنگی قیدیوں کی کل تعداد = ۶۰۰۰ + ۶۲ + اسیرانِ بنو طے + ۱

اس دور میں اسیروں کی تعداد گزشتہ سب ادوار سے غیر معمولی طور پر زیادہ ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ صرف ایک جنگ حنین ہی میں چھ ہزار کی تعداد میں دشمن اسیر ہوئے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ ان اسیروں سے رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ ؐ نے کیا سلوک کیا۔ کیا سب تہ تیغ کر دیئے گئے یا نوک خنجر پر مسلمان بنا لئے گئے؟ نہیں۔ ایک بھی نہیں بلکہ بلا استثناء سارے کے سارے غیر مشروط طور پر رہا کر دیئے گئے۔ جنگ حنین کے چھ ہزار اسیروں کو رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ ؐ نے نہ صرف غیر مشروط طور پر رہا فرما دیا بلکہ ان میں سے بعض کو خلعتیں بھی عطا فرمائیں اور انعام واکرام سے نوازا۔ رحم وکرم کی حد یہ ہے کہ ان میں سے بعض قیدیوں کا فدیہ بھی اپنی جیب سے ادا فرمایا۔ اسی قسم کے رحم وکرم کا سلوک بنی طے کے اسیران سے کیا اور حاتم کی بیٹی کو تو غیر معمولی اکرام کے ساتھ رخصت فرمایا۔

اس کے علاوہ اس دور میں سریہ عیینہ بن حصین میں قبیلہ بنو تمیم کے باسٹھ[۶۲] اسیر مدینہ لائے گئے مگر اس قبیلہ کے سردار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رحم کی درخواست کی جس پر اس رحم مجسم نے ان سب کو رہا فرما دیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ جو سلوک جنگی قیدیوں سے روا رکھا وہ نہایت کریمانہ اور فیاضانہ تھا۔ ظالم تو ظلم کا بہانہ ڈھونڈا کرتا ہے مگر آپ ؐ رحم وکرم کا بہانہ ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ بنو ہوازن کے قیدیوں کو معاف کرنے کا واقعہ بھی عجیب ہے اور اسی ایک واقعہ ہی سے مفتوحین کے بارے میں آپ ؐ کے جذبات اور طرز فکر کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان قیدیوں کے بارہ میں رحم کی درخواست کی غرض سے بنو ہوازن کا ایک وفد آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ؐ کو حضرت حلیمہ دائی کا واسطہ دے کر جو اسی قبیلہ کی تھیں آپ ؐ سے معافی کا طلب گار رہوا۔ اس وقت آپ ؐ نے ان سے نہیں پوچھا کہ اب ہار کھا جانے کے بعد تمہیں اپنے قبیلہ کی وہ دائی یاد آ گئی جس نے مجھے دودھ پلایا تھا مگر جب تم مکہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے تھے یا جب حنین کی وادی میں مجھ پر اور میرے ساتھ چند نرغے میں آئے ہوئے فدائیوں پر تیروں کی بارش برسا رہے تھے تو اس وقت کیا تمہیں یاد نہ آیا کہ یہ تو

وہی معصوم یتیم بچہ ہے جس نے ہمارے قبیلہ میں پرورش پائی تھی؟ نہیں۔ آپؐ نے ایسا کوئی سوال نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ جس قدر قیدی میرے اور بنوعبدالمطلب کے حصہ کے ہیں ان کو لے جاؤ وہ آزاد ہیں۔ یہ چند کلمات آپؐ کے بے مثال خلق اور گہری فراست پر وسیع روشنی ڈالتے ہیں۔ اوّل تو ایک دور کی رضاعی ماں کی یاد میں اس قبیلہ کے بعد میں آنے والے ظالموں کو جو اپنی طرف سے تو آپؐ کو ہلاک کرنے کی پوری کوشش کر چکے تھے اس طرح معاف فرما دینا ایک بے حد پیارا اور کریمانہ فعل ہے، دوسرے آپؐ کا یہ فرمانا کہ صرف بنوعبدالمطلب کے حصہ کے قیدی آزاد ہیں آپؐ کی فراست اور خلق کے بعض اور پہلوؤں پر بھی عجیب روشنی ڈالتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے گو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ سب کو معاف کر کے آزاد کر دوں مگر چونکہ حضرت حلیمہ کی رضاعت کا تعلق محض آپؐ کی ذات یا زیادہ سے زیادہ اس واسطہ سے آپؐ کے خاندان کے ساتھ ہوسکتا تھا اس لئے آپؐ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ ایک ذاتی تعلق کی بناء پر باقی مسلمانوں کو بھی اس احسان کا پابند کر دوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ آپؐ کے رحم و کرم کی خصلت تمام انسانوں میں اپنی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے بے مثال تھی لیکن غیر متوازن نہ تھی۔ آپؐ ایک ایسے رحم دل انسان کی طرح نہ تھے جو اپنے رحم و کرم کے جوش میں دوسروں کے حقوق بھی لوگوں کو بخش دیتا ہے چنانچہ آپؐ نے ایسا نہ کیا بلکہ جو طریق اختیار کیا وہ جود و کرم کے آسمان پر ہمیشہ چاند ستاروں کی طرح چمکتا رہے گا۔ آپؐ جانتے تھے کہ اگر اس بارہ میں لوگوں سے مشورہ کرنے کے بجائے میں نے قیدیوں کو آزاد کرنے کی ایک عملی مثال قائم کر دی تو کسی مسلمان گھر میں کوئی قیدی نہ رہے گا۔ پس آپؐ نے ایسا ہی کیا اور جب آپؐ کے اس فرمان کی خبر عشاق کے کانوں تک پہنچی کہ ''میرے اور بنوعبدالمطلب کے حصہ کے سب قیدی آزاد ہیں'' تو انہوں نے بے اختیار عرض کی کہ اے ہمارے محبوب ''مَا کَانَ لَنَا فَھُوَ لِرَسُولِ اللّٰہِ'' جو کچھ ہمارا ہے وہ تو سب رسول اللہ ہی کا ہے اور یہ کہتے ہوئے قیدیوں کو آزاد کرنے میں وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگے اور فضا نعرہ ہائے جنگ اور زخمیوں کی چیخ و پکار کے بجائے آزادی کے ترانوں سے گونج اٹھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے حد رحیم و کریم تھے۔ بنوطے کے قیدیوں کی آزادی بھی

آپؐ کے خلق کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ان قیدیوں کو صرف اس وجہ سے بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کر دیا گیا کہ عرب کے ایک مشہور سخی حاتم طائی کی بیٹی جو خود ان قیدیوں میں شریک تھی اپنی آزادی صرف اس شرط پر قبول کرنے کے لئے تیار تھی کہ باقی قیدیوں کو بھی ساتھ رہا کیا جائے۔ چنانچہ ایک گزرے ہوئے حاتم کی سخاوت کے نام پر اس کی قوم کے شریروں کو رہا کر دیا گیا اوراس موقع پر بنو عبدالمطلب کے قیدیوں کی کوئی شرط نہ رکھی کیونکہ یہاں جس بناء پر قیدیوں کو رہا کیا جا رہا تھا وہ سارے عرب میں مشترک تھی۔حاتم کی سخاوت ایک قومی سرمایہ تھی جس پر فخر کرنے میں سارا عرب شریک تھا۔

ان حالات پر جب نظر پڑتی ہے تو بے اختیار دل آپؐ پر درود بھیجنے لگتا ہے اور کسی طرح یقین نہیں آتا کہ اس سراپا رحمت وشفقت اور سب کریموں سے بڑھ کر کریم نبیؐ پر بھی کوئی یہ الزام لگا سکتا ہے کہ آپؐ کی کوئی ایک جنگ بھی اسلام پھیلانے کی غرض سے تھی یا اس غرض سے تھی کہ تلوار کے پھل سے دلوں کی زمین میں ہل چلا کر اسلام کا بیج بویا جائے۔نظریات کی اشاعت کے یہ تصورات تو کارل مارکس،لینن،سٹالن کے تصورات تھے۔پھر مولانا کیوں نہیں سوچتے کہ اس اشتراکی سطح سے بہت بالا تھے اس سید ولد آدمؑ کے خیالات،جس کی اوڑان سدرۃ المنتہٰی کی بلندیوں تک تھی اور جو تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام تک جا پہنچا تھا۔

مولانا کی سوچی ہوئی پالیسی کو اس روحانی پالیسی سے کوئی نسبت نہیں ہے جو آپؐ کی پاک اور شفاف فطرت پر انوار سماوی کی صورت میں نازل ہوئی تھی۔ہاں اس رسول کی پالیسی سے جس کی فراست خدا کی فراست تھی اور جسے خدائے لطیف وخبیر کی طرف سے ایک نہایت باریک بین نظر عطا ہوئی تھی،بھلا مولانا کی دھندلائی ہوئی ارضی سوچ کو کیا نسبت ہوسکتی تھی؟ وہ عالَم پاک ہے تو یہ دنیا خاک۔مولانا نے جو کچھ کہا بہت برا کہا اور ناحق کہا۔انہیں کب یہ حق پہنچتا تھا کہ اپنے گھناؤنے تصورات کو اس انسان کامل کی طرف منسوب کرتے۔حصول اقتدار کا کیا یہ صرف ایک ہی حیلہ رہ گیا تھا؟

فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیة: ۲۲، ۲۳)

پس (اے محمدؐ) نصیحت کر۔ تو محض ایک ناصح ہے۔ ان پر داروغہ نہیں۔

(فرمان خداوندی)

ناصحین گذشتہ

اور

اس دور کے خدائی فوجدار

''یہ کوئی مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین اور مبشرین کی جماعت نہیں ہے بلکہ یہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے۔'' (ارشاد مولوی مودودی)

ناصحین گذشتہ اور اس دور کے خدائی فوجداروں کی ایک جماعت

انسانی دستور کے مطابق ہر سچا عاشق اپنے محبوب کا چہرہ حسین دیکھتا ہے اور سچا غلام اپنے آقا کی طرف خوبیاں منسوب کرتا ہے۔ یہ رجحان انسانی فطرت میں اس شدت سے پایا جاتا ہے کہ بسا اوقات ایک عاشق کی آنکھ اپنے محبوب میں وہ حسن بھی دیکھنے لگتی ہے جس کا وہاں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ عشق ہو تو سیاہ فام لیلیٰ بھی حسین دکھائی دینے لگتی ہے اور لیلیٰ کے کتے میں بھی حسن کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس نفرت کی آنکھ سے ہر حسن اوجھل ہو جاتا ہے اور ہر عیب بڑا دکھائی دینے لگتا ہے۔ کسی عرب شاعر نے اسی مفہوم کو بڑی عمدگی سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

وَ عَيْنُ الرِّضَا عَنْ كُلِّ عَيْبٍ كَلِيْلَةٌ

كَمَا اَنَّ عَيْنَ السُّخْطِ تُبْدِى الْمَسَاوِيَا

”رضا مندی کی آنکھ ہر عیب کو دیکھنے سے عاجز ہوتی ہے اسی طرح جیسے ناراضگی کی آنکھ برائیوں کو بڑا کر کے دکھاتی ہے۔“

انسانی فطرت کے اس دستور کے پیش نظر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعت اسلام کے بارہ میں مولانا مودودی صاحب کے بھیانک نظریات پر نظر پڑتی ہے تو طبعاً دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کا دعویٰ کرتے ہیں پھر فطرت انسانی کے سراسر خلاف ایسی انوکھی راہ کیوں اختیار کی کہ اس حسین چہرہ میں عیب دیکھنے لگے جس میں بہت سے

غیروں کو بھی حسن کے سوا کچھ نظر نہیں آیا؟
اس الجھن کے تین ہی حل میری سمجھ میں آتے ہیں:۔

اوّل یہ کہ یہ غلامی کے سب دعوے غلط ہوں اور حقیقتاً مولانا کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ گزشتہ باب میں جو کچھ گزر چکا ہے اگر اسے دیکھ کر کوئی دوست یہ نتیجہ بھی اخذ کر لیں تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر میں سمجھتا ہوں اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں کسی بھی مسلمان کہلانے والے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمداً دشمنی کا الزام ایک بہت ہی سنگین الزام ہے اور خواہ کیسے ہی قرائن موجود کیوں نہ ہوں کم از کم میری طبیعت کسی دشمن پر بھی الزام لگانے کے لئے تیار نہیں۔ میں خود اس مظلوم فرقہ سے تعلق رکھتا ہوں جس کے قلوب میں اگرچہ اس محبوب ترین نبی کے لئے اتھاہ اور بے پناہ محبت کے سوا کچھ نہیں مگر پھر بھی ظالموں کی طرف سے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس لئے میں یہ جانتے ہوئے کہ اس الزام کا زخم کتنا گہرا اور دردناک ہوتا ہے مودودی صاحب پر یہ الزام لگانے سے اجتناب کرتا ہوں۔

دوم:۔ دوسرا حل یہ ہوسکتا ہے کہ مودودی صاحب کی نظر عیب و ہنر کے ادراک کے قابل ہی نہ ہو اور جس طرح بعض لوگ ''کلر بلائنڈ'' COLOUR BLIND ہوتے ہیں اور بعض رنگوں میں تمیز نہیں کر سکتے مودودی صاحب بھی اخلاق کے حسن و قبح میں تمیز کرنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں۔ یہ امر قرین قیاس ہے بلکہ عین ممکن ہیں کہ جہاں تک اخلاقی قدروں کا تعلق ہے مولانا کی قوت ممیزہ امکانی حل میں مضمر ہے۔

سوم:۔ اردو میں ایک محاورہ ہے ''دھن سوار ہونا'' جسے انگریزی میں اوبسیشن (OBSESSION) کہا جاتا ہے یعنی دل و دماغ پر ایک خیال کا ایسا چھا جانا کہ دائیں بائیں آگے پیچھے کی ہوش نہ رہے۔ انسانی نظر و فکر کی یہ ایک انتہائی مہلک بیماری ہے جو تپ دق کی طرح اس کی صلاحیتوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے اور اپنے ساتھ اور بہت سی نظری بیماریاں لے آتی ہے۔ بدقسمتی سے مودودی صاحب بھی اسی مرض کا شکار ہو چکے ہیں اور دھن ان پر یہ سوار ہے کہ خلق خدا کی گردنیں

اپنے ہاتھ میں لے کر ڈنڈے کے زور سے اصلاح خلق کے وہ وہ کام کر دکھائیں کہ جو ان سے پہلے کبھی کسی راستباز نبی سے بھی سرانجام نہ پائے تھے۔ یہی وہ دھن ہے جس کے نتیجہ میں وہ ٹھوکر پر ٹھوکر کھاتے ہیں اور دھند کی طرح یہ ان کی راہ میں حائل ہو کر انہیں وادی وادی بھٹکاتی پھرتی ہے بلکہ بسا اوقات ہلاکت کی ان راہوں تک جا پہنچاتی ہے جن پر آدمؑ سے لے کر آج تک دشمنان حق ہمیشہ چلتے رہے ہیں۔ اسی دھن کے زیر اثر کبھی تو وہ قتل مرتد کے عقیدہ کے قائل ہو کر ان ازلی ابدی ظالموں کے مسلک کی تائید کرتے ہیں جنہوں نے انبیاء علیہم السلام اور ان کی جماعتوں کی محض اس لئے مخالفت کی تھی کہ وہ اپنے پہلے دین سے پھر چکے تھے اور کبھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں تلوار پکڑا کر اشاعت اسلام کو نعوذ باللہ اسی تلوار کا مرہون منت قرار دیتے ہیں اور چونکہ تلوار کی ضرورت نصیحت کی افادیت کو باطل ثابت کرتی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ اگر نصیحت کی افادیت کو تسلیم کر لیا جائے تو تلوار کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لئے مودودی صاحب تلوار باقی رکھنے کے لئے نصیحت کی افادیت سے انکار کرنے پر مجبور ہیں۔

زیر نظر باب میں مودودی صاحب کے یہی نظریات قارئین کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں جو نصیحت کو فضول اور بے کار شے قرار دے کر مذہب میں تلوار کے استعمال کے لئے ایک وجہ جواز تراشتے ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

”ان کو آپ محض پند و نصیحت سے چاہیں کہ اپنے فائدوں سے ہاتھ دھولیں تو یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ ہاں اقتدار ہاتھ میں لے کر آپ بجبر ان کی شرارتوں کا خاتمہ کر دیں[۱]۔“

بظاہر یہ اصلاح کا ایک نہایت کارآمد طریق نظر آتا ہے۔ خصوصاً پند و نصیحت کے دشوار گزار رستوں کے مقابل پر اس طریق کی آسانی اپنے اندر ایک گونہ کشش رکھتی ہے۔ کہاں تو اصلاح خلق کی خاطر درویشانہ نصیحت کرتے ہوئے دربدر کی ٹھوکریں کھانا اور ہر در سے دھتکارے جانا مگر پھر بھی ایک ایسے دیوانے عاشق کی طرح بے مثال صبر اور ہمت کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم رہنا جس کا نعرہ ہر آزمائش کے وقت یہی ہوتا ہے کہ:۔

---

[۱] حقیقت جہاد صفحہ ۱۰

یہ تونے کیا کہا ناصح نہ جانا کوئے جاناں میں
ہمیں تو راہ رووں کی ٹھوکریں کھانا مگر جانا

اور کہاں تلوار کے زور سے آن واحد میں جوق در جوق لوگوں کو صالح مسلمان بنا دینا؟ اوّل الذکر طریق کی مشکلات کو مؤخر الذکر طریق کی آسانی کے ساتھ کوئی بھی نسبت ہے؟

طریق اوّل یعنی نصیحت اختیار کر کے کوئی جانتے بوجھتے ہوئے کیوں وہ کٹھن راہیں اختیار کرے جن پر قدم مارنے کا نتیجہ سوائے اس ذلت و رسوائی کے کچھ نہیں ہوتا جو اس سے پہلے ناصحین کے دکھتے نصیبوں میں لکھی جاتی رہی اور جس کا ذکر قرآن کریم ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ۔ وَ اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ۔ وَ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ۔ وَ اِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ۔ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ (المطففین:۳۰ تا ۳۴)

ترجمہ:۔ یقیناً مجرم لوگ مومنین سے تمسخر کیا کرتے تھے۔ اور جب ان کے پاس سے گزرتے تھے تو تحقیر آمیز اشارے کرتے تھے اور اپنے اہل و عیال کی طرف اتراتے ہوئے لوٹتے تھے اور جب ان کو دیکھتے تھے تو کہتے تھے یقیناً یہی لوگ ہیں جو پکے گمراہ ہیں حالانکہ وہ ان پر داروغہ مقرر نہیں کئے گئے تھے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ مودودی صاحب ہرگز اس اصل کے قائل نہیں کہ اصلاح خلق کی خاطر خواہ مخواہ ایسی پُر مشقت زندگی اختیار کی جائے جس کا نتیجہ جگ ہنسائی اور رسوائی کے سوا کچھ نہ ہو۔ لوگ ہنسی مذاق کا نشانہ بنائیں۔ سر مٹکائیں اور آنکھوں سے اشارے کریں کہ ان دنیا کی اصلاح کرنے والوں کو تو دیکھو کہ جن کے پاس نصیحت کے سوا کوئی ہتھیار نہیں اور کمزوری کا یہ حال ہے کہ ہم جب چاہیں انہیں اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں اور دعوے یہ ہیں کہ ہم محض نصیحت کے ذریعہ دنیا کے دل جیت لیں گے۔ غرضیکہ یہ تمسخر اور تحقیر کرتے ہوئے لوگ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اتراتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ جایا کریں اور جب کبھی بھی ان ناصحین کا ذکر آئے وہ ان کو سخت گمراہ اور راہ حق سے بھٹکے ہوئے قرار دیا کریں۔ پھر ایسی نصیحت کا بھلا کیا فائدہ؟ مفت کی رسوائی اور ذلت کے سوا

ماحصل کچھ بھی تو نہیں۔اس کے برعکس ایک طریق ایسا ہے جسے اپنانے سے خلق خدا کی خوب خوب اصلاح ہوسکتی ہے اور وہ طریق مودودی صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:۔

''جو کوئی حقیقت میں خدا تعالیٰ کی زمین سے فتنہ وفساد کو مٹانا چاہتا ہو اور واقعی یہ چاہتا ہو کہ خلق خدا کی اصلاح ہو تو اس کے لئے محض واعظ اور ناصح بن کر کام کرنا فضول ہے۔اسے اٹھنا چاہیے اور غلط اصول کی حکومت کا خاتمہ کر کے غلط کار لوگوں سے اقتدار چھین کر صحیح اصول اور طریقے کی حکومت قائم کرنی چاہیے[1]۔''

یہ ہے وہ اصلاح خلق کا مودودی نظریہ جو بعینہ اشترا کی نظریہ بھی ہے اور بظاہر بہت ہی زود اثر اور کار آمد دکھائی دیتا ہے لیکن اس سے متأثر ہونے کے بعد طبعاً دل میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر یہ نظریہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے اور اپنے دور رس نتائج کے اعتبار سے بنی نوع انسان کے لئے عظیم الشان فوائد کا حامل ہے تو لازماً خالق فطرت نے انبیاء علیہم السلام کو اصلاح کا یہی مؤثر طریق سکھایا ہوگا اور کتب مقدسہ ''اٹھ بندے اٹھ تلوار اٹھا'' کے نعرہ ہائے جنگ سے بھرپور ہوں گی یہاں تک کہ ہر دوسرے تیسرے فرمان الٰہی کے بعد بشدت یہ تقاضا کیا جاتا ہوگا کہ اے خدائی فوجدارو! نصیحت ایک بے کار چیز ہے اس کا خیال تک دل میں نہ آنے دو اور اگر تم بندگان خدا کی اصلاح کا ایک موہوم تصور بھی رکھتے ہو تو حکومت وقت کا تختہ الٹ دو اور بزور ان کی شرارتوں کا خاتمہ کر دو مگر حیف ہے اس مکتبہ خیال کے حامیوں پر کہ ایسا ہرگز نہیں۔حیف کہ معاملہ برعکس ہے اور اس مسئلہ پر خالق فطرت کا فیصلہ مذکورہ بالا اشترا کی اور مودودی نظریہ کے بالکل خلاف نظر آتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی نظر میں تو نصیحت ایک ایسی کار آمد چیز ہے کہ اس عالمگیر نقصان کے زمانہ میں بھی جبکہ انسانیت بحیثیت مجموعی گھاٹے کی طرف جا رہی ہوگی صرف وہی نیک عمل والے مومن کامیاب ہوں گے جن کی شان یہ ہوگی کہ:۔

وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر:۴)

وہ حق اور صبر کے ساتھ نصیحت کریں گے

---

[1] حقیقت جہاد صفحہ ۱۱

صحیفۂ فطرت پر ایک نظر ڈالنے ہی سے انسان اس حقیقت کو پا جاتا ہے کہ روحانی اور اخلاقی انقلابات برپا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو جو ذریعہ اختیار کرنے کی تلقین فرماتا ہے وہ محض حق بات کی نصیحت کرنا ہے۔ دعا کے ساتھ اور صبر کے ساتھ، صبر کے ساتھ اور دعا کے ساتھ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کے پورا ہونے کا دن آ جائے کہ:۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (الاعراف:۱۲۹)

انجام کار متقیوں ہی کی فتح ہو گی۔

خدا تعالیٰ کے تمام فرستادہ نبی اسی مکتبہ خیال کے حامی تھے اور ان کا اصلاح خلق کا تصور جبری اصلاح کے اشترا کی تصور کے بالکل برعکس تھا۔ قرآن کریم انبیاء علیہم السلام کے اس مقدس گروہ کو مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین اور مبشرین کی ایک جماعت کے طور پر پیش کرتا ہے جن کے طریق کار کا ذکر بنی نوع انسان کی راہنمائی کی خاطر ہمیشہ ہمیش کے لئے اس مقدس صحیفہ میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ پس اس الٰہی بیان کے مطابق حضرت نوحؑ کا انقلابی ہتھیار بھی نصیحت تھا اور حضرت ابراہیمؑ کا بھی۔ حضرت شعیبؑ کا بھی اور حضرت صالحؑ کا بھی۔ حضرت لوطؑ بھی ناصح ہی بن کر آئے تھے اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ بھی اور سب سے آخر پر مگر ان سب سے کہیں بڑھ کر سید ولد آدم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی محض ایک ناصح کے طور پر ہی ایک عظیم ترین عالمگیر روحانی انقلاب برپا کرنے کے لئے اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ پھر میں اس مقدس زمرہ انبیاء کی اس اجماعی سنت کو کیسے یکسر نظر انداز کر ڈالوں اور مودودی صاحب کے اس اشترا کی دعویٰ کو تسلیم کر لوں کہ

''جو کوئی حقیقت میں خدا تعالیٰ کی زمین سے فتنہ وفساد کو مٹانا چاہتا ہو اور واقعی یہ چاہتا ہو کہ خلق خدا کی اصلاح ہو تو اس کے لئے محض واعظ اور ناصح بن کر کام کرنا فضول ہے۔''

دیکھئے حضرت نوحؑ کی قوم نے جب آپؑ پر کھلی کھلی گمراہی پھیلانے کا الزام لگایا تو آپ نے قرآن کریم کے بیان کے مطابق انہیں یہی جواب دیا کہ:۔

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (الاعراف:۶۲،۶۳)

’’اے میری قوم میں گمراہ نہیں ہوں بلکہ ربّ العالمین کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں اور (میرا کام یہ ہے کہ) تمہیں اپنے ربّ کا پیغام پہنچاتا ہوں اور نصیحت کرتا ہوں اور اپنے ربّ کی طرف سے مجھے ان امور کا علم دیا گیا ہے جنہیں تم نہیں جانتے۔‘‘

یہ ہے وہ خطاب جو اللہ تعالیٰ کے بیان کے مطابق حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کیا مگر مودودی نظریہ کے مطابق ان کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ ’’میں تو خدا کا رسول ہوں اور بزور شمشیر اپنے صالحین کی جماعت تم پر مسلط کر دوں گا اور خواہ تم ہاتھ اٹھاؤ یا نہ اٹھاؤ وہ بہرحال تمہارے غیر صالح ہاتھوں سے اقتدار چھین لیں گے۔‘‘

پھر دیکھئے حضرت ہودؑ پر جب عاد قوم نے بے وقوف ہونے کا الزام لگایا تو جواباً آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم میری نصیحت کے بے ضرر طریق کو دیکھ کر مجھے بیوقوف نہ سمجھتے رہنا یہ تو ایک عارضی روپ ہے ورنہ دراصل میں تو ایک جابر اور متشدد انسان ہوں اور ایک دن خدا کے باغیوں سے عنان حکومت چھین کر اپنی صالح جماعت کے سپرد کر دوں گا بلکہ سنت انبیاء کے مطابق آپ کا جواب بھی نہایت ہی پاکیزہ تھا اور اس میں سنگدلی اور جبر و تشدد کے ارادوں کا شائبہ تک نہ تھا۔ قرآن کریم وہ جواب ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ:۔

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ (الاعراف:٦٨،٦٩)

اے میری قوم! مجھ میں بیوقوفی کی تو کوئی بات نہیں میں تو تمام جہانوں کے ربّ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں۔ اپنے ربّ کے پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور تمہارے لئے ایک ناصح کی حیثیت رکھتا ہوں اور امین ہوں۔

پھر حضرت ہودؑ کے بعد حضرت صالحؑ کو بھی قوم نے ٹھکرادیا اور طرح طرح کے الزام لگائے مگر آپ کا جواب بھی یہی تھا کہ:۔

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ۔

(الاعراف:٨٠)

اے میری قوم! دیکھو میں تمہیں اپنے ربّ کا پیغام پہنچا چکا اور نصیحت کر چکا ہوں لیکن تم ناصحین سے محبت کرنے والے لوگ نہیں ہو۔

پھر حضرت لوطؑ کی جماعت نے بھی حضرت لوطؑ کی قوم کا اقتدار جبر سے نہ چھینا بلکہ نصیحت کرتے چلے گئے یہاں تک کہ اس قوم کی عقوبت کا وقت آ پہنچا تب اس سے پیشتر کہ عذاب ظالموں کی اس بستی کو گھیر لیتا اللہ کے اذن سے حضرت لوطؑ اور آپ کے ساتھی ہمیشہ کے لئے اس بستی کو چھوڑ کر چلے گئے تب وہ ہولناک صبح طلوع ہوئی جس سے ہمیشہ ظالموں کو ڈرایا جاتا ہے۔ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِیْنَ (الصافات:۱۷۸) دیکھو! کیسی بری صبح ہوتی ہے ان کی جن کو عذاب الٰہی سے ڈرایا جاتا ہے۔

اور حضرت شعیبؑ نے بھی دشمنوں کی ایذارسانی کے باوجود نصیحت ہی سے کام لیا اور جب مخالف ظلموں سے باز نہ آئے فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ وَ قَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ (الاعراف:۹۴) تو وہ ان لوگوں سے الگ ہو گئے اور کہا کہ اے میری قوم! میں تمہیں اپنے ربّ کے پیغامات پہنچا چکا ہوں اور نصیحت کر چکا پس کس طرح ایک کافر قوم پر (جو مسلسل انکار پر مصر ہے) اپنے غم کا اظہار کروں۔

غرضیکہ تمام انبیاء کا مقام ناصحین کا مقام تھا اور جب ان کا انکار کیا جاتا تھا تو وہ اپنے ربّ کے حضور جھکتے اور گریہ وزاری کرتے تھے اور بزورِ شمشیر مخالفین سے عنانِ حکومت چھیننے کی بجائے وہ یقین رکھتے تھے کہ ان کا فرض صرف محبت اور نرمی اور عجز اور نصیحت کے ساتھ اصلاح کرنا ہے اور باقی خدا کا کام ہے۔ وہ مالک حقیقی ہے اور جسے چاہتا ہے حکومتوں کا وارث بنا دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ان کا نعرہ بھی یہی تھا کہ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ (الاعراف:۱۲۷)

اور اپنی قوم کو یہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا (الاعراف:۱۲۹) اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو اور صبر کرو اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (الاعراف:۱۲۹) یقیناً ساری زمین خدا تعالیٰ کی ملکیت ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث کر دیتا ہے (یہ ہمارا کام نہیں کہ اپنے زعم میں اپنے آپ کو صالحین کہہ کر بزورِ شمشیر اقتدار حاصل کریں) ہاں ہم اتنا ضرور جانتے ہیں وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ کہ انجام کار فتح بہر حال متقیوں کو

نصیب ہوگی۔

حضرت موسیٰ ؑ کے بعد حضرت عیسیٰ ؑ نے بھی اپنی ساری زندگی نصیحت میں صرف کر دی اور کبھی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے کی سکیمیں نہ بنائیں اور آخر میں سب نبیوں کا سردار ؐ بھی ناصح بن کر ہی لوگوں کو نیکی کی طرف بلانے کے لئے آیا داروغے یا خدائی فوجدار کی حیثیت کبھی اختیار نہ کی اللہ تعالیٰ نے بھی خود آپ کو ناصح ہی کا نام دیا اور فرمایا:۔

فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَآ أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیة:۲۲، ۲۳)

پس (اے محمد ؐ) نصیحت کر تو محض ایک واعظ ہے اور ان (لوگوں) پر داروغہ مقرر نہیں۔

مگر مودودی صاحب اس دعویٰ پر مصر ہیں کہ وہ اور ان کی جماعت:۔

''مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین اور مبشرین کی جماعت نہیں ہے بلکہ یہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے۔ لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا سے ظلم، فتنہ و فساد، طغیان اور ناجائز انتفاع کو بزور مٹا دے[1]۔''

خدا تعالیٰ تو اپنے بزرگ ترین رسول ؐ کو بھی یہی نصیحت فرما تا رہا ہے کہ:۔

وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (الانعام:۱۰۸)

نہ تو ہم نے تجھے ان پر داروغہ مقرر کیا ہے اور نہ تو ان کے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

مگر مودودی صاحب داروغگی ہی کے نہیں بلکہ فوجداری حقوق اپنے لئے اور اپنی جماعت کے لئے محفوظ کروا رہے ہیں۔ کس قدر تعجب ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس مصلح اعظم کو تو فوجداری حقوق نہ سونپے جس کی خاطر کائنات کو پیدا کیا تھا مگر مودودی صاحب اور ان کے صالحین کی جماعت کو اس عطائے خاص کے لئے چن لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پُرشفقت ورحمت دل سے جب دردناک دعائیں اٹھتی تھیں کہ اے میرے آقا! مجھے توفیق بخش کہ میں سارے جہان کی ہدایت کا موجب بن جاؤں تو آپ ؐ کو تو خدا تعالیٰ یہی جواب دیتا رہا کہ:۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس:۱۰۰)

---

[1] حقیقت جہاد صفحہ ۵۸

کیا تو لوگوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں۔

اور آپؐ کے منکرین سے متعلق یہی اطلاع دیتا رہا کہ:۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَ مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ

(الانعام:۱۰۸)

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ کبھی شرک نہ کرتے۔اور تجھے ہم نے ان پر داروغہ مقرر نہیں کیا نہ ہی تو ان پر نگران ہے۔

مگر مودودی صاحب نے جب اصلاح خلق کا ارادہ کیا تو معاً جبر و اکراہ کی ساری قوتیں انہیں سونپی گئیں اور تمام فوجداری اختیارات انہیں ودیعت کئے گئے تا کہ ''دنیا سے ظلم، فتنہ وفساد، ناجائز انتفاع اور طغیان کو بزور مٹا'' ڈالیں۔

کس قدر افسوس ہے اور کیسا تعجب ہے کہ فتنہ وفساد مٹانے اور خلق خدا کی اصلاح کرنے کا یہ طریق تمام انبیاء گزشتہ کی نظر سے پوشیدہ رہا اور کسی نے بھی اس انمول راز پر اطلاع نہ پائی یا پھر شائد (نعوذ باللہ) خدا تعالیٰ ہی سے چوک ہوئی۔ایک لاکھ چوبیس ہزار مرتبہ اس نے اصلاح خلق کا ارادہ کیا اور ایک لاکھ چوبیس ہزار مرتبہ وہ یہ بھول جاتا رہا کہ ''محض واعظ اور ناصح بن کر کام کرنا فضول ہے'' یہاں تک کہ نبی آخر زماں، سب نبیوں کا سردارؐ بھی آیا اور گزر گیا مگر پھر بھی خدا تعالیٰ کو نصیحت کی بے مائیگی یاد نہ آئی اگر کچھ یاد آیا تو اصلاح خلق کا وہی ازلی اور ابدی گُر کہ:۔

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (الاعلیٰ:۱۰)

نصیحت کر یقیناً نصیحت فائدہ بخشتی ہے۔

اگر مودودی صاحب راستی پر ہی ہیں تو بھی بخدا مجھے اس مودودی سچائی کی کچھ بھی پروا نہیں کیونکہ اصلاح خلق کا وہ راز جو میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر نازل نہیں ہوا اگر دس کروڑ مرتبہ بھی کسی مودودی دل پر نازل ہو تو دس کروڑ مرتبہ ہی بہ بانگ دہل میں اس کا انکار کرتا چلا جاؤں گا۔میں تو وہی حربہ اختیار کروں گا جو مصلح اعظم، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا اور ہر دوسرے حربہ کو پاؤں کی ایک ٹھوکر سے ردّ کروں گا۔

اقتدار کی تڑپ

مودودی صاحب کی مختلف کتب کے مطالعہ کے بعد میں اس یقینی نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ موصوف کی نفسیات کے تجزیہ کا ماحصل ان تین لفظوں میں سمٹا ہوا ہے۔ ’’اقتدار کی تڑپ‘‘۔

یہ اقتدار کی تڑپ ایسی بے حد و بے پناہ ہے کہ ان کے ہر نظریہ حیات پر مسلط ہو چکی ہے۔

ان کے نزدیک عبادت الٰہی کا مفہوم بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کے بعض بندوں کو صالح بنا کر دوسرے بندگان خدا پر حکومت کرنے کا اہل بنایا جائے اور عبادتوں کے روحانی پہلو کی طرف ذرا بھی ان کی نگاہ نہیں اٹھتی۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ عبادت کی بنیادی غرض بندے کا خدا تعالیٰ سے وصال کرانا ہے یعنی اس مقصد کا پورا کرنا ہے جس کی خاطر جن و انس پیدا کئے گئے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ عبادت کائنات کی تخلیق کا مقصود ہے کسی ثانوی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ عبادت جن و انس کی خاطر پیدا نہیں کی گئی بلکہ جن و انس عبادت کی خاطر پیدا کئے گئے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات:۵۷) ہم نے عبادت کی خاطر ہی جن و انس پیدا کئے ہیں مگر مولانا کا اصرار ہے کہ:۔

> ’’یہ نماز اور روزہ۔ یہ زکوٰۃ اور حج دراصل اسی تیاری اور تربیت کے لئے ہیں۔ جس طرح تمام دنیا کی سلطنتیں اپنی اپنی فوج، پولیس اور سول سروس کے لئے آدمیوں کو پہلے خاص قسم کی ٹریننگ دیتی ہیں پھر ان سے کام لیتی ہے۔ اسی طرح اسلام بھی ان تمام آدمیوں کو جو اس ملازمت میں بھرتی ہوں پہلے خاص طریقہ سے تربیت دیتا ہے پھر ان سے جہاد اور حکومت الٰہی کی خدمت لینا چاہتا ہے[1]‘‘۔

---

[1] حقیقت جہاد صفحہ ۱۶

عبادت کا اس خوفناک حد تک مادی نظریہ یقیناً دنیا کے کسی مذہب نے کبھی پیش نہیں کیا۔مگر جب اقتدار کی بے پناہ تمنا ہر نظریہ حیات پر مسلط ہو چکی ہو تو بعید نہیں کہ عبادت الٰہی بھی فوج، پولیس اور سول سروس کی ٹریننگ کی طرح نظر آنے لگے۔

اور یہ اقتدار کی تمنا ایسی بے صبر و بے قرار تمنا ہے کہ کسی مشکل اور لمبی (مگر درست) راہ کو اختیار کر کے حصول مقصد کی اجازت نہیں دیتی۔اشتراکیت کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ انقلاب کے لئے لمبے جمہوری طریق کو اختیار کرنا عبث ہے بلکہ کمیونسٹ پارٹی اپنے ''نیک مقصد'' کے حصول کی خاطر جب بھی موقع پائے حکومت وقت کا تختہ الٹ کر عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔مولانا کا بھی بعینہٖ یہی دعویٰ ہے۔سر مو فرق نہیں۔چنانچہ مودودی فرمان اپنے متبعین کو یوں پابند کرتا ہے کہ:۔

> ''جس سرزمین میں بھی تمہاری حکومت ہو وہاں خلق خدا کی اصلاح کے لئے اٹھو حکومت کے غلط اصول کو صحیح اصول سے بدلنے کی کوشش کرو۔ناخدا ترس اور شتر بے مہار قسم کے لوگوں سے قانون سازی اور فرمارروائی کا **اقتدار چھین لو**[۱]''۔

حیرت کی بات ہے کہ مولانا اقتدار کی تمنا میں ایک ہزاروں سال کے آزمودہ عام اخلاقی نکتہ کو سمجھنے سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں اور وہ نکتہ یہ ہے کہ دعاوی خواہ کتنے ہی بلند بانگ ہوں اور نیتیں خواہ بظاہر کیسی ہی نیک کیوں نہ ہوں ملک کی کسی پارٹی کو لڑ کر حکومت پر قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ورنہ دنیا میں ایک ایسا فساد عظیم برپا ہو جائے گا کہ تاقیامت مٹ نہ سکے گا اور خانہ جنگیوں کی ایسی آگ بھڑکے گی کہ بجھائے نہ بجھے گی۔

اوّل تو اس امر کا فیصلہ کہ جس مقصد کے لئے کوئی پارٹی کھڑی ہوئی ہے وہ نیک ہے بھی یا نہیں خود اسی پارٹی پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔دوسرے اگر بالفرض اسے نیک تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس فیصلہ کا اختیار بھی اسی پارٹی کو نہیں دیا جا سکتا اور نہ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ان کے مدمقابل تمام لوگ تو یقیناً بدکردار، ناہنجار، ناخدا ترس اور ظالم و سفّاک ہیں لیکن خدائی فوج داروں کی اس پارٹی کا ہر ممبر صالح اور خدا ترس ہے اور نفس کی ملونی اور حرص و ہوا سے کلیتہً پاک ہے اور بحیثیت مجموعی یہ پارٹی

---

۱ حقیقت جہاد صفحہ ۱۵

خالصتًا اصلاح خلق کی نیت سے ہی میدان عمل میں کودی ہے لیکن اس احتمال کو کوئی کہاں لے جائے کہ بسا اوقات ایسی پارٹیاں جو نیک نیتوں کے بلند بانگ دعاوی لے کر اٹھتی ہیں بہت جلد اقتدار کی ہوس ان پاک ارادوں کو ڈگمگا دیتی ہے اور پاکیزہ نیتوں کو بھسم کر دیتی ہے۔ خود مودودی صاحب ہی کے الفاظ میں ذرا فطرت انسانی کی اس بے اختیاری کا قصہ سنیئے:۔

"لیکن حکومت اور فرمانروائی جیسی کچھ بد بلا ہے ہر شخص اس کو جانتا ہے۔ **اس کے حاصل ہونے کا خیال کرتے ہی انسان کے اندر لالچ کے طوفان اٹھنے لگتے ہیں۔ خواہشات نفسانی یہ چاہتی ہیں کہ زمین کے خزانے اور خلق خدا کی گردنیں اپنے ہاتھ میں آئیں تو دل کھول کر خدائی کی جائے**[۱]۔"

پس جب خود مولانا کو بھی یہ تسلیم ہے کہ اقتدار کی تمنا تو خیر الگ رہی اس کے حاصل ہونے کا خیال ہی ایک نہایت خطرناک تبدیلی دل میں پیدا کر سکتا ہے تو اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ ان کے تیار کردہ "صالحین" اس خطرناک مقام سے محفوظ گزر جائیں گے۔ اگر کہیں کہ ان کی نیک نیتی کی ضمانت اس وجہ سے لی جاسکتی ہے کہ وہ اس ٹریننگ میں سے گزر چکے ہوں گے جو اس "سول سروس" کے لئے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے یعنی تمام عبادات اسلامی بجالانے والے ہوں گے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا نے یہ فرض کہاں سے کر لیا صرف ان کی اسلامی جماعت کے ارا کین ہی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے فرائض ادا کرتے ہیں اگر احمدیوں کی عبادتیں آپ کے نزدیک عبادتیں نہ بھی ہوں تو کیا بریلوی کلیتہً ان عبادات کے تارک ہیں یا دیو بندی ان سے بیزار ہو چکے ہیں؟ کیا شیعہ خیال کے مسلمانوں کی عبادتیں عبادتیں نہیں اور اہل قرآن ان کو یکسر ترک کر بیٹھے ہیں؟ پھر ان سب کو کیوں حق نہیں پہنچتا کہ وہ بھی اپنے اپنے رنگ میں بزور شمشیر ہر وقت اس حکومت وقت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرتے رہیں جو ان کے مکتب خیال کے مطابق فاسد نظریات پر مبنی ہو۔ پھر غیر مسلم بھی تو اپنی اپنی جگہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ سمجھتے تو کیا فوج در فوج اسلام میں نہ داخل ہو جاتے؟ اس لئے ان کو بھی اصولاً یہ حق ملے گا کہ حکومت وقت کا تختہ الٹنے کے لئے ہر وقت

---

[۱] حقیقت جہاد صفحہ ۱۵

ریشہ دوانیوں میں مصروف رہیں۔

نیک ارادوں یا اصلاح خلق کے بہانے صالحین کی مختلف پارٹیوں کو حکومتوں کا تختہ الٹنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کسی کی صالحیت کے بارہ میں ان کے اختلافات ایسے شدید اور سنگین ہو سکتے ہیں کہ اگر دونوں کو تسلیم کرلیا جائے تو کوئی پارٹی بھی صالح نہ رہے۔ اسی مثال پر غور کر لیجئے کہ مولانا کے نزدیک احمدیت کا اسلام سے کوئی بھی تعلق نہیں یہ امت محمدیہ میں فساد برپا کرنے کے لئے انگریزوں کا خود کاشتہ پودا ہے جو انہوں نے اس غرض سے لگایا تھا کہ مسلمانوں کو جہاد سے متنفر کیا جائے اور ان کی قوت عمل کو زائل کر دیا جائے۔ احمدیت کا بیج اس لئے بویا گیا ہے کہ مسلمانوں میں باہم اختلافات پیدا کر دیئے جائیں اور مارِ آستین کی طرح یہ جماعت اسلام میں شامل ہو کر ایک خفیہ مگر سخت مہلک حملہ کے ذریعہ اسلام کی بیخ کنی کر دے۔

مگر میرے نزدیک جماعت احمدیہ خالصتاً اسلام کے غلبہ اور احیائے نو کی خاطر قائم کی گئی ہے اس کا بیج انگریز نے نہیں بلکہ اس خدا نے اپنے ہاتھ سے بویا ہے جس نے امت محمدیہؐ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی اصلاح کے لئے ایک مہدی عطا کرے گا اور ایک ایسا مسیح نازل فرمائے گا (جو اپنے ناقابل تردید دلائل کے ذریعہ) صلیب کو پارہ پارہ کر دے گا۔ پس میرے نزدیک یہ جماعت اسی مہدی اور مسیح کی جماعت ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ بنی نوع انسان کی اصلاح کی غرض سے بے غرضانہ اور درویشانہ وعظ و نصیحت کے کام میں مصروف ہے اور دوسری طرف زمین کے کناروں تک عیسائیت سے مصروف پیکار ہے اور ہر میدان میں اسے شکست دے رہی ہے۔ میں بھلا کس طرح باور کروں کہ یہ انگریز کا خود کاشتہ پودا ہے۔ کیا انگریز کے خود کاشتہ پودے کا یہی کام تھا کہ وہ انگریز کے مذہب یعنی عیسائیت کے پودے کی بیخ کنی کر دے اور ہر سرزمین سے اس کی جڑیں اکھاڑ پھینکے جہاں جہاں یہ پہنچے تثلیث کے پودے سوکھنے لگیں اور توحید کے بیج بوئیں جائیں۔ یہ بیج سرسبز اور شاداب لہلہاتی ہوئی کونپلوں کی صورت پھوٹیں اور جلد جلد بڑھنے لگیں۔ تنومند اور جوان ہوں اور پھولیں اور پھلیں۔ ان کے پھول حسین اور معطر ہوں۔ پھل خوش منظر اور میٹھے۔ اور سبز شاخوں کے سائے تسکین بخش ہوں۔ سعید روحیں پرندوں کی طرح ان کی ڈالی ڈالی پر وحدت کے گیت گائیں۔

اگر انگریز کے خود کاشتہ پودوں نے یہی کام سرانجام دینے تھے تو کاش ــــــ انگریز اپنے دورِ حکومت میں ان صفات کے اور بھی دو چار خود کاشتہ پودے لگا جاتے تا کہ اسلام کل زندہ ہونے کے بجائے آج زندہ ہو جاتا اور عیسائیت کل مرنے کے بجائے آج مر جاتی۔

اب دیکھئے احمدیت کے بارے میں میرا یقین اور ایمان اس فتویٰ سے کتنا مختلف ہے جو مولانا مودودی اس جماعت کے بارے میں صادر فرماتے ہیں۔ میں تو اس جماعت کی عمارت کو اس گہرے عشق پر قائم دیکھتا ہوں جو غیر متزلزل طور پر اس جماعت کے بانی کے دل میں خدا اور اس کے رسولؐ کے لئے جاگزیں تھا اور جس کا اظہار آپؑ اپنے ایک شعر میں اس طرح فرماتے ہیں کہ:۔

بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمرم ــــــ گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

''میں تو خدا کے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عشق میں مخمور ہوں۔ اگر کفر یہی ہے تو خدا کی قسم میں سخت کافر ہوں۔''

مگر مولانا کے نزدیک اس جماعت کی جڑیں سرزمین انگلستان میں پیوستہ ہیں۔ کیا کوئی بھی نسبت ہے ان دونوں اعتقادات میں؟

پھر اس مثال کو الٹا کر اس طرح بھی ملاحظہ فرمالیجئے کہ مولانا کے نزدیک ''جماعت اسلامی'' اس لئے قائم کی گئی ہے کہ ''صالحین'' کی ایک جماعت تیار کی جائے جو اسلامی عبادات کو لمبے عرصہ تک نہایت سختی کے ساتھ ادا کرنے کے بعد اس قابل ہو جائے کہ اسلام ان سے کہہ سکے کہ:۔

''ہاں اب تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہٰذا آگے بڑھو **لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔**''

چنانچہ مولانا کی کوششوں سے روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندوں کی جماعت تیار ہو چکی ہے اور اب صرف اس بات کا انتظار ہے کہ کب اتنی طاقت پیدا ہو کہ ''لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل'' کر کے ''حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں'' لے لئے جائیں۔

مولانا سمجھتے ہیں کہ یہ جماعت خالصۃً دنیا کی اصلاح اور اسلام کا بول بالا کرنے کی غرض سے

قائم کی گئی ہے تا کہ غیر اللہ کا تصور مٹا دیا جائے اور نوک شمشیر سے اللہ کا تصور دلوں پر کندہ کر دیا جائے۔

مگر میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ یہ بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے کہ مودودی جماعت کے اراکین ''روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے'' ہیں۔ میرا یہ ایمان ہے کہ اگرچہ ہمیں یہ حق تو حاصل ہے کہ ہم عقائد کی رو سے کسی جماعت یا مذہب سے متعلق یہ فیصلہ کریں کہ وہ حق وصداقت پر مبنی ہے مگر ہمیں یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ اس دنیا میں اپنے متعلق یہ فتویٰ دیں کہ ہم نیک اور صالح ہیں سوائے اس کے کہ صالحیت کے غیر مشکوک آثار ظاہر ہوں اور اللہ تعالیٰ کے پیار کی علامات نظر آنے لگیں۔ جس طرح وہ پہلے اپنے پیارے صالحین سے ہمکلام ہوتا رہا ہے اب بھی ہمکلام ہو جس طرح وہ پہلے امت کے صوفیاء اور بزرگان پر ظاہر ہوتا رہا ہے اب بھی دعویداران صالحیت پر ظاہر ہو۔ ان کی نصرت فرمائے اور اپنی قولی اور فعلی شہادت سے یہ بات ثابت فرما دے کہ صالحیت کا دعویٰ کرنے والے واقعی صالح ہیں ورنہ انسان ریا کاری اور خوش فہمیوں کے چکر میں ایسا پھنسا ہوا اور فطرت انسانی کے پاتال تک کی خبر رکھتا ہے کہ کون صالح ہے اور کون غیر صالح ہے۔

پس میرے نزدیک مودودی صاحب کا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے اور یہ بھی بالکل غلط ہے کہ ''جماعت اسلامی'' اسلام کا بول بالا کرنے کے لئے قائم کی گئی ہے۔ کیونکہ اگر اس جماعت کے وہی عقائد ہیں جو مولانا مودودی کے ہیں تو یہ اسلام کا بول بالا نہیں کر رہی بلکہ اسلام کو دنیا کی نظروں میں حقیر کر رہی ہے اور طبیعتوں کو اس پاک مذہب سے سخت متنفر کر رہی ہے۔ پاکستان کی مسلمان اکثریت کے ماحول میں بیٹھے ہوئے مولانا مودودی اسلام کے بول بالا ہونے کے جس قدر نعرے چاہے لگالیں مگر ذرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ''اشاعتِ اسلام'' اور آپؐ کی ''پالیسی'' کے بارہ میں اپنے نظریات لے کر غیر اسلامی ملکوں میں تبلیغ کے لئے تو نکل کر دیکھیں خوب کھل جائے گا کہ ان نظریات سے اسلام کا کس قدر بول بالا ہو رہا ہے۔ ذرا اس عقیدہ کو ہاتھ میں لے کر کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی تک آسمان پر زندہ موجود ہیں کسی عیسائی ملک کو اسلام کی طرف بلا کر تو دیکھیں اور اس ہتھیار سے کسر صلیب کی کوشش تو کریں پھر میں ان سے پوچھوں گا کہ بتایئے یہ مودودی نظریات اسلام اور اس کے مقدس رسولؐ کے نام کا بول بالا کر رہے ہیں یا صورت برعکس ہے۔

سچ یہی ہے اور اسی پر میرا ایمان ہے کہ ان نظریات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخت ہتک لازم آتی ہے اس لئے میں مودودی جماعت کو ہرگز اسلام کا دوست نہیں سمجھتا۔صرف یہی نہیں بلکہ مجھے اس جماعت میں اور اس کے طریقہ کار میں اشتراکیت کی بو آتی ہے اور اس کا بیج سرزمین روس میں بویا ہوا دکھائی دیتا ہے اور روحانیت کا کلی فقدان نظر آتا ہے۔

اب دیکھ لیں کہ ہمارے دعاوی ہمیں اپنی نظر میں کتنے معصوم اور کتنے نیک دکھائی دیتے ہیں مگر جب ایک دوسرے کی نظر سے ان کو دیکھیں تو... اَلْاَمَانُ وَالْحَفِیْظُ!

اس مثال کو اگر امت کے باقی فرقوں پر پھیلا دیا جائے اور ہر ایک کا ہر ایک سے اسی طرح موازنہ کیا جائے تو اس نظریہ کی قلعی کھل جائے گی کہ انسانوں کی اصلاح کی خاطر اور فساد اور ظلم اور طغیان کو دنیا سے دور کرنے کے لئے لڑ کر حکومت پر قبضہ کرنا جائز ہے۔

میں جب اس مودودی نظریہ کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ مشہور مقولہ یاد آجاتا ہے کہ:۔

''جہنم کا راستہ نیک نیتوں کی اینٹوں سے بنا ہوا ہے''

اور آخری حتمی فیصلہ طلب کرتے ہوئے جب میں قرآن کریم پر نظر دوڑاتا ہوں تو اس آیت پر نظر ٹھہر جاتی ہے کہ؛۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ (البقرۃ:۱۲،۱۳)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو مصلحین کی جماعت ہیں۔خبردار! یہی فسادی ہیں مگر جانتے نہیں۔

اللہ اللہ! کتنا پیارا کلام ہے اور اس چھوٹے سے کلمہ میں کیسی کیسی ابدی صداقتیں بھری ہوئیں ہیں۔اس آیت کا ایک ایک جز اپنے اندر فطرت انسانی کے گہرے راز لئے ہوئے ہے۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو مصلحین کی جماعت ہیں۔خبردار! یہی فسادی ہیں مگر جانتے نہیں!

قتل مرتد
مودودی نظر میں

مولانا کی حصول اقتدار کی تمنا ہر قید و بند سے آزاد ہے اور ہر میدان میں ان کی متشدد طبیعت کے پہلو بہ پہلو جولانی دکھاتی ہے۔ان کا قتل مرتد کا عقیدہ بھی اسی کا کھلایا ہوا ایک گل ہے اور اپنے مخصوص طریق کے مطابق یہ اس عقیدہ کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ چنانچہ اس موضوع پر ایک رسالہ ''مرتد کی سزا اسلامی قانون میں'' قلم بند فرمایا ہے جس میں نہایت دلیری سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس نظریہ کو منسوب کیا ہے اور حضرت ابوبکرؓ کی اس فوج کشی سے نظیر پکڑی ہے جو آپ نے منکرین زکوٰۃ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے فرمائی تھی۔ جہاں تک مولانا کے پیش کردہ ''نقلی'' اور ''عقلی'' دلائل پر تفصیلی بحث کا تعلق ہے یہ امر ایک علیحدہ کتاب کا متقاضی ہے۔پس میں یہاں اس کے چند ایک پہلوؤں کے ذکر پر ہی اکتفا کروں گا۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ اور بھی علماء اسلام نے جو یقیناً نیک دل اور صاف نیت تھے اس مسئلہ میں ٹھوکر کھائی ہے مگر ان کی ٹھوکر اور مولانا مودودی کی ٹھوکر میں ایک بھاری فرق ہے اور میں پہلے اسی فرق کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ان علماء کی غلطی محض ایک فقہی غلطی تھی اور ان کے نفس کے تشدد کا اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ وہ دیانتداری سے اس بات کے قائل تھے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے ان کے ہاں مسلمان کی تعریف ایسی وسیع تھی کہ اس سے

امت محمدیہ میں کسی قتل عام کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور اس حکم کا اطلاق اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے مذہب سے آکر اسلام میں شامل ہو پھر مرتد ہو جائے اور واضح طور پر کہے کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ اس پر بھی خود اس نظریہ کے حامل علماء میں سے بعض کا یہ فتویٰ تھا کہ ایسے شخص کو توبہ کے لئے غیر معین مدت تک مہلت دینی چاہیے۔ اس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ان کی یہ غلط فہمی اس خواہش کی بناء پر نہ تھی کہ خلق خدا کی گردنیں ان کے ہاتھ میں آجائیں اور وہ دل کھول کر خدائی کریں۔ ہرگز انہیں یہ ذوق وشوق نہیں تھا کہ وہ زبردستی پہلے کلمہ گو مسلمانوں پر کفر کے فتوے لگا کر انہیں کافر قرار دے لیں پھر قتل مرتد کا عقیدہ دامن میں لے کر گھات لگائے بیٹھے رہیں کہ کب اقتدار ہاتھ میں آئے اور کب ہم مرتدین کے خون کے دریا بہادیں۔

مگر یورپ کی تاریک صدیوں کے رہنمایان مذاہب کی طرح جن کے نزدیک عیسائیت سے ارتداد کی سزا قتل تھی اور عیسائیت سے مراد وہ عیسائیت تھی جو ان کے مکتب خیال کے مطابق ہو۔ مودودی صاحب کے نزدیک بھی اسلام سے ارتداد کی سزا قتل ہے اور اسلام سے مراد وہ اسلام ہے جسے مودودی صاحب یا ان کے کوئی جانشین اسلام قرار دیں۔ چنانچہ مودودی دور حکومت میں اس امر کا آخری فیصلہ بہرحال کسی مودودی حکمران ہی کے ہاتھ میں ہوگا کہ کون مسلمان اور کون مرتد کے حکم میں آتا ہے۔ یہ فیصلہ کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب غیر مشکوک طور پر مولانا کی تصنیفات میں دیا جاچکا ہے۔

مگر اس بارہ میں مولانا کے تصورات قلم بند کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ حتی الامکان اختصار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس الزام سے بریت ثابت کروں کہ نعوذ باللہ آپؐ بھی اس عقیدہ کے قائل تھے کہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنے کی سزا اسلامی قانون میں قتل ہے۔

اگر کسی شخص کی طرف کوئی خیال یا فعل منسوب کیا جائے تو طبعاً دل میں ایک سوال اٹھتا ہے کہ کیا وہ دعویٰ یا فعل اس شخص کے معلوم اخلاق اور شمائل کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کسوٹی پر ہم بہت سے امور کو روزمرہ کی زندگی میں پرکھتے ہیں اور اس کا اطلاق صرف انسان پر ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر چیز پر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی آپ سے کہے کہ میں نے جنگل میں ایک گھوڑا دیکھا جو شیر کو چیر پھاڑ کر کھا رہا

تھا یا ہرن کا ایک بچہ دیکھا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک چیتے پر حملہ کر کے اس کے ٹکڑے اڑا دیئے تو آپ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا کیونکہ یہ دعویٰ گھوڑے اور ہرن کی معلوم خصلت کے صریحاً خلاف ہے۔ اسی طرح یہ قتل مرتد کا عقیدہ ظاہراً ایک ایسا غیر طبعی اور غیر منصفانہ فعل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اس نظریہ کو بہر حال منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ آپؐ کا تو پیغام ہی یہی تھا کہ دنیا والے اپنے تمام مذاہب چھوڑ کر آپ کا مذہب قبول کر لیں پھر آپ خود کس طرح تبدیلی مذہب پر کسی قسم کے جبر کو روا رکھنے کی اجازت دے سکتے تھے۔ جب لوگ کوئی دوسرا مذہب چھوڑ کر آپؐ کے مذہب میں داخل ہوتے تھے اور اس جرم کی پاداش میں ان کو مارا یا ستایا جاتا تھا تو آپؐ اسے صریح ظلم قرار دیتے تھے اور انسان کی آزادی ضمیر کے خلاف ایک سخت غیر منصفانہ اقدام سمجھتے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ سب عادل انسانوں سے بڑھ کر عدل کرنے والا اور سب منصفوں سے زیادہ منصف مزاج اپنے معاملہ میں اس معیار کو بالکل فراموش کر ڈالے جب لوگ کسی کو تبدیلی مذہب پر ماریں تو انہیں سخت ظالم قرار دے اور جب اپنا مذہب چھوڑ کر کوئی دوسری طرف جائے تو اس کے قتل کا فتویٰ جاری کرے۔ اس قسم کی پالیسی تو کسی دنیا کے سیاست دان کی طرف منسوب کرنا بھی اس کی سخت ہتک سمجھی جاتی ہے کجا یہ کہ اسے سب نبیوں کے سردار حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیا جائے۔ اس کے علاوہ اگر آپؐ کے عمومی خلق کی طرف بھی جس کی بعض جھلکیاں پہلے گذر چکی ہیں نگاہ کی جائے تو اس عقیدہ کو آپؐ کی طرف منسوب کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ جس طرح سورج سے متعلق خواہ ہزار دلائل دیئے جائیں کوئی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ روشنی کی بجائے تاریکی برساتا ہے اسی طرح اس انسان کامل کی طرف یہ غیر فطری فعل منسوب کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ یہ سرے سے ناانصافی ہے ہی نہیں تو اس کا جواب میرے پاس سوائے ایک سخت حیران خاموشی کے اور کچھ نہیں۔

دوسرا امر قابل غور یہ ہے کہ قرآن کریم جو مذاہب کی تاریخ پیش کرتا ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ انبیائے گزشتہ میں سے ایک نے بھی کبھی ارتداد کی سزا موت یا جلاوطنی تجویز نہیں کی۔ اس کے برعکس بلا استثناء ان کے تمام مخالفین نے ارتداد کی سزا موت یا جلاوطنی تجویز کی

اور اسی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں ان کے اس طریق کو سخت ناپسندیدہ اور قابل سرزنش قرار دیتا ہے اور اس کی سزا یقینی ہلاکت اور عتاب الٰہی تجویز فرماتا ہے۔ پھر میں یہ کس طرح تسلیم کرلوں کہ میرے مقدس آقاؐ نے ان تمام معصوم انبیاء کی سنت کو ترک کر کے نعوذ باللہ ان کے مخالفین کی ناپسندیدہ اور ناجائز سنت کو اپنا لیا اور اسی کو صحیح قرار دیا۔ یہ میرے نزدیک سورج کی طرف تاریکی منسوب کرنے سے بھی زیادہ ناممکن ہے۔ مگر اس پہلو پر چونکہ کتاب کے پہلے باب ہی میں نہایت تفصیل سے روشنی ڈال دی گئی ہے اس لئے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

تیسرا فیصلہ کن امر یہ ہے کہ قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کی جو تاریخ پیش کرتا ہے وہ واضح طور پر اس خیال کو باطل اور بے بنیاد قرار دے رہی ہے اور آنحضرتؐ کے زمانہ کی قرآن کریم کی پیش کردہ تاریخ سے متعلق مسلمان علماء تو کیا تمام یورپین مستشرقین بھی خواہ کیسے ہی متعصب کیوں نہ ہوں یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ بغیر کسی شک کے قابل قبول ہے۔ قرآن کریم کے پیش کردہ جن تاریخی حقائق کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ان کا تفصیلی ذکر انشاءاللہ اس باب کے آخر پر کیا جائے گا۔ بہر حال یہ تینوں دلائل اکیلے اکیلے بھی ایسے وزنی اور ٹھوس اور واضح ہیں کہ ان کے مقابل پر ہر دوسری دلیل ٹھکرائی جانے کے لائق ہے۔ اور امور کو چھوڑ کر صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت انصاف پر ہی نظر کی جائے تو قتل مرتد کے نظریہ کی عمارت ریت کے قلعہ کی طرح خود بخود مسمار ہو جاتی ہے۔ مودودی صاحب اگر اس کے مقابل پر یہ دلیل پیش فرمائیں کہ بہت سے جید علمائے اسلام اس نظریہ کے قائل تھے تو مولانا کے اس استدلال کو میں ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسے کوئی شاخ کو اوّل اور جڑ کو آخر کر دے۔ یہ علماء خواہ کتنے ہی بڑے مقام پر کیوں نہ ہوں پھر بھی امور شریعہ میں غلطی سے پاک نہیں تھے مگر ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غلطی سے پاک تھے اس لئے اگر چودہ سو سال میں مختلف اوقات میں پیدا ہونے والے تمام علماء بھی بیک آواز کوئی ایسی بات کہیں جسے تسلیم کر لینے سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت، امانت، دیانت اور عدالت پر کوئی حرف آتا ہو تو میں اسے تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ علماء

اپنے اعلیٰ اور بلند مرتبوں کے باوجود ٹھوکر کھا سکتے ہیں اور کھاتے رہے ہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات حسنہ غیر مشکوک ہیں۔ان علماء کے شدید باہمی اختلافات ہی اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ یہ خطاء سے پاک نہ تھے۔اگر دس رائیں ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو بہر حال ایک ہی درست ہوگی اور باقی نو غلط ہوں گی بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بھی درست نہ ہو۔بہر حال قطع نظر اس سوال کے کہ علماء کہیں انفرادی یا اجتماعی ٹھوکر کھا سکتے ہیں یا نہیں ایک امر جو ہر شک سے بالا ہے اور یقیناً درست ہے وہ یہی ہے کہ شاخیں جڑ پر قربان کی جاسکتی ہیں جڑ شاخوں پر نہیں۔کوئی حدیث جس کے راوی خواہ کتنے ہی سچے ہوں اگر قرآن کریم کی کسی آیت کے یقینی طور پر خلاف ہو تو قرآن کریم کے مقابل پر اسے کسی حالت میں بھی ترجیح نہیں دی جاسکتی۔اسی طرح ہر وہ اجماع یا کثرت رائے جو قرآن کریم کے کسی بیان کے یقینی طور پر خلاف ہو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق حسنہ پر برے رنگ میں روشنی ڈالے، بغیر کسی تردد کے معاً ٹھکرا دینے کے قابل ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب ہم مضمون کے اس حصہ کی طرف واپس آتے ہیں جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا۔سوال زیر بحث یہ تھا کہ مودودی صاحب کے نزدیک مسلمان کہلانے والوں کے اس انبوہ کثیر میں سے کون کون سے فرقے مرتد شمار ہوں گے تا کہ اس امر کا کچھ اندازہ کیا جاسکے کہ اگر کبھی انہیں اقتدار نصیب ہو تو خلق خدا میں سے کتنوں کی گردنیں ان کے ہاتھ میں آجائیں گی۔

مولانا کے نزدیک احمدی تو خیر ''مرتد'' ہیں ہی اور بہر حال ایک ''غیر مسلم اقلیت'' ہیں لیکن یہ ارتداد اور کفر محض انہی تک محدود نہیں، ان کے علاوہ اہل قرآن یعنی پرویز صاحب کے مکتب خیال لوگ بھی غیر مشکوک طور پر کافر، دائرہ اسلام سے خارج یا بالفاظ دیگر مرتد متصور ہوں گے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ان کا کفر قادیانیوں سے بھی زیادہ سنگین شمار ہوگا (اس لحاظ سے ممکن ہے انہیں نسبتاً زیادہ تکلیفیں دے کر مارا جائے) چنانچہ جماعت اسلامی کے ترجمان ''تسنیم'' میں شائع ہونے والا مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کا ایک فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔یہ فتویٰ ان دنوں کا ہے جب ابھی مولانا امین احسن اصلاحی مودودی صاحب سے برگشتہ نہیں ہوئے تھے اور ان کا دایاں بازو شمار ہوتے تھے۔مولانا اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:۔

''بعض لوگ اسلامی شریعت کے اختلافات کا حوالہ دے کر مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اس ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا تو کوئی امکان نہیں ہے البتہ قرآن کریم کے اصولوں پر اس ملک میں حکومت قائم کرو۔ اگر یہ مشورہ دینے والوں کا مطلب یہ ہے کہ شریعت صرف اتنی ہی ہے جتنی قرآن میں ہے باقی اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ شریعت نہیں ہے تو **یہ صریح کفر ہے** اور بالکل اسی طرح کا کفر ہے جس طرح کا کفر قادیانیوں کا ہے بلکہ کچھ اس سے بھی سخت اور شدید ہے[1]۔''

چلئے احمدیوں اور اہل قرآن کا جھگڑا تو نپٹا لیا گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کفر اور ارتداد بس انہی دو فرقوں پر ختم ہو جاتا ہے؟ تو اس سوال کی تحقیق میں ہم جوں جوں مودودی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں یہ حقیقت کھلتی چلی جاتی ہے کہ مودودیت کے سوا مودودی نگاہ میں ہر دوسری چیز کفر ہی کفر ہے۔ آیئے! ''مسلمانوں'' کے ''مسلمان فرقوں'' کا حال دیکھتے ہیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک ان کا اسلام کتنے پانی میں ہے۔ اس انبوہ کثیر پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

''یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطہ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مقابل تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے تسلیم کیا ہے اور نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابل داد ہے[2]۔''

پھر فرماتے ہیں:۔

''جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔

۱۔ ماخوذ از مزاج شناس رسولؐ صفحہ ۳۷۲ بحوالہ تسنیم ۱۵؍اگست ۱۹۵۲ء

۲۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۳۰

اگر دودھ زہریلا ہوتو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا... پس جولوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہوجائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی [۱]۔''

اگر ابھی تک غیر مودودی ''مسلمانوں'' سے متعلق مولانا کے فتویٰ کی وضاحت نہ ہوئی ہوتو مزید وضاحت کی غرض سے ایک اور اقتباس پیش ہے:۔

''یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافروں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافرقوم میں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے [۲]۔''

کیا ان فتووں کے بعد بھی کسی مزید کفر کے فتویٰ کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ اگر رہتی ہے تو شائد اس خیال سے کہ یہ فتویٰ عامۃ الناس یعنی ۹۹۹ فی ہزار سے متعلق ہوگا۔ مسلمان علماء اور دیگر زعماء پر چسپاں نہیں ہوسکتا مگر یہ خیال درست نہیں کیونکہ مودودی صاحب کی نظر میں ہر غیر مودودی ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جانے کے لائق ہے:۔

''خواہ مغربی تعلیم وتربیت پائے ہوئے **سیاسی لیڈر ہوں یا علماء دین ومفتیان شرع مبین** دونوں قسم کے راہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے **یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں... ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمانوں کی نظر نہیں** [۳]۔''

---

[۱] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۳۲

[۲] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۶۶

[۳] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۹۵

قارئین کرام خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ اگر راہ حق سے ہٹ جانے کا نام ارتداد نہیں تو اور کیا ہے؟

مودودی صاحب کے مندرجہ بالا دونوں فتوے پڑھ کر مجھے وہ کہانی یاد آجاتی ہے کہ کسی بادشاہ کو ایک گھوڑا بہت عزیز تھا۔ وہ بہت بیمار ہو گیا۔ بادشاہ کو کہاں برداشت تھی کہ اس کی موت کی خبر سنے۔ حکم دے دیا کہ جو بھی یہ منحوس خبر سنائے گا مارا جائے گا مگر ساتھ ہی اس کا بھی پابند کر دیا کہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد صحت کی اطلاع بھجواتے رہو لیکن مشیت ایزدی کے سامنے بھلا بادشاہ بے چارے کی کیا چلتی تھی؟ ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس گھوڑے نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ تب افسران دربارِ شاہی بہت فکرمند اور پریشان ہوئے کہ کون بادشاہ کے سامنے حاضر ہو کر اس گھوڑے کی موت کی خبر سنائے اور خود اپنی موت کا پروانہ لے کر آئے۔

آخر انہوں نے ایک غریب اور بے کس آدمی کو پکڑ کر مجبور کیا کہ وہ بادشاہ کو جا کر یہ منحوس خبر سنائے۔ اب اگر وہ ان کی بات کا انکار کرتا تو ان افسران شاہی کے ہاتھوں مارا جاتا اگر مان جاتا تو بادشاہ کے عتاب کا نشانہ بنتا۔ غرضیکہ غریب سخت شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ گویا اب اس کے لئے ایک کہاوت کے مطابق دو ہی راستے تھے یا تو ساحل پر کھڑا رہے اور تعاقب کرنے والے شیطان کے ہاتھوں مارا جائے یا پھر گہرے نیلے سمندر میں کود کر اس کی لہروں کی آغوش میں جا سوئے۔ وہ غریب اور بے زور تو تھا لیکن تھا بہت ذہین۔ آخر اس نے اس پھندے سے رہائی کی ایک راہ سوچ لی اور گھوڑے کی موت کی خبر بادشاہ تک پہنچانے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن اس نے یہ خبر کچھ اس طرح سے سنائی کہ اے جلالۃ الملک! بادشاہ سلامت! مبارک صد مبارک ہو اب تو آپ کا گھوڑا بہت آرام میں ہے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر پوچھا کہ اس اچھی خبر کی کچھ تفصیل تو بتاؤ۔ اس نے دست بستہ عرض کی کہ حضور! پہلے تو وہ درد کی شدت سے مسلسل تڑپ رہا تھا اب بڑے سکون سے لیٹا ہوا ہے۔ پہلے تو اس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا اب تو وہ پلک تک نہیں جھپکتا۔ پہلے تو دور دور تک اس کے دل کے دھڑکنے کی آواز سنائی دیتی تھی اب تو چھاتی پر کان لگا کر بھی سنو تو آواز نہیں آتی۔ پہلے تو اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اب تو ایسا سکون ہے کہ سانسوں کا جھنجھٹ ہی ختم ہوا۔

بادشاہ نے جب یہ سنا تو تلملا کر بولا کہ او کم بخت! یہ کیوں نہیں کہتا کہ وہ مر گیا تب اس نے عرض کی

کہ حضور! یہ میں نہیں کہتا یہ تو آپ کہہ رہے ہیں بھلا میری کیا مجال کہ ایسا منحوس لفظ اپنی زبان پر لاؤں۔

پس اگر کوئی قوم گم کردہ راہ ہو۔ راہ حق سے ہٹ چکی ہو۔ تاریکیوں میں بھٹک رہی ہو۔ اس کی نظر مسلمان کی نظر نہ رہی ہو۔ جتنے ٹائپ کافروں میں پائے جاتے ہوں اس میں پائے جاتے ہوں تو اس قوم کو کافر نہیں تو اور کیا کہا جائے گا؟ مگر شائد مودودی صاحب کہہ دیں کہ دیکھو تم ہی کہہ رہے ہو میں تو نہیں کہتا۔

اس لئے اب بھی اگر کسی کو یقین نہ آئے کہ ایسا ہونا ممکن ہے تو جماعت اسلامی سے الگ ہو جانے والوں سے متعلق ارتداد کا فتویٰ اس کی تسلی کے لئے کافی ہوگا:۔

''یہ وہ راستہ نہیں ہے جس میں آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹ جانا دونوں ایک ہوں نہیں۔ یہاں پیچھے ہٹ جانے کے معنے ارتداد کے ہیں[۱]۔''

پس اگر جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو کر کسی دوسری جماعت میں شامل ہو جانے کا نام ''ارتداد'' ہے تو دوسری جماعت کا نام ''کفر'' نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے؟

لیکن اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو مودودی صاحب ہی درست فرمائیں کہ وہ ان مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالم الغیب مانتے ہیں اور آپؐ کے مادی جسم کا انکار کرتے ہیں۔ اور ان مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں جن کے نزدیک اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر اپنی مرادیں مانگنی جائز ہیں۔ اور وہ ان مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ باقی سب خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو غاصب کہتے ہیں اور ان پر اور دیگر صحابہؓ پر بشمولیت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تبرا بھیجتے ہیں اور لعنتیں ڈالتے ہیں۔

ویسا جواب نہ دیں جیسے گھوڑے کے مرنے کی خبر دی گئی ہے بلکہ بادشاہ کے الفاظ میں بتائیے کہ ان کو کیا کہتے ہیں۔

<u>پیدائشی مسلمان</u> یہاں پہنچ کر ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مرتد کی سزا قتل ہے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ مودودی صاحب کے نزدیک ان کی جماعت کے سوا باقی سب

---

[۱] روئداد جماعت اسلامی حصہ اوّل صفحہ ۸

مسلمان کہلانے والے کافر ہیں تو بوجہ اس کے کہ انہوں نے یہ کفر اپنے ماں باپ سے ورثہ میں لیا ہے خود مولانا کے نزدیک بھی انہیں مرتد قرار نہیں دیا جا سکے گا بلکہ پیدائشی کافر شمار ہوں گے۔ اس لحاظ سے مولانا پر یہ بڑی زیادتی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی طرف یہ عقیدہ منسوب کیا جائے کہ وہ تمام پیدائشی ''مسلمانوں'' کو جن کے ماں باپ بھی ان کے نزدیک کافر ہیں بیک وقت کافر ہی سمجھتے ہیں اور مرتد بھی۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟ مجھے خود یہ تسلیم ہے کہ معقولیات کی دنیا میں ایسا ہونا ناممکن نظر آتا ہے لیکن اگر معقولیات کی دنیا ہی نہ ہو اگر تشدد کی پادشاہی ہو اور عام عقل انسانی کو مجال نہ ہو کہ وہاں پَر مار سکے تو کیا تب بھی ایسا ہونا ممکن نہیں ہے؟ یہاں تو تشدد کی پادشاہی ہے اور معاملات ملک اس دستور کے مطابق طے پاتے ہیں کہ

خِرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خِرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

پس اس دستور کے مطابق ہر وہ ''کافر'' جو'' مسلمان'' کہلاتا ہے اور اپنی قسم کے ہی مسلمان کافروں کے گھر میں پیدا ہوا ''مرتد'' کہلائے گا اور واجب القتل ہوگا کیونکہ اگر ان کے جان و مال پر دسترس حاصل کرنی ہے تو سوائے اس کے چارہ نہیں رہتا کہ اوّلاً انہیں پیدائشی مسلمان قرار دیا جائے پھر یہ اصرار کیا جائے کہ وہ بالغ ہونے کے بعد خود ہی کافر ہوئے ہیں کیونکہ ان کے والدین نے ان کی ایک کافرانہ ماحول میں تربیت کی تھی اس لئے یہ سارے پیدائشی مسلمان'' کافر'' مرتد ہیں اور واجب القتل ہیں۔

دیکھئے! کیسا عجیب دستور پادشاہی ہے کہ جہاں تک مودودیت اور غیر مودودیت کا تعلق ہے غیر مودودیت کفر ہے مگر جہاں تک اس اختیار کا تعلق ہے کہ ایک پیدائشی کافر مودودیت کے سوا کوئی اور مذہب اختیار کر لے وہ پیدائشی'' کافر'' پیدائشی ''مسلمان'' کے حکم میں آجاتا ہے۔

یہ کرشمہ سازی صرف یہیں پر آ کر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایک طرف ایک ایسے ''مرتد'' کے قتل کا جواز جو پہلے اپنی مرضی سے کفر چھوڑ کر مسلمان ہوا تھا یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جب اسے علم تھا کہ یہ ایک یکطرفہ راستہ ہے اور اس سے واپسی ممکن نہیں تو پہلے مسلمان ہی کیوں ہوا تھا۔ تو دوسری طرف ایک

''پیدائشی مسلمان'' سے تبدیلی مذہب کا حق یہ کہہ کر چھین لیا جاتا ہے کہ اگرچہ یہ درست ہے کہ اس مجبور انسان کا اپنی پیدائش کے حالات پر کچھ اختیار نہیں تھا اور تقدیر الٰہی سے بندھا بندھا یا ایک مسلمان گھر میں پیدا ہو گیا تھا۔ مگر پھر بھی اسے تبدیلی مذہب کی اجازت نہیں دی جاسکتی کیونکہ اس طرح تو بڑی مشکل پڑ جائے گی۔ چنانچہ انہی لاینحل مسائل کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:۔

''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کے لئے مجبور نہیں کرتے اور واقعی ہماری روش یہی ہے! مگر جسے آ کر واپس جانا ہو اسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمدورفت کے لئے کھلا ہوا نہیں ہے لہٰذا اگر آتے ہو تو یہ فیصلہ کر کے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے ورنہ براہ کرم آؤ ہی نہیں۔''

مجھے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کی یہ تفسیر پڑھ کر اہل قرآن کے لیڈر پرویز صاحب کا وہ فقرہ یاد آ جاتا ہے جس میں انہوں نے دوسرے الفاظ میں مودودی صاحب کے اس نظریہ کو یوں بیان کیا ہے:۔

مودودی صاحب کا اسلام بھی گویا ایک چوہے دان ہے'' آ تو سکتا ہے چوہا مگر جا نہیں سکتا''۔(غالباً پرویز صاحب کی یہی ستم ظریفیاں ہیں جو انہیں مودودی نظر میں اس قدر مقہور و مغضوب بنا رہی ہیں)

مگر قطع نظر اس امر کے اس تفسیر میں مولانا نے اس آیت کریمہ کا عملاً مذاق اڑایا ہے اگر کوئی نادان یا مجبور اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے یہ سوال کر بیٹھے کہ درست ہے جو آپ نے فرمایا مگر حضرت ــــ میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں ــــ میں تو پیدا ہی مسلمانوں میں ہوا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ یہ one way traffic یعنی یکطرفہ راستہ ہے اور مجھ غریب کو کیا خبر تھی کہ مودودی دور حکومت میں پیدا ہوں گا۔ تو اس سوال کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں دہراتے ہوئے مولانا ایک عجیب و غریب جواب دیتے ہیں۔ مولانا کی ساری عبارت درج ذیل ہے:۔

''پیدائشی مسلمان اس سلسلہ میں ایک آخری سوال اور باقی رہ جاتا ہے جو ''قتل مرتد'' کے حکم پر بہت سے دماغوں میں تشویش پیدا کرتا ہے وہ یہ کہ جو شخص پہلے غیر مسلم تھا پھر اس نے باختیار خود اسلام قبول کیا اور اس کے بعد دوبارہ کفر اختیار کر لیا اس سے متعلق تو

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جان بوجھ کر غلطی کی۔ کیوں نہ ذمی بن کر رہا اور کیوں ایسے اجتماعی دین میں داخل ہوا جس سے نکلنے کا دروازہ اسے معلوم تھا کہ بند ہے۔ لیکن اس شخص کا معاملہ ذرا مختلف ہے جس نے اسلام خود نہ قبول کیا ہو بلکہ مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے اسلام آپ سے آپ اس کا دین بن گیا ہو۔ ایسا شخص اگر ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام سے مطمئن نہ ہو اور اس سے نکل جانا چاہے تو یہ بڑا غضب ہے کہ آپ اسے بھی سزائے موت کی دھمکی دے کر اسلام کے اندر رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک زیادتی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ پیدائشی مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسلام کے اجتماعی نظام کے اندر پرورش پاتی رہے۔ اس شبہ کا ایک جواب اصولی ہے اور ایک عملی ہے۔ اصولی جواب یہ ہے کہ پیدائشی اور اختیاری پیروؤں کے درمیان احکام میں نہ فرق کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی دین نے کبھی ان کے درمیان فرق کیا ہے ہر دین اپنے پیروؤں کی اولاد کو فطرتاً اپنا پیرو قرار دیتا ہے اور ان پر وہ سب احکام جاری کرتا ہے جو اختیاری پیروؤں پر جاری کئے جاسکتے ہیں۔ یہ بات عملاً بالکل ناممکن ہے اور عقلاً بالکل لغو ہے کہ پیروان دین یا سیاسی اصطلاح میں رعایا اور شہریوں کی اولاد کو ابتداءً کفار یا اغیار (pliens) کی حیثیت سے پرورش کیا جائے اور وہ بالغ ہو جائیں تو اس بات کا فیصلہ ان کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے کہ آیا وہ اس دین کی پیروی یا اس سٹیٹ کی وفاداری قبول کرتے ہیں یا نہیں جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح تو کوئی اجتماعی نظام کبھی دنیا میں چل نہیں سکتا[1]۔''

میں اس سوال کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتا ہوں کہ مولانا کے اس مخصوص طرز استدلال سے عقل انسانی مطمئن ہوسکتی ہے یا نہیں۔ میں ذاتی طور پر اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ جب بھی وہ کسی باریک مسئلہ کی فضاء میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی نظر قابل رحم حد تک دھندلا جاتی ہے اور مختلف شکلوں اور تصاویر میں فرق نہیں کرسکتی۔ ان کے اسلامی نظریہ ریاست پر جو دھند طاری ہے اور جس کی بناء پر

[1] مرتد کی سزا اسلامی قانون میں صفحہ ۷۶، ۷۷

انہوں نے فاش نوعیت کی بنیادی غلطیاں کی ہیں اس وقت ان کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ورنہ ایک کتاب اندر کتاب بن جائے۔البتہ اس استدلال سے متعلق جوابھی قارئین کی نظر سے گزرا ہے میں مولانا کی توجہ ایک چھوٹی سی فروگذاشت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کی درستی ان کے نظریہ استبداد میں مزید وسعتیں پیدا کرنے کا موجب ہوگی۔

اس دلیل کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ ''ہر دین اپنے پیروؤں کی اولاد کو فطرتاً اپنا پیرو قرار دیتا ہے۔''اس لئے مسلمان کہلانے والوں کی اولاد (خواہ اس اولاد کے ماں باپ مودودی صاحب کی نظر میں عملاً کافر ہی ہوں) بہرحال اسلام کی جائداد کہلائے گی۔پس جب اسلام کی ملکیت ان پر ثابت ہوگئی تو سن بلوغت کے بعد انہیں کس طرح اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ جو چاہیں بن جائیں۔یہ نظریہ قائم فرماتے وقت غالباً مولانا کی نظر سے وہ ارشاد نبویؐ اوجھل رہ گیا تھا کہ:۔

مَا مِنْ مُوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ (البخاری)

ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے یہ اس کے ماں باپ کا دخل ہوتا ہے جو اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

اگر مولانا کا مذکورہ بالا استدلال درست ہے تو پھر اس کے نتیجہ کو مسلمان کہلانے والوں کی اولاد تک ہی کیوں محدود رکھا جائے۔ساری دنیا کے بچے اسلام کی وراثت ہیں ان کو کیوں اس سعادت سے محروم رہنے دیں اور کیوں ان کے ماں باپ کو یہ اختیار دے دیں کہ سنِ بلوغ تک پہنچنے سے پہلے پہلے انہیں ''ابتداءً کفار یا اغیار کی حیثیت سے پرورش'' کریں۔تعجب ہے کہ یہ حدیث ان کی نظر سے کس طرح رہ گئی؟ یہ دلیل تو نعوذ باللہ تشدد پسندوں کی بنیادی دلیل ہونی چاہیے تھی کیونکہ اس کی پہنچ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ کفار تک بھی ممتد ہے اور دنیا کے کونے کونے میں ہر مذہب وملت، ہر کالے گورے پر اس کا وار یکساں پڑتا ہے۔اگر نعوذ باللہ اس کے وہی معنی لئے جائیں جو مودودی طرز استدلال سے نکلتے ہیں تو پھر ایک بھی کافر بچہ ہاتھ سے نکل کر نہیں جاسکتا۔

بہرحال میرا کام صرف توجہ دلانا تھا آگے مولانا کو اختیار ہے میں تو نہ انہیں زبردستی کسی بات

کا قائل کر سکتا ہوں نہ اس بات کا خود قائل ہوں کہ اعتقادات اور خیالات کے بارہ میں کوئی زبردستی کی جاسکتی ہے۔

میرے نزدیک تو یہ ناممکن ہے کہ کوئی سچا مذہب صداقت کی تعلیم دیتے ہوئے کسی کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرے۔کیا کبھی سچ کے بیج سے جھوٹ کی کونپلیں پھوٹ سکتی ہیں یا جھوٹ کی گٹھلی سے صداقت کا درخت اگا ہے؟ کیا کبھی گندم کے دانوں سے کچلے کے پودے نکلتے دیکھے ہیں؟ اگر ایسا ہونا ممکن نہیں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ اسلام جو کہ ایک مجسم صداقت ہے خود بنی نوع انسان کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرنے لگے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسا شخص جس کا دل اسلام کی صداقت کا قائل نہ رہا ہو اور خدا کی لاشریک وحدانیت کو تسلیم نہ کرتا ہو اور اپنی حماقت سے اس عقیدہ پر تسلی پا گیا ہو کہ مسیحؑ خدا کا بیٹا تھا اور اس کی خدائی میں شریک تھا تو ایسے شخص کے سامنے اسلام تلوار لے کر کھڑا ہو جائے کہ پہلے کہا کیوں تھا کہ خدا ایک ہے۔اب تو خواہ تم مانو نہ مانو تمہیں یہی کہنا پڑے گا کہ وہ ایک ہے۔ایک ہے۔ اگر وہ یہ سوال کر بیٹھے کہ حضور جب میرا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ وہ ایک نہیں تو میں کس طرح یہ گواہی دے دوں کہ وہ ایک ہے۔تو یہ جواب سن کر یہ کہتی ہوئی اسلام کی تلوار اس کی گردن پر گرے گی اور اس کا سر قلم کر دے گی کہ راستی پسند کہیں کا، جھوٹ نہیں بولتا۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ خدا ایک ہے، اور اس میں بھی قطعاً کوئی شک نہیں کہ محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسولؐ ہیں۔مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین نے یہی سچی گواہی دی تو محض اس لئے کہ ان کے دل یہ گواہی نہیں دیتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

قرآن کریم میں سورۃ منافقون کی پہلی آیت میں اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ
وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (المنافقون:۲)

جب تیرے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو خدا کا رسول ہے مگر باوجود اس کے کہ اللہ (تعالیٰ) جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے اللہ یہ گواہی دیتا ہے

کہ یہ منافق یقیناً جھوٹ بولتے ہیں۔

پس خدا تعالیٰ تو چاہتا ہے کہ منافق یہ جھوٹ بولنا چھوڑ دیں مگر مولانا مودودی اس عقیدے کے قائل ہیں کہ صداقت کے نام پر بزور شمشیر لوگوں کو جھوٹ بولنے کی تلقین کی جائے۔ میں چونکہ اس نظریہ کا قائل نہیں اس لئے مولانا کو مجبور نہیں کرسکتا کہ میری بات مان لیں میرا مذہب تو سیدھا سادھا یہی ہے کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔

ضمناً میں یہاں اس شبہ کا بھی ذکر کردوں کہ ہوسکتا ہے کہ مولانا یہ فرمائیں کہ اس آیت میں جن منافقین کا ذکر ہے وہ تو سرے سے ایمان ہی نہیں لائے تھے اور مولانا جن لوگوں کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں وہ قسم صرف ان منافقین کی ہے جو ایک دفعہ یہ جان بوجھ کر کہ یہ راستہ آمدورفت کے لئے کھلا ہوا نہیں پھر بھی اسلام لے آئے تو میں مولانا سے درخواست کروں گا کہ مندرجہ بالا آیت قرآنی سے ملی ہوئی اگلی دو آیات پر بھی نظر ڈال لیں تو سارا مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (المنافقون:۳،۴)

انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور (اس ذریعہ سے لوگوں کو) راہ خدا سے روک رہے ہیں۔ یقیناً بہت ہی برا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ (پہلے تو) وہ ایمان لائے پھر کافر ہوئے۔اس کے نتیجہ میں ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی پس وہ سمجھتے نہیں۔

ان ہر دو آیات کے مضمون سے یہ یقینی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ:۔

اوّل:۔ یہ منافقین جن کا ذکر کیا گیا ہے مرتد تھے۔ پہلے ایمان لائے اور پھر کافر ہوگئے۔

دوم:۔ ان کا یہ فعل کہ باوجود اس امر کے کہ یہ اسلام سے پھر گئے تھے پھر بھی گواہی دیتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں، خدا تعالیٰ نے سخت ناپسند فرمایا۔ان کو ''جھوٹا'' کہا اور فرمایا کہ ''بہت ہی برا ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

سوم:۔ خدا تعالیٰ نے ان کی اس منافقانہ گواہی کو اسلام کے لئے مفید نہیں بلکہ سخت نقصان دہ قرار دیا اور فرمایا کہ اس طریق سے یہ لوگوں کو راہ خدا سے روک رہے ہیں۔

لیکن مودودی صاحب کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس ہے۔خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے جھوٹے ہیں بہت برا کرتے ہیں۔مودودی صاحب کا اصرار ہے کہ ایسا ہی کرو۔دل سے بے شک نہ مانو مگر منہ سے یہی گواہی دیتے رہو کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا تعالیٰ کے رسول ہیں ورنہ گردن مار دیئے جاؤ گے۔چنانچہ راستی پسندی کا طعنہ دیتے ہوئے ایسے مرتد سے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

> ''وہ اگر ایسا ہی راستی پسند ہے کہ منافق بن کر رہنا نہیں چاہتا بلکہ جس چیز پر اب ایمان لایا ہے اس کی پیروی میں صادق ہونا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو سزائے موت کے لئے کیوں پیش نہیں کرتا؟''

یہ راستی پسندی کا طعنہ دے کر منافقت کی تلقین کرنا بھی مولانا کا شاہکار ہے۔پس خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ جھوٹو منافق نہ بنو اور مولانا کا ارشاد ہے راست باز آئے کہیں کے، منافق بن کر جان کیوں نہیں بچاتے؟ اور خدا تو فرماتا ہے کہ اس قسم کی منافقت لوگوں کو راہ خدا سے روکتی ہے (اور اسلام کے لئے تو سخت نقصان دہ ہے) مگر مولانا کا اصرار ہے کہ اگر ایسے مرتدین کو سچ بولنے کی اجازت دے دی جائے تو اسلام قائم ہی نہیں رہ سکتا ''اس طرح تو کوئی اجتماعی نظام کبھی دنیا میں چل نہیں سکتا۔''

کیا اس اختلاف کے بارہ میں کسی رائے زنی کی ضرورت رہتی ہے؟

میں نے اس باب کے شروع میں یہ بحث اٹھائی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز ''قتل مرتد'' کے غیر فطری اور غیر منصفانہ نظریہ کے قائل نہ تھے اور اس امر کا اظہار کیا تھا قرآن کریم اس بارہ میں آپؐ کے اسوہ پر غیر مشکوک روشنی ڈالتا ہے۔پس آیئے اب ہم اس مسئلہ پر قرآن کریم سے فیصلہ طلب کریں کیونکہ قرآنی فیصلہ سے بہتر اور یقینی اور کوئی فیصلہ نہیں۔سورۃ المنافقون (جس کی چند آیات اوپر نقل کی گئی ہیں) ہی دراصل وہ سورۃ ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔یہ سورۃ قتل مرتد کے مسئلہ کو بحیثیت مسئلہ ہی واضح نہیں کرتی بلکہ اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو بھی پیش کرتی ہے اور مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ہر شک رفع کرتی ہے۔اس سورۃ میں یقینی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے مرتدین کی خبر دی گئی تھی جو منافق بن کر

---

[1] ''مرتد کی سزا'' صفحہ ۵۳

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا ہونے کی گواہی دیتے تھے مگر خدا نے ان کے سارے پول کھول دیئے مگر باوجود اس کے ان کے قتل کے بارہ میں نہ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نازل ہوا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو اس جرم میں قتل کروایا۔ ممکن ہے مولانا یہ شبہ پیدا کریں کہ اللہ تعالیٰ یہ فرما کر کہ ''منافقین جھوٹے ہیں'' دوسری آیت کو اس طرح شروع فرماتا ہے اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَہُمْ جُنَّۃً۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔ یہ ڈھال دراصل ارتداد کی سزا یعنی قتل سے بچنے کے لئے تھی اور وہ مسلمانوں کو دھوکہ اس لئے دے رہے تھے کہ کہیں ہمارے ارتداد کا علم ہو گیا تو ہمیں قتل ہی نہ کر دیں۔ بظاہر تو یہ ایک راہ فرار نکل آئی ہے مگر مولانا ذرا کچھ آگے چل کر تو دیکھیں اس سورۃ نے ایسی ناکہ بندی کر رکھی ہے کہ واہمہ تک کو گزرنے کی مجال نہیں۔ چنانچہ انہی مرتدین کا ذکر جاری رکھتے ہوئے کچھ آگے چل کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَکُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ لَوَّوْا رُءُوْسَھُمْ وَ رَاَیْتَھُمْ یَصُدُّوْنَ وَ ھُمْ مُّسْتَکْبِرُوْنَ (المنافقون:٦)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول خدا تمہارے لئے (خدا سے) بخشش مانگیں گے تو سر مٹکانے لگتے ہیں اور تکبر کرتے ہوئے منہ پھیر لیتے ہیں۔

اس آیت کے ہوتے ہوئے اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَہُمْ جُنَّۃً سے یہ مراد لینی کہ وہ قسمیں اس خوف سے کھاتے تھے کہ قتل نہ کر دیئے جائیں ایسی صریح زیادتی ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا زیادتی ہوگی۔ اس آیت سے جو واضح غیر مبہم نتائج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:۔

(۱) ان مرتدین کے لئے کسی قسم کے خوف کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا بلکہ جب انہیں کہا جاتا تھا کہ آؤ توبہ کر لو تو سر مٹکاتے تھے، منہ پھیر لیتے تھے اور سخت تکبر سے پیش آتے تھے۔ کیا موت سے ڈرا ہوا انسان یہ مظاہرہ کیا کرتا ہے؟ اگر انہوں نے کسی خوف کی وجہ سے یہ جھوٹ بولا ہوتا تو پھر تو یہاں یہ ہونا چاہیے تھا کہ یہ سن کر ڈر کے مارے ان کے حواس خطا ہونے لگتے ہیں اور پھر وہ بڑے زور سے قسمیں کھاتے ہیں کہ استغفر اللہ! واللہ! باللہ! تاللہ! ہم تو مومن ہیں اور اگر تم نہیں مانتے تو ہم اب توبہ کر لیتے ہیں۔

(۲) یہ لوگ کوئی غیر معروف لوگ نہیں تھے بلکہ مسلمان جانتے تھے کہ یہ مرتدین کون ہیں تبھی تو جا کر ان کو نصیحت کرتے تھے کہ توبہ کرلو اور اگر بفرض محال پہلے نامعلوم بھی تھے تو اب اس سورۃ کے نزول کے بعد بہر حال معلوم ہو چکے تھے۔

(۳) خدا تعالیٰ نے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ آؤ توبہ کرو ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے بلکہ یہ فرمایا کہ آؤ میرا رسول تمہارے لئے بخشش مانگے گا۔ اگر ارتداد کی سزا قتل تھی تو کیا یہ آیت اسی طرح ہونی چاہیے تھی؟

مگر اب تو ارتداد پر طرّہ یہ کہ ان مرتدین کی طرف سے سخت گستاخی بھی سرزد ہونے لگی۔ مسلمانوں کی کھلی کھلی تحقیر کرنے لگے۔ سر مٹکانے لگے۔ منہ پھیرنے لگے۔ تکبر کرنے لگے۔ یہاں پہنچ کر ایک متشدد ضرور یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ اب اگلی آیت میں ان کے قتل کا حکم آجائے گا بلکہ شائد عذاب دے کر مارے جانے کی تلقین ہو مگر افسوس کہ اس کے لئے ایک اور مایوسی کا منہ دیکھنا باقی ہے کیونکہ نہ تو اگلی آیت میں نہ اس سے اگلی آیت میں نہ اس سے اگلی آیت میں۔ حتیٰ کہ بقیہ ساری سورۃ ہی میں کہیں ان کے قتل کا حکم نہیں ملتا۔

قتل کا حکم تو ایک طرف رہا ابھی تو انہیں اور ڈھیل دی جارہی ہے اور آگے چل کر اللہ تعالیٰ ان سے متعلق فرماتا ہے کہ وہ مرتد صرف مسلمانوں کی ہی تحقیر نہیں کرتے بلکہ ظالم سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی سخت تحقیر کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (المنافقون:۹)

کہتے ہیں جوں ہی ہم مدینہ واپس پہنچے معزز ترین شخص (یعنی بد بخت منافقوں کا سردار عبداللہ بن اُبی بن سلول) (نعوذ باللہ) ذلیل ترین انسان کو مدینہ سے نکال دے گا حالانکہ عزت خدا ہی کی ہے اور اس کے رسول کی اور مومنوں کی مگر منافقین نہیں جانتے۔

اس آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک غزوہ کے موقع پر جس میں بعض مرتد منافقین بھی مسلمانوں کے ساتھ لشکر کشی میں شریک تھے۔ عبداللہ بن اُبی بن سلول نے

اپنی محفل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مندرجہ بالا ناپاک الفاظ استعمال کئے۔اس بدبخت کا مطلب یہ تھا کہ مدینہ واپس جا کر وہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو مدینہ سے نکال دے گا۔ یہ بات جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی اور آپؐ نے تحقیق فرمائی تو یہ لوگ جھوٹ بول گئے اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوعمر لڑکے کی گواہی پر اعتبار کر لیا ہے مگر خدا تعالیٰ نے اپنی وحی کے ذریعہ سورۃ المنافقون میں یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح فرما دیا اور اس گواہی کی تصدیق فرمائی۔

یہ ایک ایسا جرم تھا کہ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر محبت رکھنے والے کو شدید غیرت آجاتی ہے اور دل کھولنے لگتا ہے اور طبعاً انسان یہ سوچتا ہے کہ کم ازکم اس بدبخت کو تو ضرور کوئی سزا دی جائے گی کیونکہ اس کا جرم صرف جرم ارتداد ہی نہیں رہا بلکہ یہ ذلیل ترین مرتد دنیا کے معزز ترین رسول کے خلاف انتہائی گستاخی کا مرتکب ہوا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ یہ کلمات اس نے ایک فوج کشی کے دوران میں کہے جو قوموں کی زندگی میں ایک ہنگامی دور ہوا کرتا ہے اور ایسے وقت میں سپہ سالار کے خلاف ایسے الفاظ صریح غداری کے مترادف سمجھے جاتے ہیں جس کی سزا موت ہے۔خصوصاً ایک مخصوص پارٹی میں بیٹھ کر ایسی بات کرنا تو اور بھی زیادہ بھیانک جرم بن جاتا ہے اور ایک سازش کا پتہ دیتا ہے مگر کیا اس موقع پر ایک رنج اور غصہ سے بھرے ہوئے دل کو یہ پڑھ کر سخت حیرت نہیں ہوتی کہ کوئی ایسی سزا نہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمائی گئی اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تجویز فرمائی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی جناب مودودی صاحب یہ تاویل بھی نہیں کر سکتے کہ اس وقت کمزوری کا دور تھا اور اس شخص کی طاقت بہت زیادہ تھی کیونکہ یہ دور تو خود مولانا کے الفاظ میں وہ دور تھا:۔

''جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعی اسلام نے تلوار ہاتھ میں لی.....تو رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا۔طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے۔''

چنانچہ یہ اسی تلوار کے دور کی بات ہے جبکہ ''بدی و شرارت'' کا زنگ چھوٹ رہا تھا اور طبیعتوں سے فاسد مادے نکل رہے تھے۔

مگر قطع نظر مولانا کی اس رائے کے تاریخی شواہد بتا رہے ہیں کہ اس بات کے وہم تک کی گنجائش نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ اس کے خوف کی وجہ سے اسے معاف فرما دیا۔ اوّل تو ایسے خیال کو دل میں جگہ دینا ہی اس مقدس رسول کی سخت ہتک ہے دوسرے اس بد بخت کی طاقت کی قلعی تو اسی امر سے کھل جاتی ہے کہ اس کا اپنا بیٹا اپنے باپ کو چھوڑ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کی خاک کا غلام بنا ہوا تھا اور اس کی فدائیت کا یہ عالم تھا کہ جب اس نے اپنے باپ سے متعلق یہ شرم ناک بات سنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے اس کے دل میں ایک عجیب ہیجان پیدا کر دیا اور محبوب کی ہتک ہوتے دیکھ کر غیرت ایسی بھڑکی کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ اگر آپؐ نے میرے بد بخت باپ کے قتل ہی کا فیصلہ فرمایا ہے تو مجھے حکم دیجئے کہ میں خود اسے اپنے ہاتھ سے قتل کروں لیکن اس بیٹے کی پیشکش کو بھی اس رحم مجسم نے ٹھکرا دیا اور کیسی رحمت بے پایاں تھی کہ دنیا کے معزز ترین انسان نے ایک ننگِ انسانیت ذلیل ترین مرتد کو بھی معاف فرما دیا اور پھر اس کے بعد بھی ایک عجیب واقعہ ہوا جس کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جس معصوم کے خلاف وہ جرم کیا گیا تھا اس نے تو معاف فرما دیا مگر مجرم کا بیٹا اسے معاف نہ کر سکا اور جب مدینہ کی حدود میں وہ قافلہ داخل ہو رہا تھا اور قریب تھا کہ عبد اللہ بن اُبی بھی داخل ہو تو یہ بیٹا جس کا سینہ ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک کے خیال سے کھول رہا تھا آگے بڑھا اور اپنے باپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی تلوار نیام سے نکال لی اور کہا کہ خدا کی قسم! میں آج تیرا سر قلم کر دوں گا اور مدینہ کی گلیوں میں گھسنے نہ دوں گا جب تک تو یہاں اعلان نہ کرے کہ میں دنیا کا ذلیل ترین انسان ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معزز ترین انسان ہیں۔

اپنے بیٹے کے چہرہ پر ایک نظر ڈالتے ہی وہ سمجھ گیا کہ یہ جو کہتا ہے سچ کر دکھائے گا۔ پس اس کی نظریں جھک گئیں اور اپنے کئے پر معذرت کرنے لگا۔ اس پر بھی شائد اسے نجات نہ ملتی مگر جانتے ہو کہ اس کی نجات کو کون آیا؟ ــــ وہی سب محبوبوں کا محبوب رسول اور وہی سب درگذر کرنے والے انسانوں سے زیادہ درگذر کرنے والا۔ وہ جو ابراہیمؑ کی دعاؤں کا ثمرہ تھا اور جس کے ظہور کی موسیٰؑ نے بھی خبر دی تھی۔ ہاں وہی دلوں کو بے اختیار موہ لینے والا جس کی محبت کے داؤدؑ گیت گاتا رہا۔ وہی

رحمت مجسم اس مجرم باپ کو اس کے بیٹے کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے آگے آیا۔ آپؐ کی اونٹنی جب قریب پہنچی اور آپؐ نے یہ ماجرا دیکھا تو فوراً اونٹنی کو آگے بڑھا کر اس کے بیٹے کو منع فرماتے ہوئے راستہ چھوڑنے کی تلقین فرمائی۔

یہ تھا آپؐ کا سلوک ایک ایسے مرتد کے ساتھ جو سب مرتدین کا سردار تھا جس کے ارتداد کی خود خدا نے گواہی دی اور جو اپنی زبان سے اپنی انتہائی ذلت پر ہمیشہ کے لئے مہر لگا گیا لیکن جرم ارتداد کی سزا قتل قرار دینے والوں کو میں بتاتا ہوں کہ میرے محبوب آقاؐ کا کرم یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے اور بھی اعلیٰ اور ارفع مقام آتے ہیں۔

یہ وقت گذر گیا اور نہ اس وقت نہ اس کے بعد کسی نے اس مرتدوں کے سردار یا اس کے ساتھیوں کے خلاف تلوار اٹھائی یہاں تک کہ اس نے طبعی موت سے اپنے بستر پر جان دی۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ ہمیش کے لئے اپنے سلوک سے یہ ثابت فرما دیا کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل نہیں اور یہ گواہی قرآن کریم میں ابدالآباد تک لکھی گئی۔ آپؐ کا یہ سلوک ایسے مرتدین کے ساتھ جن کے ارتداد کے بارہ میں شک کا کوئی شائبہ بھی باقی نہیں رہا تھا کیونکہ یہ ارتداد کا فتویٰ کسی انسان نے نہیں لگایا تھا بلکہ خود اس عالم الغیب خدا نے لگایا تھا جو دلوں کے ہر راز سے واقف ہے اور سب گواہوں سے زیادہ سچا گواہ ہے، صرف یہی نہیں کہ آپؐ نے اس دنیا میں اسے ارتداد کی کوئی سزا نہیں دی بلکہ رحمت کی حد یہ ہے کہ اس کی موت پر آپ کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ کہیں وہ آخرت کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائے۔ حیرت ہے کہ آپؐ کا دل اسی کینہ ور کے لئے بے چین ہو گیا جو ہمیشہ آپؐ سے دشمنی کرتا رہا۔ جس کا سینہ آپؐ کی ترقی کو دیکھ کر بغض اور عناد سے بھر جاتا تھا اور جس کا دل آپؐ کے حسد میں ہمیشہ جلتا رہا۔ آپؐ اس کی موت پر اس ارادہ سے اس کے جنازہ کے لئے نکلے کہ اپنے خدا کے حضور گریہ وزاری کر کے اور اس کے غیر محدود رحم اور عفو کا واسطہ دے کر اپنے اس بد بخت دشمن کے لئے بخشش کے طالب ہوں گے۔ آپؐ کے اس مقدس ارادہ کا اس طرح پتہ چلتا ہے کہ جب آپؐ جنازہ کے لئے نکلے تو حضرت عمرؓ نے جنازہ نہ پڑھنے کا مشورہ عرض کیا لیکن جب آپؐ کو مصر پایا تو وہ آیت قرآنی پیش کی جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (التوبة:۸۰)

کہ اگر تو ان کے لئے یعنی منافقوں کے لئے ستر مرتبہ بھی معافی مانگے تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں کرے گا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا وہ ایسا پیارا ہے کہ جان آپؐ پر نچھاور ہونے لگتی ہے اور روح قدم بوسی کرتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: عمر! خدا تعالیٰ نے ستر مرتبہ فرمایا ہے میں ستر سے زیادہ مرتبہ بخشش مانگ لوں گا۔

پس اے میرے آقاؐ پر جبر وتشدد کا الزام لگانے والو! آؤ تم کہاں ہو آؤ کہ میں تمہیں اس لاثانی دل کے ساتھ متعارف کرواؤں جس کا رحم ابراہیمؑ کے رحم سے بڑھ کر تھا اور جس کی بخشش کے سامنے مسیحؑ کی بخشش کی کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ وہ جو زمین کے ذلیل ترین کیڑوں کے ہاتھوں بھی ستایا گیا اور جس نے ظالم ترین سفاکوں کو بھی معاف کر دیا۔ آؤ اور اس کریم فطرت کا نظارہ کرو اور اس حلیم دل کو دیکھو کہ جس کا صبر صبر ایوبی کو شرماتا ہے۔ ہاں وہی حسن کامل کا مظہر تام جو اپنے ہر خلق میں ہر دوسرے نبی سے افضل تھا۔ اس کے نورانی دمکتے ہوئے چہرہ کی طرف نگاہ کرو اور بتاؤ کہ کیا یہ وہی ہے جس کی تصویر تم نے اپنے ظلماتی قلموں سے کھینچ رکھی ہے؟ کیا یہ وہی ہے جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن ہے؟

کاش تمہاری نگاہیں شرم سے جھک جائیں اور ندامت سے تمہاری آنکھیں خونناب ٹپکانے لگیں۔

مگر تمہارے دل پارہ پارہ نہیں ہوتے !!!

تشدّد کے کچھ اور شاخسانے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی جو تصویر مولانا مودودی نے کھینچ رکھی ہے اسے دیکھ کر ایک تھوڑی سی سمجھ رکھنے والا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ تصویر ہر غیر مسلم کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے کافی ہے مودودی صاحب کے اسلام کا تصور سوداؔ کے اس جملہ میں سمٹ آتا ہے کہ:۔

لانا بے غنچے میرا قلمدان

سوداؔ ایک ہجو گو شاعر تھے اور جب کسی مخالف سے اپنی مرضی منوانا مقصود ہوتی تو سننے میں آیا ہے کہ دھمکی کے طور پر یہ فقرہ کہا کرتے تھے۔

مولانا کے اسلامی تصور کا ٹیپ کا مصرعہ بھی کچھ اسی قسم کا بنتا ہے کہ:۔

لانا بے غنچے میری تلوار

پس ابھی ان کی تلوار کی دھمکی ختم نہیں ہوئی اور ابھی تشدد کے کچھ اور شاخسانے باقی ہیں:۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

جب تشدد کا چکر ایک مرتبہ چل پڑا تو تشدد کے سوا اسے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اب ''سنگ گراں'' راہ میں یہ آیا ہے کہ اس بھیانک تصور کو پیش کرنے کے بعد تبلیغ کے تو سارے دروازے بند ہو گئے۔ ''چوہے دان'' میں تو ''چوہا'' اس وقت پھنسا کرتا ہے جب اسے متنبہ نہ کیا گیا ہو مگر یہاں تو وہ متنبہ کر دیا گیا ہے۔ اور پیدائشی مسلمانوں کا حال بھی وہ دیکھ چکا۔ عبادات کی قواعد بھی اس کی نظر سے اوجھل نہیں رہی۔ مذہب کے نام پر خون ریزی ہوتی بھی اس نے دیکھ لی اور بغاوت کی عام تعلیم سے بھی واقف ہو گیا۔ پھر وہ کیا ایسا ہی سر پھرا ''چوہا'' ہے کہ ضرور ''چوہے دان''

کے اندر آئے گا

ایں بیشہ مبر گماں کہ خالی ست

باید کہ پلنگ خفتہ باشد

ہمسایہ کا حق مگر یہ سنگِ گراں بظاہر کیسا ہی کوہ گراں کیوں نہ نظر آئے مودودی صاحب کی پُرتشدد پالیسی کے سامنے یہ سب روکیں ہیچ ہیں اور خس راہ کی طرح اڑ جاتی ہیں چنانچہ غیروں کے لئے آپ ایک تین نکاتی پروگرام تجویز فرماتے ہیں۔ اس کا پہلا جز حقوق ہمسائیگی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور دوسرے لفظوں میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چوہا اگر ہمارے پاس نہیں آسکتا تو ہم تو چوہے کے پاس جاسکتے ہیں۔

آپ ہمسایہ کافر ملکوں پر حملہ کرنے کی ایک وجہ جواز پیش فرماتے ہیں جو آپ ہی کے الفاظ میں سننے کے لائق ہے:۔

''اسلام یہ انقلاب ایک ایک ملک یا چند ملکوں میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں برپا کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ ابتداءً **مسلم پارٹی** کا فرض یہی ہے کہ جہاں جہاں وہ رہتے ہوں وہاں کے نظام حکومت میں انقلاب پیدا کریں لیکن ان کی آخری منزل مقصود ایک عالمگیر انقلاب کے سوا کچھ نہیں[۱]۔''

یہاں مجھے بھی مولانا سے اتفاق ہے کہ اسلام کی آخری منزل مقصود ایک عالمگیر انقلاب کے سوا کچھ نہیں مگر اختلاف یہ ہے کہ انقلاب سے مولانا کی مراد بعینہٖ اشتراکی انقلاب سے ہے حتی کہ نعرہ بھی وہی ہے مگر میرے نزدیک اسلام کی آخری منزل مقصود ایک روحانی عالمگیر انقلاب رونما کرنا ہے۔

مولانا کا اسلامی انقلاب قدم بقدم اشتراکیت کی ڈگر پر چل رہا ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی ایک جگہ گذارش کی تھی اگر آپ مسلم پارٹی کی بجائے کمیونسٹ پارٹی پڑھنا شروع کر دیں تو مجال ہے کہ کوئی اشتراکی سمجھ سکے کہ لینن کی آواز ہے کہ مودودی صاحب کی۔ اشتراکی انقلاب کی بنیاد بھی ذات پر مبنی نہیں عدل پر ہے اور مودودی صاحب کا انقلاب بھی اسی مرکزی تصور کے گرد بلکہ اسی کے

۱؎ حقیقت جہاد صفحہ ۶۳

بہانے گھومتا ہے اور حد یہ ہے کہ وجہ جواز بھی دونوں کی ایک ہی سی ہے اور ہمسایہ کے حقوق کا تصور بھی بعینہٖ ایک ہے دیکھئے مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

''انسانی تعلقات و روابط کچھ ایسی ہمہ گیری اپنے اندر رکھتے ہیں کہ کوئی ایک مملکت بھی اپنے اصول و مسلک کے مطابق پوری طرح عمل نہیں کرسکتی جب تک کہ ہمسایہ ملک میں بھی وہی اصول و مسلک رائج نہ ہو۔لہٰذا مسلم پارٹی کے لئے اصلاح عمومی اور تحفظ خودی دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطہ میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنے پر اکتفاء نہ کرے[۱]۔''

آپ نے یہ ہمسایہ ملکوں کے حقوق کے بارہ میں مودودی صاحب کا ''اسلامی تصور'' ملاحظہ فرمالیا کہ کیا اس میں اور اشترا کی تصور میں کوئی فرق ہے؟

اب آگے چلئے کہ یہ مقصد حاصل کس طریق پر ہوگا تو وہ طریق یہ نظر آتا ہے کہ ایک طرف تو یہ مسلم پارٹی تمام ممالک کے باشندوں کو یہ دعوت دے گی کہ ''اس مسلک کو قبول کریں جس میں ان کے لئے حقیقی فلاح مضمر ہے دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہوگی تو وہ لڑ کر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹادے گی۔''

تشدد اور گھٹیا بزدلی کا جو امتزاج اس آخری فقرہ میں پایا جاتا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ ''اگر اس میں طاقت ہوگی تو وہ لڑ کر.....'' یا دوسرے لفظوں میں جہاں کوئی کمزور دیکھا اسے مار کوٹ کر منوالے گی اور جہاں طاقتور نظر آیا وہ دعوت نامہ نکال کر پیش کردے گی۔ کمزور مظلوم سے متعلق جس پر حملہ کیا جارہا ہو تو اس پالیسی کا تصوّر قابل برداشت ہے کیونکہ اس کے اختیار ہی میں نہیں ہے کہ وہ اس حملہ کو روک سکے۔ وہ اگر اپنے آپ کو کمزور پاکر اس ڈر سے کہ مجھے لڑائی میں اور بھی زیادہ مار نہ پڑ جائے چپ سادھ لے تو انسان اسے معذوری کا نام دے سکتا ہے مگر ایک حملہ آور کی یہ پالیسی کہ ایک جیب میں چھرا ہو اور دوسرے میں دعوتی کارڈ اس کے لئے جو نام میرے ذہن میں آتا ہے وہ اگر میں نے لکھ دیا تو مولانا ضرور ناراض ہوں گے اور سخت ناراض ہوں گے مگر وہ بھی بے چارے

---

[۱] حقیقت جہاد صفحہ ۶۴

مجبور ہیں اگر عقائد بگاڑ دیئے گئے ہوں اور دلائل اور اخلاق حسنہ اور قربانی اور دعا اور نصیحت اور صبر کے تمام ہتھیاروں کے ٹکڑے اڑ چکے ہوں تو اسلام تو بہر حال کسی طرح پھیلا نا ہی ہے نا!

اللہ تعالیٰ نے بھی مختلف قسم کے جانور پیدا فرمائے ہیں۔ بعض پرندے ہوتے ہیں جن کے پاس صرف پیار کے گیت ہوتے ہیں اور معصوم حسن کی بے آواز دعوتیں۔ اور بعض درندے ہوتے ہیں جن کے پاس وحشت ناک حملوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ امتزاج شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں کہ ایک ہاتھ میں تلوار ہو اور ایک میں دعوتی کارڈ۔

مجھے یاد ہے کہ ہائی کورٹ کے سامنے لارڈ لارنس کا ایک بت تھا جس کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں قلم یعنی قلم کی حکومت مانو ورنہ تلوار کی سزا پاؤ گے۔ مگر فرق یہ ہے کہ اس کا تعلق محض ان لوگوں سے تھا جو پہلے ہی سے بزور تلوار اس کے محکوم بنائے جا چکے تھے۔ اور قلم بھی ان ہی لوگوں کے لئے تھا جن کے لئے تلوار تھی مگر ایسا عجوبہ روزگار بت ابھی بننے کو ہے جس کے ایک ہاتھ میں ایک برہنہ چمکتی ہوئی تلوار ہو جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا دعوتی کارڈ بھی لٹکا ہوا ہو اور دوسرے ہاتھ میں محض ایک خوشنما مرصع دعوتی کارڈ ایک چاندی کی طشتری میں سجا ہوا ہو۔ تلوار والا ہاتھ تو ایک نحیف وزار، نیم مردہ، نیم زندہ مفلوک الحال شخص کی طرف اٹھا ہوا ہو اور طشتری والا ہاتھ دوسری سمت میں ایک دیوہیکل، تنومند، گرانڈیل جوان کی خدمت عالیہ میں وہ چاندی کی طشتری پیش کر رہا ہو۔

لیکن اس طشتری میں ایک چھوٹا سا کارڈ اگر اس مضمون کا بھی لکھ کر رکھ دیا جائے کہ حضور ابھی ہم کمزور ہیں جب طاقتور ہوں گے تو پھر حاضر خدمت ہوں گے تو اس بارہ میں کیا خیال ہے؟

لیکن اگر کہیں اندازہ میں غلطی ہو گئی اور انقلابی نظر نے دھوکہ کھایا۔ کسی طاقت ور پر تلوار اٹھ گئی تو پھر؟ ـــــ

بہر حال مودودی صاحب کی اشاعت اسلام کا تصور یہ ہے اور اس بارہ میں خود مختار ہیں۔ پابند تو ہم لوگ ہیں جنہیں کچھ بولنے کی اجازت نہیں اور اس تصور کا خلاصہ سیدھے سادھے الفاظ میں یہی ہے کہ چونکہ تم ہمارے ہمسایہ ہو اور ہمارا فرض ہے کہ ہر طرح سے تمہاری بہبود کا انتظام کریں اور بہر حال تمہیں ہلاکت سے بچائیں اس لئے ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ اگر تمہیں اپنے سے کمزور پائیں تو

آنکھیں بند کر کے ہڑپ کر جائیں۔

دوسرے دو نکات اس تبلیغی پروگرام کے دوسرے دو نکات احتیاطی تدابیر کے طور پر ہیں۔ پہلے کا تعلق غیر مسلموں کے اس حق سے ہے کہ وہ مسلمانوں کو تبلیغ کر سکیں۔ اس کا جواب تو واضح ہی ہے:۔

''اس مسئلہ کا فیصلہ تو بڑی حد تک قتل مرتد کے قانون نے خود ہی کر دیا ہے (یعنی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری) کیونکہ جب ہم اپنے حدودِ اقتدار میں سے کسی ایسے شخص کو جو مسلمان ہو اسلام سے نکل کر کوئی دوسرا مذہب و مسلک قبول کرنے کا حق نہیں دیتے تو لامحالہ اس کے معنی یہی ہیں کہ ہم حدود دار الاسلام میں اسلام کے بالمقابل کسی دوسری دعوت کو اٹھنے اور پھیلنے کو بھی برداشت نہیں کر سکتے [۱]۔''

دلیل بڑی واضح ہے اور قارئین سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ مختصراً اپنے الفاظ میں بھی بیان کر دیتا ہوں۔ جب مودودی صاحب کے اسلام نے اپنے لئے مندرجہ ذیل حقوق محفوظ کروا لئے ہوں:۔

(۱) تبلیغی دعوت بھجوانا۔

(۲) کوئی قبول کرے نہ کرے جس کسی پر اختیار چلے حملہ کر دینا اور بزور حکومت چھین لینا۔

(۳) اگر اپنوں میں سے کوئی شخص دوسرا مذہب قبول کرے تو اسے قتل کر دینا۔

تو پھر ظاہر ہے کہ دوسرے مذہب کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی یہی تین طریق اختیار کرلے۔ وہ کوئی سچا ہے جو اسے یہ حقوق پہنچتے ہوں! مودودی صاحب تو سچے ہیں۔

کافروں کو کافروں میں تبلیغ کرنے کی ممانعت آخری نکتہ جو مودودی صاحب اشاعت اسلام کے سلسلہ میں پیش فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر بعض کافروں نے کافروں میں ہی تبلیغ شروع کر دی تو ممکن ہے بعض کافر دوسرے کافروں کو قائل کر کے ان کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیں اس لئے ان کافروں کو یہ حق کہاں سے مل گیا کہ کافروں میں تبلیغ کریں۔ یہ الفاظ میرے ہیں دلیل مودودی صاحب کی ہے۔ اب مودودی صاحب کے الفاظ میں بھی اس دلیل کو سن لیجئے:۔

---

[۱] مرتد کی سزا اسلامی قانون میں صفحہ ۳۲

''اب ظاہر ہے کہ جب اسلام کا اصل موقف یہ ہے تو اس کے لئے اس بات کو پسند کرنا تو درکنار گوارا کرنا بھی سخت مشکل ہے کہ بنی آدم کے اندر وہ دعوتیں پھیلیں جو ان کو ابدی تباہی کی طرف لے جانے والی ہیں۔ وہ داعیان باطل کو اس بات کا کھلا لائسنس نہیں دے سکتا کہ وہ جس آگ کی طرف خود جا رہے ہیں اس کی طرف دوسروں کو بھی کھینچیں [1]۔''

مودودی صاحب کے الفاظ بھی آپ نے ملاحظہ فرما لئے اب میں اس پر مزید کیا کہوں ؎

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

یہاں سوال یہ نہیں تھا کہ کافروں کو مسلمانوں میں تبلیغ کی اجازت ہے یا نہیں بلکہ سوال یہ تھا کہ کافروں کو کافروں میں تبلیغ کی اجازت ہے یا نہیں مگر مودودی صاحب کے نزدیک اسلام داعیان باطلہ کو اس امر کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ دلیل کچھ اس طرح پر قائم کی گئی ہے کہ یہ کس طرح اجازت دی جا سکتی ہے کہ جس کفر کی آگ میں وہ خود پڑے ہوئے ہوں اس کی طرف دوسروں کو بھی کھینچیں حالانکہ صورت حال یہ بنتی ہے کہ جس آگ میں ایک قسم کے کافر پڑے ہوئے ہیں اسی آگ میں دوسری قسم کے کافر بھی پڑے ہوئے ہیں اور جہاں تک ان کے آگ میں ہونے کا تعلق ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے مودودی صاحب کی دلیل دراصل یہ بنے گی کہ ''اسلام'' یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک وسیع آگ میں جلنے والے کفار اس آگ کی دوسری سمت سے لوگوں کو اپنی طرف بلائیں۔ اگر اس بات کی اجازت دے دی جائے تو بے چارے اس آواز پر لبیک کہنے والے جل جائیں گے اور اسلام یہ ظلم کس طرح برداشت کر سکتا ہے؟

پس بنی نوع انسان کی گہری ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ اوّل تو کچھ پچکار کر کچھ ڈرا دھمکا کر لوگوں کو اس آگ کے ٹکڑے سے نکالنے کی کوشش کی جائے لیکن اگر کوئی نہ مانے تو کم از کم یہ ضرور کیا جائے کہ لڑ کر بزور شمشیر اس خطہ نار پر اقتدار حاصل کر لیا جائے۔ اور پھر جب اقتدار حاصل ہو جائے تو تلوار تانے ہوئے سنتری ان جلتے ہوئے کفار پر نگران کھڑے ہو جائیں اور ایک آواز دینے والا

---

[1] مرتد کی سزا صفحہ ۳۵

یہ آواز دے کر کہ ''خبر دار! تم میں سے کوئی دوسرے کو اپنی طرف نہ بلائے ورنہ گردن ماردی جائے گی۔ اس طریق پر تو تم سارے لوگ جل جاؤ گے اور یہ سوچ کر بھی ہماری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اس لئے جس کروٹ پر جہاں جل رہے ہو وہیں اسی کروٹ پر جلتے رہو ورنہ مار مار کر ہم ٹکڑے اڑا دیں گے۔ شرم نہیں آتی ہمیں دکھ دیتے ہوئے؟ ظالم کہیں کے!''

یہ آواز سن کر پھر کس کی مجال ہے کہ دم مارے اور جگہ تبدیل کرے؟ لیکن اگر اس حبس دوام سے سخت گھبرا کر اور عواقب سے بے خوف ہو کر کوئی ''جلنے والا'' یہ سوال کر بیٹھے کہ ''اے شاہ اقتدار! آپ نے ہم سے تمام آزادیاں چھین لیں اور پابہ زنجیر کر دیا۔ محض اس لئے کہ کسی طرح ہمیں آگ کے اس خطے سے نکالیں جسے ہم آگ کا خطہ نہیں سمجھتے اور اس سوزش کے عذاب سے بچالیں جس کی جلن کو ہم محسوس نہیں کرتے۔ اے شاہ اقتدار! ہم اس آگ کو تو آگ نہیں سمجھتے مگر یہ تلوار کے زور سے ہمارے ہاتھوں سے حکومتیں چھین کر اور آزادیوں کو سلب کر کے جو آگ آپ نے ہمارے سینوں میں بھڑکائی ہے وہ ہمیں جلا کر خاکستر کئے دیتی ہے۔ اس کے بدلہ میں ہم نے کیا پایا؟..... کیا ہم ابھی تک اسی طرح اسی خطہ نار میں موجود نہیں جس سے آپ ہمیں نکالنا چاہتے تھے؟ بس اب آپ یہاں کھڑے نظارہ کیا کر رہے ہیں؟ آگے بڑھیئے اور اگر آپ کی ہمدردی کے دعوے سچے ہیں تو یا تو ہمیں اس خطہ نار سے نکال لیجئے جو آپ کے نزدیک خطہ نار ہے تا کہ ہمیں آزادی کے سانس نصیب ہوں یا پھر اس آگ ہی کو ٹھنڈا کر دیجئے جو خود آپ نے ہمارے سینوں میں بھڑکائی ہے۔''

یہ دردناک پکار سن کر وہ آواز دینے والا یہ جواب دے گا کہ ان دونوں کیفیتوں میں سے ایک کو بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔

''زیادہ سے زیادہ جس چیز کو وہ بادل ناخواستہ گوارا کرتا ہے وہ بس یہ ہے کہ جو شخص خود کفر پر قائم رہنا چاہتا ہوا سے اختیار ہے کہ اپنی فلاح کے راستہ کو چھوڑ کر اپنی بربادی کے راستہ پر چلتا رہے اور یہ بھی وہ صرف اس لئے گوارا کرتا ہے کہ زبردستی کسی کے اندر ایمان اتار دینا قانون فطرت کے تحت ممکن نہیں [1]۔''

---

[1] مرتد کی سزا صفحہ ۳۵

یہ جواب سن کر جو کچھ اس سوالی کے دل پر بیتے گی اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہر صاحب دل انسان کر سکتا ہے۔ کیا وہ اس آتش زار کی دیواروں سے سر نہ پٹکے گا کہ جب یہ بزرگ جانتے تھے کہ ''زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دینا قانون فطرت کے تحت ممکن نہیں''۔ تو پھر یہ اب تک مجھ سے کیا سلوک فرماتے رہے ہیں؟

لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اس کافر کو اپنے آتش زار کی دیواروں سے سر پٹکنے دیجئے اور اک ذرا وہ بھی سن لیجئے جو یہ جواب سن کر میرے دل پر گزری ہے۔ غالبؔ کے اس مصرعہ کے مطابق کہ

ہے دل شوریدہ غالبؔ طلسم پیچ و تاب

واقعی دل مختلف قسم کے جذبات کے ہیجان سے ایک طلسم پیچ و تاب بن رہا ہے اور حیرت ہے اور غصہ ہے اور غم ہے اور سخت تلملاہٹ ہے کہ آخر کیوں وہ غیر فطری افعال جن کے کرنے کی خود مودودی صاحب کو بھی جرأت نہ ہو سکی آپ نے اس جرأت اور دھڑلے کے ساتھ ہمارے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کئے ہیں؟

خود تو اپنے تصور کی دنیا میں، اس دنیا میں جہاں تشدد کی بادشاہی تھی اور تلواریں لہرا رہی تھیں اور گردنیں کاٹی جا رہی تھیں جب اس مقام تک پہنچے جو اس جدوجہد کا آخری مقام تھا اور وہ قلعہ جب سامنے آیا جس کا سر کیا جانا ہی مقصود تھا تو ہاتھ لرز گئے اور قدم ڈگمگا گئے اور اس سراسر غیر فطری فعل کے دعویٰ کی بھی جرأت نہ کر سکے۔ اس وقت انہیں اپنی فطرت کی یہ آواز سنائی دی کہ

''زبردستی کسی کے اندر ایمان اتار دینا قانون فطرت کے تحت ممکن نہیں۔''

میں ان سے یہ پوچھتا ہوں کہ یہ فطرت کی آواز کیوں گنگ تھی جب میرے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ ناپاک الزام لگا رہے تھے کیوں نہ انہیں اس وقت یہ آواز سنائی دی جب ان کا قلم یہ زہر اگل رہا تھا کہ:۔

''...... قوم نے آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعی اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی ...... تو رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا۔''

کی مِرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اگر وہ اس دعویٰ میں سچے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار کی طاقت سے دلوں کے زنگ کو دور کیا تھا تو پھر یہ جھوٹ ہے کہ ''زبردستی کسی کے اندر ایمان اتار دینا قانون فطرت کے تحت ممکن نہیں۔'' اور اگر یہ سچ ہے اور یہی سچ ہے تو پھر وہ جھوٹ تھا کہ میرے آقاؐ نے تلوار کی دھار سے قلوب کے زنگ کو کھرچا تھا۔ مگر ظلم کی انتہاء یہ ہے کہ اپنے لئے تو پیمانہ فطرت ہے اور آقاؐ کے اخلاق کو ہر غیر فطری پیمانے سے ناپا جارہا ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگا بیٹھے تھے تو کم از کم اخلاق اور وفا کا تقاضا یہ تھا کہ پھر خود بھی اسی الزام کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ دیتے، صحابہ رضوان اللہ علیہم کے عشق کا تو یہ حال تھا کہ ہر اس وار کو جو ان کے محبوب آقاؐ پر کیا جاتا تھا اپنے ہاتھوں پر، اپنے دلوں پر لیتے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جنگ احد کے موقع پر حضرت طلحہؓ کا ہاتھ ان تیروں کو روک روک کر جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھینکے گئے تھے ہمیشہ کے لئے بے کار ہو گیا تھا مگر مولانا کا یہ حال ہے کہ تیر روکنے کا تو کیا سوال آنحضرتؐ کے شدید ترین دشمنوں کی ہمنوائی میں آپؐ پر مہلک اعتراضوں کے تیر برسا رہے ہیں اور جب وہی تیر خود ان کی طرف پھینکے جاتے ہیں تو دامن بچا کر الگ جا کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى .... یہ تو بہت بری تقسیم ہے!

قتل مرتد ظلم نہیں رحم ہے یہ بہت ہی بری تقسیم ہے مگر تقسیم تو تقسیم کرنے والے پر منحصر ہوا کرتی ہے اور تقسیم کرنے والے کی طرز فکر اپنے فکر کی ہر تخلیق پر اپنی مہر ثبت کرتی چلی جاتی ہے۔ جس طرح ایک صانع یا ایک مصوّر یا ایک شاعر اپنی صنعت یا تصویر یا شعر سے پہچانا جاتا ہے اور جس طرح وہ صنعتیں یا تصاویر یا اشعار مختلف حالات اور کیفیات کا نتیجہ ہونے کے باوجود ایک خاص رنگ اپنے بنانے والے کا اپنے اندر رکھتے ہیں اسی طرح مودودی صاحب کی بھی ہر تخلیق پر ان کا ایک خاص رنگ غالب ہے اور یہ رنگ سرخ ہے۔ ہر دیکھنے والا اس رنگ کو سرخ ہی دیکھتا ہے اور یہی وہ رنگ ہے جس میں مودودی آنکھ اسلام کو رنگین دیکھنے کی عادی بن چکی ہے۔ مگر خدا جانے کیوں کبھی کبھی مولانا اس رنگ کا نام سبز

رکھ دیتے ہیں اور تماش بینوں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ جسے تم سرخ دیکھ رہے ہو دراصل یہ سبز ہے۔

قتل مرتد کے بارے میں مولانا کے تصورات سے تو قارئین روشناس ہو ہی چکے ہیں اور ان کے اس عقیدہ پر بھی ابھی ابھی اطلاع پا چکے ہیں کہ زبردستی کسی کو مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔ اس مؤخر الذکر عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب زبردستی مسلمان بنایا ہی نہیں جا سکتا تو پھر اس سلسلہ میں زبردستی کرنا بھی خلاف عقل اور ممنوع ہوگا۔ مگر مولانا اس نتیجہ کو تسلیم کرنے پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے اور اپنی مخصوص طرز استدلال کے ذریعہ اپنے دل کو قائل کر لیتے ہیں کہ ایمان کی اشاعت کے لئے ہر قسم کا جبر جائز ہے اور اگر اشاعت کے لئے نہیں تو اسی عذر پر یہ جبر جائز ہے کہ مومنوں کا ایمان محفوظ رہے چنانچہ اس خود حفاظتی کے بہانے ہمسایہ ملکوں پر حملہ کرنا بھی نہ صرف جائز بلکہ بس چلے تو از بس ضروری ہے۔ ہاں ایک مقام پر جا کر یہ اس عقلی تقاضا کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور وہ مقام قتل کافر کا مقام ہے اور خود مولانا کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ایمان نہ لانے کے جرم میں کافر کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ ہے۔ ایک عقلی اعتراض سے تو بچ نکلے دوسرا آپڑا۔ مشکل اب یہ درپیش ہے کہ جرم کفر میں اگر ایک کافر کو قتل کی سزا نہیں دی جا سکتی تو پھر مرتد کو اسی جرم کی سزا میں کیوں مارا جا رہا ہے؟ کیا اسے زبردستی مسلمان بنایا جا سکتا ہے؟ اگر صرف یہ کہا جائے کہ ایسے شخص کا سوسائٹی میں رہنا سوسائٹی کے لئے نقصان دہ ہے تو جواباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح دوسرے کفار کا سوسائٹی میں رہنا سوسائٹی پر برے رنگ میں اثر انداز نہیں ہوتا اسی طرح اس نئے کافر کا حال ہوگا۔ اور اگر وہاں برداشت کیا جا سکتا ہے تو یہاں بھی برداشت کر لیں۔ جو پابندیاں آپ دوسرے کفار پر عائد کرتے ہیں اس نَو کافر پر بھی عائد کر دیجئے۔ زیادہ سے زیادہ گھر بدر بلکہ ملک بدر کر دیجئے۔ عمر قید کی سزا دے دیجئے۔ یہ قتل کا بھلا کیا جواز ہوا یہ تو صریح ناانصافی اور ظلم ہے۔ تو یہ جواب سن کر مولانا ہمیں خبر دیتے ہیں کہ نادانو! آنکھ کے اندھو! یہ ظلم نہیں یہ تو رحم ہے۔ دکھائی نہیں دیتا تو پوچھ ہی لیا کرو۔ اپنے الفاظ میں اس رحم کی تفصیل مولانا یوں بیان فرماتے ہیں:۔

''اس کے لئے دو ہی علاج ممکن ہیں یا تو اسے اسٹیٹ میں تمام حقوق شہریت سے

محروم کر کے زندہ رہنے دیا جائے یا پھر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلی صورت فی الواقع دوسری صورت سے شدید تر سزا ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی کی حالت میں مبتلا رہے...... اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس کو موت کی سزا دے کر اس کی اور سوسائٹی کی مصیبت کا بیک وقت خاتمہ کر دیا جائے[1]۔''

کیا یہ بعینہٖ اس سرخ پوش کی آواز کی سی آواز نہیں ہے جو مجمع میں کھڑا حاضرین کو یہ یقین دلا رہا ہو کہ ''اندھو۔ نابیناؤ۔ مان لو کہ میرے کپڑوں کا رنگ سبز ہے—''

لیکن اگر رنگ واقعی سبز ہے اور ہم نے غلطی کھائی ہے تو مولانا کو میرا مشورہ یہی ہے کہ ذرا دھیمی آواز میں بات کریں۔ اگر اس آتش زار کے بسنے والے کفار کے کانوں تک یہ آواز جا پہنچی جن کا ابھی کچھ دیر پہلے تذکرہ گزرا ہے تو کیا انہیں اس خیال سے دھکا نہیں لگے گا کہ دعوے تو یہ تھے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے تمہاری ہی ہمدردی اور بہبود کی خاطر ہے مگر جب قسمتوں کی تقسیم کا وقت آیا تو رحم تو اپنوں کی جھولی میں ڈال دیا اور ظلم ہمارے دامن میں۔ حالانکہ جرم دونوں کا ایک ہی نوعیت کا تھا۔ وہ کفار مولانا سے متعلق کیا کیا نہ خیال دل میں لائیں گے اور کیسے کیسے ظن ان پر نہ کریں گے؟ اس لئے بہتر ہے کہ یہ اپنی آواز کو دھیما کریں اور کیوں نہ بس اسی امر پر اکتفاء ہوجائے کہ قتل سے کچھ دیر پہلے صرف مرتدین کے کانوں ہی میں سرگوشی کر دی جائے کہ میاں غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا۔ فی الواقع تم سستے چھوٹے ہو اور تم سے استثنائی طور پر رحم کا سلوک کیا گیا ہے اور جاتے جاتے مزید ہمدردی کے اظہار کے طور پر ان کا ہاتھ بھی دبا دیا جائے اور رازداری کے رنگ میں نظریں ملا کر مسکراتے ہوئے، اور اگر حسن اتفاق سے کوئی کافر وہاں موجود ہو تو اس کی طرف سر کا اشارہ کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی بڑھا دیئے جائیں کہ دیکھتے نہیں ان لوگوں کا کیا حال ہے؟ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی نہ تو یہ مرتا ہے نہ زندہ رہتا ہے۔

مگر مودودی صاحب یہ ہمدردانہ سلوک تجویز فرماتے ہوئے غالباً ایک بات بھول گئے کہ اسلام کے نزدیک موت فی ذاتہٖ انجام نہیں ہے بلکہ اس کے بعد پھر ایک زندگی ہوگی جس کا نام اسلام

---

[1] مرتد کی سزا صفحہ ۵۱

حیات آخرت رکھتا ہے۔اس لئے دراصل یہ اس مرتد کی مصیبت کا خاتمہ نہیں فرمارہے ہوں گے بلکہ اسے سیدھا جہنم واصل کررہے ہوں گے۔ان کی اس دنیا کی امکانی زندگی سے متعلق (جس سے مولانا اس مصیبت زدہ کو نجات دلا رہے ہیں) تو یہ ایک انسانی رائے تھی کہ وہ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى والی حالت کی مصداق ہے مگر جہاں اسے اب بھجوا رہے ہیں اس سے متعلق تو خدا فرماتا ہے کہ ''لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى'' (الاعلیٰ:۱۴) نہ تو وہ (بدبخت) اس میں مرے گا نہ زندہ رہے گا۔ صرف اسی پر بات ختم نہیں ہو جاتی بلکہ موازنہ اس سے بھی بدتر ہے۔مولانا تو اسے جس آگ سے نجات دینے کے لئے ازراہ شفقت مار رہے تھے وہ خود ان کے ہاتھوں کی بھڑکائی ہوئی تھی اور زیادہ سے زیادہ ہم اسے نارِصغریٰ کہہ سکتے ہیں یعنی چھوٹی آگ مگر اب جس آگ کی طرف اسے بھجوا رہے ہیں اس کا نام خود خدا تعالیٰ نے ''اَلنَّارُ الْکُبْرٰی'' رکھا ہے یعنی بڑی آگ۔پس مولانا کا یہ مصیبتوں سے نجات دلانے کا عجیب طریق ہے کہ ایک لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى کی حالت سے نکال کر دوسری شدید تر لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى کی حالت میں دھکیل رہے ہیں اور ایک ہلکی آگ سے نجات دے کر دوسری بڑی آگ میں جھونک رہے ہیں اور ابھی یہ خاص رحمت اور نرمی کا سلوک ہے اور یہ اعلان بھی جاری ہے کہ یہ رنگ سرخ نہیں ہے سبز ہے۔

کافر کو تو پھر کچھ امید ہو سکتی تھی کیونکہ ابھی اس نے اپنی طبعی موت تک خدا جانے کتنے برس دیکھ بھال کے کاٹنے تھے اور خدا جانے کتنے مواقع اسے میسر آنے تھے کہ حق و باطل میں تمیز کر کے اخروی نجات کو پالیتا مگر یہ مجبور مرتد کہ جس کی رگ جان کاٹنے کے ساتھ ہی نجات کی سب امیدیں منقطع کر دی گئیں دوسری دنیا میں آنکھ کھولتے ہی جب جہنم کی طرف لے جایا جارہا ہوگا تو خدا جانے ان ہاتھ دبانے والوں سے متعلق کیا سوچ رہا ہوگا جنہوں نے قتل سے پہلے اسے یہ یقین دلایا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی فلاح اور بہبود ہی کی خاطر کیا جارہا ہے۔

آخر میں مَیں پھر قارئین کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے اشاعت اسلام کے بارہ میں مودودی صاحب کی پالیسی کے تمام نکات کو مختصراً بیان کر دیتا ہوں:۔

(۱) غیر اسلامی ممالک کو دعوتی کارڈ بھجوائے جائیں مگر طاقت پاتے ہی خصوصاً ہمسایہ

ممالک پر حملہ کر دیا جائے۔

(۲) کافروں کو مسلمانوں میں تبلیغ سے منع کر دیا جائے۔

(۳) کافروں کو کافروں میں تبلیغ سے منع کر دیا جائے۔

اس کے علاوہ میرے نزدیک لازماً قتل مرتد کا مسئلہ بھی اسی پالیسی کا جز ہے اور دراصل یہ چار نکاتی پروگرام کہلانا چاہیے تھا مگر مشکل یہ ہے کہ مولانا کو مجھ سے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک یہ اس پالیسی کا حصہ اس لئے ہے کہ طبعاً قتل کے خوف سے بہت سے مسلمان دوسرے مذاہب اختیار کرنے سے رک جائیں گے۔ مثلاً پچھلے دنوں پاکستان میں ایک خاصی تعداد میں مسلمانوں نے عیسائیت اختیار کی۔ اگر یہ طریق قتل رائج ہوتا تو شائد مشکل سے ان مرتدین میں سے ایک آدھ ہی ایسا راستباز نکلتا کہ ”منافق بن کر زندہ رہنا“ پسند نہ کرتا مگر مولانا کے نزدیک یہ اس پالیسی کا حصہ نہیں ہے اور اس کا مقصد یہ نہیں کہ اس طرح مسلمانوں میں منافق پیدا کئے جائیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

> ”قتل مرتد کو یہ معنی پہنانا بھی غلط ہے کہ ہم ایک شخص کو موت کا خوف دلا کر منافقانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دراصل معاملہ برعکس ہے۔ ہم ایسے لوگوں کے لئے اپنی جماعت کے اندر آنے کا دروازہ بند کر دینا چاہتے ہیں جو تلون کے مرض میں مبتلا ہیں اور نظریات کی تبدیلی کا کھیل تفریح کے طور پر کھیلتے رہتے ہیں.... لہٰذا یہ عین حکمت و دانش ہے کہ ہر اس شخص کو جو اس جماعت کے اندر آنا چاہے پہلے ہی مطلع کر دیا جائے کہ یہاں سے پلٹ کر جانے کی سزا موت ہے تا کہ وہ داخل ہونے سے پہلے سو مرتبہ سوچ لے کہ اسے ایسی جماعت میں داخل ہونا چاہیے یا نہیں۔ اس طرح جماعت میں آئے گا ہی وہ جسے کبھی باہر جانا نہ ہوگا[۱]۔“

مجھے یاد ہے قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان کی اشتراکی پارٹی کا بھی بعینہٖ یہی طریق تھا وہ اپنی خفیہ سوسائٹیوں کا ممبر بنانے سے پہلے ہر آنے والے کو یہ تنبیہ کر دیا کرتے تھے کہ میاں! باہر جانے کی سزا موت ہوگی ـــــ زراعتی کالج لائلپور کا ایک طالب علم جسے میں جانتا تھا بے چارہ اسی جرم میں

---

[۱] مرتد کی سزا صفحہ ۵۱، ۵۲

مارا گیا تھا۔۔۔ مگر یہ تو ضمناً مجھے ایک بات یاد آ گئی تھی جو میں نے کر دی کیونکہ اس سے میرے اس نظریہ کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ مودودیت میں اشتراکیت کا رنگ غالب ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ مولانا نے کچی عمر میں لینن یا مارکس کے بعض اردو تراجم پڑھ لئے ہوں اور آئندہ زندگی کے تصورات ڈھالنے میں انہوں نے ضرورت سے زیادہ کام کیا ہو مگر اس ذکر کو میں چھوڑتا ہوں۔ اس وقت اصل مبحث یہ نہیں تھا۔

میں مولانا مودودی کی قتل مرتد کی وہ توجیہہ لکھ رہا تھا جسے سننے کے بعد پھر میرا یہ حق نہیں رہتا کہ قتل مرتد کے عقیدہ کو بھی اشاعت اسلام کی پالیسی کا ایک جز بناؤں۔ چنانچہ میں نے ایسا نہیں کیا اور محض تین نکاتی پروگرام پیش کیا ہے۔ پس اب اس حصہ مضمون کو ختم کرتا ہوں مگر جانے سے پہلے مودودی صاحب مجھے اجازت دیں کہ ان کی پیش کردہ مندرجہ بالا توجیہہ سے متعلق ایک دو سوال پیش کر دوں۔ وہ سوال یہ ہیں کہ:۔

اوّل:۔ اگر آپ کا یہ دعویٰ درست ہے کہ قتل مرتد کا اصل مقصد یہی ہے کہ آپ ''ایسے لوگوں کے لئے اپنی جماعت کے اندر آنے کا راستہ بند کر دینا چاہتے ہیں'' تو یہ فرمائیں کہ عام انسانی طریق پیدائش کے ذریعہ اس مزاج کے جو مسلمان آپ کی سوسائٹی کے اندر مسلسل داخل ہوتے رہیں گے ان کی روک تھام کے لئے آپ نے کیا تجویز سوچی ہے اور

دوم:۔ اگر ''عین حکمت و دانش'' یہی ہے کہ ''ہر اس شخص کو جو جماعت کے اندر آنا چاہے پہلے ہی مطلع کر دیا جائے کہ یہاں سے پلٹ کر جانے کی سزا موت ہے'' تو وہ کون سے ذرائع ہیں جن کو اختیار کر کے پیدائش سے پہلے ہی مسلمانوں کو خبردار کر دیا جائے گا کہ اگر آنا ہے تو ''سو مرتبہ سوچ کر آؤ۔''

لازم تھا کہ خلاف فطرت عقائد کی توجیہات بھی خلاف فطرت ہی ہوں۔

مودودی دورِ حکومت کی ایک امکانی جھلک

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا!

گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے قارئین پر وہ تصور خوب واضح ہو چکا ہوگا جو مولانا مودودی اسلام، اسلام کے رسولؐ، اسلام کی اشاعت اور اسلام کے اقتدار کے بارہ میں رکھتے ہیں۔ اب میں ان صفحات میں اس امکانی مودودی حکومت کا ایک مختصر سا خاکہ کھینچ کر دکھاتا ہوں جو مودودی صاحب کے حصول اقتدار کے بعد کسی اسلامی یا غیر اسلامی ملک کے پردہ پر رونما ہوگی۔ میرے غیر اسلامی کہنے پر تعجب نہ کریں کیونکہ حقیقتہً یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ پہلے کسی اسلامی ملک میں ظہور پذیر ہونے کی بجائے یہ انقلاب کسی غیر مسلم اکثریت کے ملک میں ظاہر ہو جائے کیونکہ جب ہر ''مسلم پارٹی'' اپنے اپنے ملک میں یہ مزعومہ ''اسلامی انقلاب'' لانے کی کوشش میں مصروف ہوگی اور حصول اقتدار کا ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا جا رہا ہوگا تو کون کہہ سکتا ہے کہ کہاں یہ انقلاب پہلے آئے گا؟ سعودی عرب میں یا غانا میں؟ مصر میں یا لبنان میں؟ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟

بہر حال جب بھی جس طرح بھی اور جہاں بھی یہ اسلامی حکومت رونما ہوگی اس کے کچھ مخصوص نقوش ہوں گے جن پر اس وجود کے طرز فکر کی نہ مٹنے والی مہر ثبت ہوگی جس کے ذہن نے اس کا تصور قائم کیا اور جس کی کوششیں تصورات کے عالم سے اسے عالم وجود میں لے آئیں۔ سب سے پہلا عملی قدم جو حصول اقتدار کے بعد اٹھایا جائے گا وہ غالباً یہ ہوگا کہ اسلام کے عنوان کے تحت مودودی

عقائد کی ایک فہرست شائع کی جائے گی اور یہ اعلان عام کیا جائے گا کہ کسی معین مدت کے اندر اندر وہ تمام مسلمان جو ان ان عقائد کے قائل ہیں نزدیک ترین تھانوں یا عدالتوں میں اپنے نام درج کروادیں۔ اگر وقت مقررہ کے اندر کوئی مسلمان رجسٹر ہونے سے رہ گیا تو اپنی جان، مال اور عزت کا وہ خود ذمہ دار ہوگا نیز اس عرصہ کے اندر اندر تمام رعایا ہتھیار جمع کروادے۔

اس اعلان کے بعد حکومت فوری طور پر قتل وغارت کی تیاری میں مصروف ہو جائے گی اور مودودی فوج اور مودودی پولیس اپنے ہتھیاروں کو صیقل کر لے گی اور ایک ایسے جہاد کے لئے کمرِ ہمت کسنے لگے گی جس میں محنت اور مشقت تو بہت ہوگی مگر شہادت کا کوئی خطرہ نہ ہوگا کیونکہ اس معین دن سے پہلے پہلے دشمن کو نہتہ کیا جا چکا ہوگا۔

ایک بے چین عرصہ انتظار کے بعد آخر وہ دن آجائے گا جبکہ کروڑوں ایسے مرتدین کی گردنیں مودودی تلواروں کے لئے حلال کر دی جائیں گی جو مرتدین پہلے پیدائشی مسلمان کہلاتے تھے چنانچہ ایک آواز دینے والے کی آواز پر خدا جانے کتنی تلواریں اٹھیں گی اور گریں گی اور کتنے سر تن سے جدا ہوں گے اور کتنے بدن خاک وخون میں غلطاں ہوں گے! ــــــ اگر مولانا مودودی کے اقوال اور افعال میں کوئی فرق نہیں، اگر وہ وہی سب کچھ کر بھی سکتے ہیں جو وہ کہتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا اور نہ جانے کتنی تلواریں ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ اٹھیں گی اور ہزار مرتبہ گریں گی اور سر تن سے جدا ہوتے رہیں گے اور بدن خاک وخون میں غلطاں ہوں گے۔

وہ وقت ایسا ہوگا کہ اگر خاوند نے توبہ کر لی یا راستی کی راہ سے ہٹ گیا تو خود اسے تو زندہ رکھا جائے گا مگر اس کی بیوی اس کی آنکھوں کے سامنے تہ تیغ کی جائے گی اور اگر بیوی نے توبہ کر لی یا جھوٹ بول کر منافقت کی راہ اختیار کی تو وہ خود زندہ رکھی جائے گی مگر اس کا راستباز خاوند اس کی آنکھوں کے سامنے ہلاک کیا جائے گا بچے بلا استثناء زندہ رکھے جائیں گے اور بہرحال اپنی ماں یا باپ یا ماں باپ دونوں کو مرتا ہوا دیکھیں گے اور ان دودھ پیتے بچوں کے بلکنے سے جن کی بے قرار آنکھیں مرتد ماؤں کو ترسیں گی اور ان یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی گریہ وزاری سے جن کی روتی ہوئی آنکھیں پھر کبھی ان مرتد باپوں کو نہ دیکھ سکیں گی.... پاکستان کی بستی بستی، قریہ قریہ سے وہ نعرہ ہائے درد

بلند ہوں گے کہ ان کی چیخ پکار کنگرہ عرش کو ہلا دے گی اور ایک طرف تو چین کی دیواریں کانپیں گی اور دوسری طرف یورپ پر لرزہ طاری ہوگا۔اور جب ان چند ایک صالحین کے بازو گردنیں مارتے مارتے شل ہو جائیں گے تو انہی مرتدین سے وسیع و عریض کھائیاں کھدوا کر ان میں سرخ آگ بھڑکائی جائے گی اور رہے سہے مرتدین کو زندہ آگ میں جلا دیا جائے گا اور اس آگ کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی لپٹیں پاکستان کی شمال اور جنوب، مشرق و مغرب کو روشن کر دیں گی۔پس وہ کیسی مبارک صبح ہوگی جب افق پاکستان سے مودودیت کا یہ سرخ سویرا طلوع ہوگا!

مگر یہ تو محض ایک ابتداء ہے اور انتہاء سے پہلے ابھی کئی ایک منازل طے کرنی باقی ہیں۔ اگر سب سے پہلا انقلابی ملک پاکستان ہوا تو ابھی تو کتنے ہی اسلامی ممالک کے وسیع و عریض خطے پاکستان کے دائیں اور بائیں اور آگے اور پیچھے پھیلے پڑے ہیں جہاں ''مرتد مائیں'' ''مرتد بچے'' جَن رہی ہیں اور ابھی تو ہندوستان کے چھ کروڑ مرتدین کا صفایا باقی ہے۔ابھی باقی ہے وہ نوحہ جو پہاڑوں کے سینے پھاڑ دے گا اور آسمان کے پردے چاک کر دے گا اور وہ گریہ باقی ہے جسے سن کر زمین کی چھاتیوں کا دودھ خشک ہو جائے گا اور آسمان کے ستارے سینہ کوبی کریں گے اور جس کے درد سے چاند سورج کی آنکھیں بھی روتے روتے اندھی ہو جائیں گی!

پھر کیا اس وسیع قتل و غارت کے بعد جبکہ تمام اسلامی ممالک اکثر مسلمان آبادیوں سے خالی ہو چکیں گے۔ان ذی اقتدار ''حقیقی مسلمانوں'' کی پیاس بجھ جائے گی اور ہوس اقتدار کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے گی؟ ــــ اگر ان بلند عزائم کو دیکھا جائے جو مولانا کے دل میں جوش مارتے ہیں اور نوکِ زبان اور قلم سے جاری ہوتے رہتے ہیں تو اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔نہیں۔ابھی یہ پیاس نہیں بجھے گی اور یہ آگ ٹھنڈی نہ ہوگی جب تک کہ کفار حکومتوں کو دعوت اسلام بھجوانے کے بعد ان کے اصرار کفر پر یا اس کا انتظار کئے بغیر ہی انہیں بزور شمشیر مقہور نہ کر لیا جائے۔ابھی تو ان کے غضب کی بجلی کو یورپ پر بھی گرنا ہے اور امریکہ پر بھی۔چین پر بھی اور جاپان پر بھی۔آسٹریلیا پر بھی اور نیوزی لینڈ پر بھی۔ ابھی تو اس کے کوندوں نے افریقہ کے صحراؤں پر لپکنا ہے اور سیاہ جنگلوں کو آگ لگانی ہے۔ابھی تو اس نے روس کو نذر آتش کرنا ہے اور سائبیریا کی یخ بستہ ترائیوں کو شعلہ ایمان بخشنا ہے۔ابھی تو کتنے ہی

قتل و غارت کے بازار گرم ہونا باقی ہیں! ابھی مودودی تلواروں نے کتنے ہی اور گھاٹوں کا سرخ پانی پینا ہے اور میں یہ سوچتا ہوں کہ جب یہ مودودی اسلام زمین کے چپہ چپہ کو لالہ رنگ کر چکے گا تو ہزاروں ہزار میل کے ویرانوں میں کسی تنہا ''صالح مسلمان'' کی صدائے اذان کیسی بھلی معلوم دے گی اور میں سوچتا ہوں کہ مولانا کے امن عالم کا اسلامی تصور کتنا بھیانک ہے جس امن کی تصویر چپ چاپ خاموش قبرستانوں میں نظر آتی ہے اور جس کا دوسرا نام زندگی کا فقدان ہے۔ موت ہے۔

منافقین کی ایک عالمگیر جماعت اور اگر یہ قتل و غارت کا بازار گرم نہ ہوا تو صرف ایک صورت میں...... صرف ایک صورت میں کہ دنیا کے پردہ پر منافقین کی ایک عظیم عالم گیر جماعت ظہور پذیر ہو ورنہ اس تلوار سے بچنے کا کوئی امکان نہیں۔ ناظرین اسے افسانہ یا شاعری خیال نہ کریں اگرچہ یہ درست ہے کہ جب مودودی عزائم کا عمل کی دنیا میں نقشہ کھینچ کر دیکھا جائے تو وہ ایک ہولناک افسانہ معلوم ہوتا ہے یا ایک خوفناک خواب یا ایک شاعر کا دل ہلا دینے والا تصور مگر افسوس کہ نہ تو یہ خواب ہے نہ کوئی افسانہ نہ شاعرانہ تصور بلکہ ایک جیتی جاگتی بظاہر سوچنے کی طاقت رکھنے والی علم دین وفہم رسالت رکھنے کی دعویدار ہستی کے وہ نظریات ہیں جو وہ آج اسلام کے نام پر دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہے اور اس تحدی کے ساتھ کہ جب بھی موقع ملا ان دعاوی پر عمل کر کے دکھایا جائے گا۔

یہ ہے وہ اسلام کے عالم گیر غلبہ کا دن جو مودودی تصور کی کھڑکیوں سے جھانک رہا ہے۔ کیا نعوذ باللہ اسی دن کو کھینچ لانے کے لئے آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے افق عرب سے حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نیر عالم تاب کا ظہور ہوا تھا؟

اے کاش! مولانا مودودی اپنے مذہب کو اسلام کے سوا کوئی اور نام دے لیتے اور ہمارے آقاؐ کے نام کو اپنے اس کریہہ المنظر تاریک وتار تصور سے ملوث نہ کرتے لیکن اگر ایسا کرتے تو کون ان کی پیروی کرتا اور کون ان کو اس نئے مذہب کے نام پر ووٹ دیتا؟ اس لئے ان کے سامنے صرف ایک راہ باقی تھی اور وہ راہ یہی تھی کہ اپنے آمرانہ خیالات کو ہمارے معصوم آقاؐ کی طرف منسوب کر کے رائج کرتے۔ پس انہوں نے ایسا ہی کیا اور امن اور سلامتی کے اس رسولؐ کے نام کو بھی اس کشت وخون کے میدان مین گھسیٹنے سے گریز نہیں کیا جس رسول کا ایک ایک سانس امن کا پیغام لے کر آتا تھا،

جس کے مذہب کا نام ہی اسلام تھا!

میں نے عمداً اس امکانی نقشہ کو کھینچتے ہوئے حتی الامکان اختصار اور احتیاط سے کام لیا ہے اور صرف انہی نقوش کی تصویر کشی کرنے پر اکتفاء کی ہے جو واضح اور غیر مشکوک طور پر مولانا کی مختلف کتب میں ملتے ہیں اور جن کے اقتباسات گذشتہ صفحات میں قارئین کی خدمت میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ ویسے مودودیت کے مزاج کو سمجھ لینے کے بعد یہ کچھ مشکل نہیں رہتا کہ انسان ہر دائرہ حیات میں ایک امکانی مودودی حکومت کی صحیح صحیح تصویر اتار سکے۔

مثلاً اس دور کے تمدنی حالات کا نقشہ کھینچا جا سکتا تھا یا ڈنڈے کے زور سے عبادات کروانے پر جو مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو سکتی ہے اس کا ذکر کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح اس حکومت کے بین الاقوامی تعلقات پر بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا اور ان کوششوں کا تصور بھی باندھا جا سکتا تھا جن کے ذریعہ ملک سے بددیانتی، رشوت ستانی اور بدمعاملگی کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اسی طرح ملک کے سیاسی حالات کا نقشہ پیش کرنا بھی کچھ مشکل نہ تھا۔ ایک ایسا ملک جس کی بناء ہی نظریہ تشدد اور خونریزی پر ہو وہ بغاوتوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور اگر اس ملک میں منافقین کی کثرت ہو تو پھر تو یہ خطرہ غیر متناسب طور پر بڑھ جاتا ہے بلکہ جوں جوں وقت گزرتا جائے ایسی حکومت کے خلاف ردعمل تیز تر ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔ پس ان تمام امکانی خطرات کے بارہ میں بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا جو ایسی حکومت کو یقیناً پیش آ سکتے ہیں اس کے علاوہ دوسری قسم کی سازشوں کا تصور بھی باندھا جا سکتا تھا اور اس خفیہ نظام جاسوسی کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا تھا جس کے ذریعہ سے حکومت ان سازشوں اور بغاوتوں کا پتہ لگاتی اور عذاب دینے کے ان ذرائع کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوتا جو ایسی حکومت نے مزید معلومات یا خالص صداقت معلوم کرنے کے لئے بہرحال اختیار کرنے تھے مگر میں ان سب امور سے قطع نظر کرتا ہوں اور قارئین کے انفرادی رجحان یا ذوق پر معاملہ چھوڑتا ہوں تاہم اگر کسی دوست کو مزید تجسس ہو تو مؤخرالذکر امر کے بارہ میں واقعاتی نقشے اشتراکی انقلاب کی تاریخ یا HISTORY OF THE PRIESTCRAFT IN ALL AGES ''ہسٹری آف دی پریسٹ کرافٹ ان آل ایجز'' میں بکثرت مل سکتے ہیں جن کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

مہلت اور معافی نامہ کا ایک فرمان عام آخر پر یہ باب ختم کرنے سے پہلے اگر میں اس عام مہلت اور معافی نامہ کا ذکر نہ کروں جسے جاری کرنے کے امکان کا مودودی صاحب اظہار فرما چکے ہیں تو یہ ان سے ناانصافی ہوگی جیسا کہ میں نے باب کی ابتداء میں ہی اس رائے کا اظہار کر دیا تھا کہ میرا خیال ہے کہ مودودی حکومت اقتدار حاصل کرتے ہی ایک عام فرمان جاری کرے گی اور یہی دستور ہر انقلاب حکومت کا ہوا کرتا ہے اور اس فرمان کے مطابق مسلمانوں کو بعض مخصوص عقائد مدنظر رکھتے ہوئے بحیثیت مسلمان رجسٹر ہونا پڑے گا۔ کم و بیش اسی مضمون کے فرمان جاری کرنے کے امکان کا اظہار مودودی صاحب نے اپنی کتاب ''مرتد کی سزا.....'' کے آخر میں فرمایا ہے۔ فرق یہ ہے کہ میرے نزدیک تو جو لوگ اس وقت مودودی اصطلاح کے مطابق ''مسلمان'' قرار نہیں دیئے جا سکیں گے وہ بہرحال تہہ تیغ کئے جائیں گے مگر مودودی صاحب نے اس امکان کا ذکر کیا ہے کہ چونکہ اس طرح ایک بے نظیر اور بے شمار قتل عام لازم آئے گا اس لئے ممکن ہے ان کو فی الفور قتل کرنے کی بجائے صرف امت سے خارج کر کے کافر ذمیوں کی طرح زندہ رہنے پر مجبور کرنے کو ہی کافی سمجھا جائے لیکن اس کے بعد اگر بقیہ مسلمانوں میں سے کوئی مسلمان اعتقاداً یا عملاً کافر ہو تو اسے بہرحال قتل کیا جائے۔ مگر مولانا کے اس شاہانہ معافی نامہ کے باوجود میں نے اپنے پیش کردہ نقشہ میں جو قتل عام کا مختصر سا خاکہ کھینچا ہے اس کی بعض وجوہ ہیں:۔

۱۔ اوّل تو یہ کہ خود مولانا کی طرف سے بھی کسی یقینی معافی نامے کا اعلان نہیں، مشکل سے صرف ایک امکانی حل کا ذکر ہے اور مجھے یقین ہے کہ حصول اقتدار کے بعد اس نرمی کے سلوک کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا کیونکہ خود مولانا ہی کے الفاظ میں:۔

> ''حکومت اور فرمانروائی جیسی کچھ بد بلا ہے ہر شخص اس کو جانتا ہے۔ اس کے حاصل ہونے کا خیال کرتے ہی انسان کے اندر لالچ کے طوفان اٹھنے لگتے ہیں۔ خواہشات نفسانی یہ چاہتی ہیں کہ زمین کے خزانے اور خلق خدا کی گردنیں اپنے ہاتھ میں آئیں تو دل کھول کر خدائی کی جائے[۱]۔''

---

[۱] حقیقت جہاد صفحہ ۱۵

۲۔دوسری وجہ میرے اس یقین کی یہ ہے کہ اس معافی نامہ کو صادر فرمانے پر آمادگی میں مولانا سے ایک غلطی ہوگئی ہے جسے وہ جلد یا بدیر محسوس فرمالیں گے یا شاید ان کا ہم خیال اس طرف ان کی توجہ مبذول کروادے۔ غلطی یہ ہے کہ اگر اسلامی قانون میں مرتد کی سزا قتل ہے اور وہ پیدائشی مسلمان بھی جو بڑے ہوکر اعتقاداً یا عملاً اسلام سے منحرف ہو چکے ہوں اس قانون شریعت کی رو سے واجب القتل ہیں تو مولانا کو یہ اختیار کہاں سے حاصل ہوگیا کہ وہ ان مجرموں کو معاف کرتے پھریں۔کیا وہ کوئی نئی شریعت بنائیں گے یا شریعت کے کسی حکم کو منسوخ یا تبدیل کرنے کا حق رکھتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر کوئی چارہ نہیں اس کے سوا کہ یا تو اس شریعت سے منحرف ہوکر خود مرتدین کے زمرہ میں جا بیٹھیں یا پھر بادل ناخواستہ قتل عام کا حکم جاری فرمائیں خواہ کروڑوں کروڑ آدمی اس کی زد میں آئیں۔

۳۔مولانا ایک اور بات بھی بھول گئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب خود مولانا کو تسلیم ہے کہ ان دوصورتوں میں سے کہ

''یا تو اسے اسٹیٹ میں تمام حقوق شہریت سے محروم کر کے زندہ رہنے دیا جائے یا پھر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔پہلی صورت فی الواقع دوسری صورت سے شدید تر سزا ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی کی حالت میں مبتلا رہے[۱]۔''

تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جب مولانا نرمی اور رحم کے مزاج میں ہوں تو دوصورتوں میں سے ایسی سزا تجویز فرمائیں جو فی الواقع دوسری صورت سے شدید تر سزا ہو۔

ان وجوہ کی بناء پر میں مجبور تھا کہ اپنے پیش کردہ نقشہ کو اسی طرح پیش کروں جس طرح میں نے پیش کیا ہے کیونکہ مودودی حکومت کے ساتھ قتل و غارت کا تصور تشدد کی ایسی مضبوط آہنی زنجیروں سے جکڑا جا چکا ہے کہ خود ان زنجیروں کا خالق بھی اگر چاہے کہ انہیں کھول کر یا توڑ کر اس تصور کو الگ کر دے تو یہ اس کے قبضہ قدرت میں نہیں۔

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر!

۱؎ حقیقت جہاد صفحہ ۵۱

اس معذرت کے بعد اب میں وہ الفاظ نقل کرتا ہوں جو خود مودودی صاحب کے الفاظ ہیں تا کہ اگر میں نے کسی نتیجہ تک پہنچنے میں غلطی کھائی ہو تو احباب خود درستی فرمالیں:۔

''اگر آگے چل کر کسی وقت اسلامی نظام حکومت قائم ہو (خیال رہے کہ یہ مضمون ۱۹۴۲ء میں لکھا گیا تھا۔ناقل) اور قتل مرتد کا قانون نافذ کر کے ان سب لوگوں کو بزور اسلام کے دائرے میں مقید کر دیا گیا جو مسلمانوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اسلام کے پیدائشی پیرو قرار دیئے جاتے ہیں تو اس صورت میں بلاشبہ یہ اندیشہ ہے کہ اسلام کے نظام اجتماعی میں منافقین کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہو جائے گی جس سے ہر وقت ہر غداری کا خطرہ رہے گا۔''

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ لِلصَّوَابِ کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ

''جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔

اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں[۱]۔''

---

[۱] مرتد کی سزا صفحہ ۸۰،۸۱

اس اقتباس میں میرا بس اتنا تصرف ہے کہ نوٹس والے حصے کو تحریر سے پیوستہ لکھنے کی بجائے الگ پیرا بنا کر لکھا گیا ہے ورنہ مضمون اور الفاظ من و عن مودودی صاحب کے ہی ہیں۔ دیکھئے اس اصلاح خلق کے تصور میں کس قدر بچگانہ خوش فہمی پائی جاتی ہے۔ جیسے کوئی جنوں پریوں کی دنیا میں بس رہا ہو۔ حکومت نہ ہوئی الٰہ دین کا چراغ ہو گیا اور اصلاح خلق نہ ہوئی برف کے محل کی تعمیر ہو گئی لیکن اگر واقعی ایسا ہی ہے اور حکومت الٰہ دین کا چراغ ہی ہے اور اصلاح خلق برف ہی کا محل ہے جس کی تعمیر اس چراغ کے جنّ کے لئے مشکل نہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ اگر یہ چراغ کھو یا گیا؟ —— مجھے اس وقت انبیاء گذشتہ کا بہت خیال آ رہا ہے۔ کتنے ہی ان میں سے ایسے تھے جن کی ساری زندگی سخت مظلومی کی حالت میں کٹی۔ کاش ان کو بھیجتے وقت بھی خدا تعالیٰ یہ چراغ ان کے ہاتھوں میں تھما دیتا! کچھ ان کے دکھ دور ہوتے کچھ دنیا کے دلدّر۔ تاریکیاں چھٹ جاتیں اور ہر طرف ہدایت کا نور بکھر جاتا۔

یہ اقتباس پڑھنے کے بعد میرا یہ قیاس اور بھی قوی ہو گیا ہے کہ مودودی صاحب نے بچپن میں ضرور مارکس یا لینن کے اردو تراجم پڑھے ہیں اور روسی انقلاب کی تاریخ بھی دیکھی ہے جن سے ان کی طبیعت میں بہت ولولے پیدا ہوئے ہیں اور نئے نئے خیال دل میں آئے ہیں کہ اچھا یوں بھی ہو سکتا ہے؟ گذشتہ مصلحین تو پھر یونہی بھولے بھٹکے رہے یہ نہ کسی سے ہوا کہ ایک انقلابی پارٹی بنا لیتا جس کا نعرہ یہ ہوتا کہ ہم آئے تو اصلاح کرنے ہی ہیں مگر ''یہ سمجھنے کے لئے زیادہ غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ اصلاح خلق کی کوئی اسکیم بھی حکومت کے اختیارات پر قبضہ کئے بغیر نہیں چل سکتی''۔

''لہٰذا اس پارٹی کے لئے حکومت پر قبضہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں [1]۔''

چنانچہ ہم پہلے حکومت پر قبضہ کریں گے اس کے بعد تمہاری اصلاح کا کام شروع کریں گے اور تم دیکھو گے کہ حکومت ہاتھ آتے ہی ہم مار مار کر تمہارے دلوں کو کیسا صاف اور ستھرا کر دیتے ہیں۔ اس ذکر میں مجھے قرآن کریم اور مولانا کے درمیان ایک اور اختلاف یاد آ گیا۔ قرآن کریم تو فرماتا ہے کہ جب اصلاح کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو پھر سختی کا وقت شروع ہوتا ہے اور جب سختی کا وقت شروع ہو جاتا ہے تو پھر اصلاح کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ فرعون اٰمَنْتُ اٰمَنْتُ کہتا ڈوب گیا مگر

---

[1] حقیقتِ جہاد صفحہ ۵۹

اس کا ایمان قبول نہ ہوا۔اسی مضمون کو دوسری جگہ قرآن کریم یوں بیان فرماتا ہے:۔

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (المؤمن:۸۶)

لیکن جب وہ ہمارا عذاب دیکھ چکے تو ان کے ایمان نے انہیں کچھ بھی فائدہ نہ دیا۔ یہ خدا کی سنت ہے جو اس کے بندوں کے بارہ میں چلی آتی ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں کافر گھاٹے میں پڑ گئے۔

مودودی نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے اور اس نظریہ کے مطابق ڈنڈا پہلے ہے اصلاح بعد میں ہے۔ بلکہ حقیقی ایمان تو نصیب ہی اس وقت ہوتا ہے جب تلوار دلوں کے زنگ دور کر دے۔

یہ بحث تو خیر یونہی ضمناً نکل آئی ذکر یہ ہو رہا تھا کہ مودودی صاحب کے یہ تصورات کہاں سے آئے ہیں۔قرآن کریم سے اگر نہیں تو پھر کہیں سے تو آئے ہیں یا محض اپنی ہی ایجاد ہے؟ مشکل یہ ہے کہ ایجاد اسے ہم کہہ نہیں سکتے کیونکہ اس قسم کے اصلاحی تصورات پہلے ہی سے دنیا میں موجود ہیں۔ دیکھنا صرف یہ باقی تھا کہ کہاں موجود ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ تحریر کر دیا۔

اب آخر پر میں اس ردعمل کو لیتا ہوں جو مولانا کے مندرجہ بالا مجوزہ انقلابی اعلان کو پڑھ کر مختلف طبائع پر ہوسکتا ہے۔ایک تأثر تو وہی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کر دیا ہے یعنی انسان اسے زیادہ سے زیادہ ایک معمر بزرگ کا بچپن سمجھ سکتا ہے لیکن اس کے علاوہ میں سوچتا ہوں کہ بفرض محال اگر واقعی کوئی ایسا انقلابی دن کسی بدقسمت ملک نے دیکھا تو اس اعلان کو پڑھنے کے بعد لوگوں کا ردعمل کیا ہوگا۔

میرا خیال ہے موٹی طبیعت کے اجڈ قسم کے آدمی تو یہ اعلان پڑھ کر قاصد کے منہ پر ماریں گے کہ ''جاؤ جاؤ بڑے آئے ہو اصلاح کرنے والے کہیں کے۔ خدائی فوجدار بنے پھرتے ہو۔ تمہیں کس نے ٹھیکہ دیا ہے میرے مذہب کا؟ گھر جا کر بیٹھو اور اگر پھر اس طرف کا رخ کیا تو.....'' یہ وہی طبقہ ہے جس سے متعلق غالب کہتا ہے کہ ؂

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں کے

یہ طبقہ میں سمجھتا ہوں کہ مزید مہلت دیئے بغیر اسی وقت حکومت کے رجسٹروں میں ''کافر'' شمار کر لیا جائے گا۔

دوسرا ایک بڑا طبقہ میرے خیال میں ایسا ہوگا جو ایک سال سخت پریشانی کے عالم میں مبتلا رہنے کے بعد جِزبِز تو بہت ہوگا مگر آخر ''غیر مسلم'' ہونے کا اعلان کر دے گا۔ یہ مؤخر الذکر طبقہ وہ ہے کہ جس کا پہلا ردعمل عام طور پر جان بچانے کے خیال کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔ یہ وہی طبقہ ہے جس سے متعلق مودودی صاحب کو یہ خوف ہے کہ اگر فوری طور پر مرتد کی سزا قتل قرار دے دی گئی تو یہ فوراً منافق مسلمان بن جائے گا۔

اب رہا میرا ردعمل تو میں ابھی سے کھول کھول کر بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر تو اس اعلان میں ''غیر مسلم'' کے الفاظ سے آپ کی مراد یہ ہے کہ کوئی مسلمان آپ کے مخصوص عقائد کو ماننے سے انکار کر دے اور آپ کے استبداد کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہو۔ اگر کفر سے یہ مراد ہے کہ کوئی محبت کرنے والا اپنے محبوب آقا ؐ کی طرف پھینکے جانے والے اس مکروہ الزام کو ٹھوکریں مارے کہ آپؐ نے معجزات اور قوت قدسیہ کی ''ناکامی'' کے بعد تلوار کے زور سے اسلام کو پھیلایا تھا تو پھر مجھے آج ہی ''زمرہ کفار'' میں لکھ لیجئے۔ اور بخدا اگر اس کفر کی سزا سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جانے کی بجائے سولی پر لٹکایا جانا بھی ہو اور ایک ملک کا اقتدار ہی نہیں روئے زمین کی ساری طاقتیں بھی آپ کی مٹھی میں جمع ہو جائیں اور ہولناک مظالم کے بھتنے آپ کی انگلیوں اور پلکوں کے اشاروں پر ناچنے لگیں تو بھی میرا جواب یہی ہوگا کہ

بعد از خدا بعشق محمد مخمّرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

خدا تعالیٰ کے بعد میں محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں مخمور ہوں۔ اگر کفر یہی ہے تو خدا کی قسم! میں سخت کافر ہوں۔

قربان تست جان من اے یارِ محسنم
بامن کدام فرق تو کر دی کہ من کنم

اے میرے یار محسن! تجھ پر میری جان قربان ہو تو نے لطف و احسان میں کب مجھ سے کوئی فرق کیا ہے جو میں کروں۔

دَرکُوئے تو اگر سر عشّاق رازنند
اوّل کسے کہ لافِ تعشق زَند منم

ہاں اے میرے پیارے رسول! اگر تیرے کوچہ میں عشاق کا سر قلم کرنے کا ہی دستور ہو تو وہ پہلا شخص جو نعرہ عشق بلند کرے گا میں ہوں گا میں ہوں گا!

احرار علماء میدان عمل میں

ایک واقعاتی جھلک

مولانا مودودی کے اقتدار کا خواب تو کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا
مگر اُن کے نظریات کی تشہیر نے اور ان کے ہمنوا
بعض اور علماء کی آتش نوائیوں نے
آج سے چند سال پہلے پاکستان کو
اس خواب کی تعبیر
کی ایک جھلک
دکھائی تھی

فسادات کا مقصد اور طریق کار

بدقسمتی سے اس زمانہ کے بعض علماء کے دلوں میں ایسی سختی آ چکی ہے کہ وہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار رحمت اور شفقت، ہمدردی اور خلوص کے ان جذبات سے بالکل عاری ہو چکے ہیں جو ہر سچے مذہب کی روح رواں ہوا کرتے ہیں۔ یہاں نام بنام ایسے تمام علماء کے مذہبی تصورات کی تفاصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ یہ علماء جب ان ذاتی نظریات کو اسلام کی طرف منسوب کر کے لاعلم عوام میں پھیلاتے ہیں تو ہر طرف فتنہ وفساد اور شرانگیزی کا ایک طوفان بے تمیزی برپا ہو جاتا ہے۔

۱۹۵۳ء کا سال پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ ایک تاریک سال کے طور پر لکھا جائے گا۔ یہ وہی سال ہے جب کہ بعض ''دینی علماء'' کو اپنے دینی افکار کو عملی جامہ پہنانے کا خوب دل کھول کر موقع ملا تھا۔ ان کا ''اسلامی تصور'' جو پہلے ان کے سینوں کی کوٹھڑیوں میں مقید تھا اور ملکی قوانین کی زنجیروں میں پابند رہا کرتا تھا ان سب قیدوں سے آزاد ہو کر اور انسانیت اور تہذیب اور شرافت کے سب بندھن توڑ کر میدان عمل میں آیا۔ وہ پنجاب کے طول وعرض میں قریہ قریہ پھرنے لگا۔ ابتداءً چُھپ چُھپ کر دن کی روشنی سے گھبراتا ہوا، قانون کی زد سے بدن چراتا ہوا، پھر رفتہ رفتہ کھلتے کھلتے بے باک ہوتا چلا گیا اور مختلف قصبات اور شہروں کے گلی کوچوں میں آزادانہ دندنانے لگا یہاں تک کہ ۶/مارچ ۱۹۵۳ء کا وہ دن آ گیا جو سال کا سب سے تاریک دن تھا۔ اگر دن کے پردہ میں کبھی کوئی رات طلوع ہوئی ہے تو یہ وہی رات تھی جو دن کا لبادہ اوڑھے ہوئے چلی آئی تھی۔ اگر کبھی سورج نے نور کی بجائے ظلمات کی بارش کی ہے تو یہ وہی سورج تھا جو تاریکیاں بکھیرتا ہوا افق مشرق سے سر اٹھا رہا تھا —— یہ نور کی کرنیں نہیں تھیں بلکہ درد و اَلم کے تیر تھے —— یہ آسمان سے اترنے والی ضیاء بار شعاعیں نہیں تھیں

بلکہ ظلم وستم کی پرچھائیاں تھیں جو ایک جھوٹی چمک کے ساتھ سینوں اور دلوں کو برما رہی تھیں۔ یہ وہی منحوس دن تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے تحقیقاتی عدالت کے فاضل جج یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ

''اس دن کے واقعات کو دیکھ کر ''سینٹ بارتھولومیوڈے'' یاد آتا تھا[۱]۔''

''سینٹ بارتھولومیوڈے'' فرانس کی تاریخ کا وہ دن ہے جس کے ذکر سے آج بھی فرانس شرماتا ہے یہ وہ دن ہے جس کا چہرہ رات کی طرح سیاہ تھا۔ یہ وہ رات تھی جب ملک کے رومن کیتھولک مذہبی راہنماؤں اور بادشاہ وقت کی باہمی سازش سے پروٹسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھنے والے کمزور اور بے کس عیسائیوں کا ایک سفاکانہ قتل عام کیا گیا اور اس بے دردی سے ان کو مارا گیا کہ اہل فرانس ہی نہیں انسان بحیثیت مجموعی اس کے ذکر سے شرمانے لگتا ہے۔

اس دن کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر ولیم ہاوٹ اپنی کتاب ''ہسٹری آف پریسٹ کریفٹ ان آل ایجز'' میں لکھتے ہیں:۔

''قاتلوں کے شور، مظلوموں کی آہ وفغاں اور زخمیوں کی چیخ وپکار سے قیامت برپا تھی۔ مقتولوں کے جسم کھڑکیوں سے باہر پھینکے اور بازاروں میں سڑکوں پر گھسیٹے گئے اور اس سلسلہ میں بچوں اور بوڑھوں مردوں اور عورتوں میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا گیا۔ ان کے ناک کان وغیرہ کاٹے گئے اور یہ سب کچھ خدا کی عزت وعظمت کو قائم کرنے کے لئے کیا گیا''۔

چنانچہ فاضل ججوں کی رائے میں ۶ / مارچ ۱۹۵۳ء کا دن پاکستان کی تاریخ میں سینٹ بارتھولومیوڈے کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ:۔

''انسانوں کے بڑے بڑے مجمعوں نے جو معمولی حالات میں معقول اور سنجیدہ شہریوں پر مشتمل تھے ایسے سرکش اور جنون زدہ ہجوموں کی شکل اختیار کر لی تھی جن کا واحد جذبہ یہ تھا کہ قانون کی نافرمانی کریں اور حکومت وقت کو جھکنے پر مجبور کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی معاشرے کے ادنیٰ اور ذلیل عناصر موجودہ بدنظمی اور ابتری سے فائدہ اٹھا کر جنگل کے درندوں کی طرح لوگوں کو قتل کر رہے تھے۔ ان کی املاک کولوٹ رہے تھے اور

---

[۱] ۱۹۵۳ء کے فسادات کی تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۷۱

قیمتی جائداد کو نذر آتش کر رہے تھے محض اس لئے کہ یہ ایک دلچسپ تماشہ تھا (کیا اسی قسم کا تماشہ جیسے رومن امراء کالیسیم میں بیٹھ کر دیکھا کرتے تھے؟ ناقل) یا کسی خیالی دشمن سے بدلہ لیا جا رہا تھا۔ پوری مشینری جو معاشرہ کو زندہ رکھتی ہے پرزہ پرزہ ہو چکی تھی[۱]''۔

ایک مسلمان کے دل میں اس دن کے ہولناک واقعات پر نظر ڈالتے ہی معاً خیال پیدا ہوگا کہ جب اسلام بلا شبہ امن اور محبت کی تعلیم دیتا ہے تو پھر ایسا کیوں ہوا اور کیوں مذہبی راہنماؤں کے ایک مخصوص گروہ نے یہ قابل شرم حالات پیدا کر دیئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ قرآن کریم کی پیش کردہ مذہبی تاریخ سے ثابت کیا جا چکا ہے اس قسم کے قبیح افعال کبھی بھی مذہب کی خاطر نہیں کئے جاتے بلکہ مذہب کے نام پر کئے جاتے ہیں۔ مذہب تو ایک قربانی کا بکرا ہوا کرتا ہے جو بدنامی کے داغ تھوپنے کے لئے استعمال ہوتا ہے پس پردہ مقاصد ہمیشہ کبھی تو اقتدار کی ہوس اور کبھی لیڈری کی خواہش کبھی نام و نمود اور کبھی بغض اور حسد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء کے فسادات کی چھان بین کے بعد تحقیقاتی عدالت کے فاضل جج بھی اسی قطعی نتیجہ تک پہنچے کہ احرار علماء نے مذہب کے نام پر جو غیر مذہبی افعال کئے ان کی اغراض بھی کچھ اور تھیں۔ چنانچہ اسی ذکر میں وہ لکھتے ہیں:۔

''احرار کے رویہ کے متعلق ہم نرم الفاظ استعمال کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کا طرز عمل بطور خاص مکروہ اور قابل نفرین تھا اس لئے کہ انہوں نے ایک دنیاوی مقصد کے لئے ایک مذہبی مسئلہ کو استعمال کر کے اس مسئلہ کی توہین کی[۲]''۔

''ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کریں اور پاکستان کے استحکام کے متعلق عوام کے اعتماد کو نقصان پہنچائیں۔ اس شورش کا مقصد واضح ہے کہ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر فرقہ وار اختلاف کی آگ کو بھڑکایا جائے اور مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کر دیا جائے[۳]''

---

[۱] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۹۳

[۲] رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۲۷۷، ۲۷۸

[۳] رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۱۵۰

پس پاکستان کے دو منصف مزاج فاضل ترین ججوں کے فیصلہ کے مطابق جس تک وہ نہایت غور و خوض اور چھان بین کے بعد پہنچے:۔

''اسلام ان کے لئے ایک حربہ کی حیثیت رکھتا تھا جسے وہ کسی سیاسی مخالف کو پریشان کرنے کے لئے جب چاہتے بالائے طاق رکھ دیتے اور جب چاہتے اٹھا لیتے۔ کانگرس کے ساتھ سابقہ پڑنے کی صورت میں تو ان کے نزدیک مذہب ایک نجی معاملہ تھا اور وہ نظریہ قومیت کے پابند تھے لیکن جب وہ لیگ کے خلاف صف آراء ہوئے تو ان کی واحد مصلحت اسلام تھی جس کا اجارہ انہیں خدا کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ ان کے نزدیک لیگ اسلام سے بے پرواہ ہی نہ تھی بلکہ دشمن اسلام بھی تھی۔ ان کے نزدیک قائداعظم ایک کافر اعظم تھے[۱]۔''

پھر فرماتے ہیں:۔

''یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اب احراریوں نے احمدیوں کے خلاف نزاع کو اپنے اسلحہ خانہ سے ایک سیاسی حربے کے طور پر باہر نکالا اور جو واقعات اس کے بعد پیش آئے وہ اس امر کی بیّن شہادت ہیں کہ وہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے نہایت فہیم و چالاک ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ اگر عوام کے جذبات کو احمدیوں کے خلاف برانگیختہ کر دیں گے تو کوئی ان کی مخالفت کی جرأت نہیں کرے گا اور ان کی اس سرگرمی کی جتنی بھی مخالفت کی جائے گی اسی قدر وہ ہر دل عزیز اور مقبول عام ہو جائیں گے اور بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہو گیا کہ ان کا یہ مفروضہ بالکل صحیح تھا[۲]۔''

پس بلا شبہ یہ ثابت ہے کہ ازمنہ گزشتہ کی طرح ۱۹۵۳ء میں بھی جو فساد برپا کیا گیا وہ مذہب کے نام پر تو ضرور تھا مگر مذہب کی خاطر نہ تھا اور حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک دین اس سے کلیۃً بری الذمہ ہے۔

یہاں یہ اہم سوال اٹھتا ہے کہ آخر یہ مخصوص راہنما کس طرح ایک قلیل التعداد فرقہ کے

---

[۱] رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۲۷۲، ۲۷۳

[۲] رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۲۷۵

خلاف اس قدر خوفناک آتش غیظ وغضب بھڑکانے میں کامیاب ہو گئے کہ فاضل ججوں کو اس پر ایک نظر ڈالنے سے سینٹ بارتھولومیوڈے کی یاد آ گئی۔ تو اس اہم سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بعینہ اسی طرح ہوا جس طرح ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور تاریخ مذاہب کا ہر خونی باب جس میں مذہب کے نام پر خون کی ہولی کھیلنے والوں کے طریق کا تذکرہ موجود ہے، اس موضوع پر بڑی وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے۔ اس طریق کار کی ایک جھلک تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ میں بھی نظر آتی ہے۔ فاضل جج اسی طریق کار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''احمدیوں کے خلاف معاندانہ اور بے بنیاد الزام لگائے گئے ہیں کہ باؤنڈری کمیشن کے فیصلہ میں ضلع گورداسپور اس لئے ہندوستان میں شامل کر دیا گیا کہ احمدیوں نے ایک خاص رویہ اختیار کیا اور چوہدری ظفر اللہ خاں نے جنہیں قائداعظم نے اس کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس پیش کرنے پر مامور کیا تھا خاص قسم کے دلائل پیش کئے لیکن عدالت ہذا کا صدر (سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان اور حال وزیر قانون مرکزیہ مملکت پاکستان) جو اس کمیشن کا ممبر تھا اس بہادرانہ جدوجہد پر تشکر و امتنان کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے جو چوہدری ظفر اللہ خاں نے گورداسپور کے معاملہ میں کی تھی۔ یہ حقیقت باؤنڈری کمیشن کے کاغذات میں ظاہر و باہر ہے اور جس شخص کو اس مسئلہ سے دلچسپی ہو وہ شوق سے اس ریکارڈ کا معائنہ کر سکتا ہے۔ چوہدری ظفر اللہ خاں نے مسلمانوں کی نہایت بے غرضانہ خدمات سرانجام دیں ان کے باوجود بعض جماعتوں نے عدالت تحقیقات میں ان کا ذکر جس انداز میں کیا ہے وہ شرمناک، ناشکرے پن کا بیّن ثبوت ہے[1]''۔

ان علماء کی طرف سے احمدیت پر بس یہی ایک ''بے بنیاد الزام'' نہیں لگایا گیا بلکہ جھوٹے پراپیگنڈے کا ایک طوفان بے تمیزی برپا کر دیا گیا اور ہر حادثہ اور ہر سازش کو جماعت احمدیہ پر تھوپا جانے لگا۔ جنگ شاہی کے دردناک حادثہ کی ذمہ داری بھی احمدیوں پر ڈالی گئی اور راولپنڈی کی سازش بھی احمدیوں کی طرف ہی منسوب کی گئی! خان لیاقت علی خان کے ناپاک قتل کا الزام بھی مظلوم احمدیوں

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۲۰۹

کے سر ہی دھرا گیا اور کبھی انہیں ہندوستان کا جاسوس کہا گیا اور کبھی ان پر گندے اخلاقی الزام لگائے گئے اور کبھی پاکستان کا غدار بتایا گیا اور افتراء اور ظلم کی کوئی حد نہ رہنے دی۔ یہاں تک کہ احمدیوں پر یہ طومار بھی باندھا گیا کہ ہم نعوذ باللہ اپنے محبوب ترین نبی، اپنے مقدس آقا حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے ہیں اور آپؐ کو گالیاں دیتے ہیں مگر منصف جج صاحبان نے جب الزامات کی گہری چھان بین کی تو صورت حال کو بالکل برعکس پایا۔ چنانچہ جنگ شاہی کے حادثہ سے متعلق وہ مسٹر انور علی ڈی۔آئی۔جی۔سی۔آئی۔ڈی کا یہ تبصرہ نقل فرماتے ہیں کہ:۔

''یہ بیان بالکل جھوٹ ہے کہ جنگ شاہی یا لاہور چھاؤنی کے ہوائی حادثوں میں مرزائیوں کا ہاتھ تھا کیونکہ جنگ شاہی کے حادثہ میں جو اشخاص ہلاک ہوئے ان میں جنرل شیر خان تھے جو خود مرزائی تھے۔ احرار کی تقریریں صرف زہریلی ہی نہیں بلکہ ناشائستہ اور مکروہ ہیں[1]۔''

راولپنڈی سازش سے متعلق فاضل ججوں نے لکھا:۔

''مولوی محمد علی جالندھری نے ۱۵/اپریل ۱۹۵۱ء کو منٹگمری کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ان کے پاس اس امر کی تحریری شہادت موجود ہے کہ راولپنڈی سازش سے احمدیوں کا تعلق موجود ہے، یہ بلاشبہ مہمل بات تھی''۔

پھر فرماتے ہیں:۔

''یہ واضح طور پر نفرت کی تلقین تھی اور نفرت بھی نہایت مکروہ قسم کی کیونکہ نہ تو مولوی محمد علی ایسے اہم تھے کہ ایسی شہادت ان کے قبضہ میں ہوتی اور نہ کوئی تحریر اس کے بعد مقدمہ سازش کے ٹربیونل کے سامنے پیش کی گئی لیکن اس قسم کی شبہ انگیز خبر نہایت آسانی سے لوگوں کے دماغوں میں گھر کر لیتی ہے[2]''۔

پھر خان لیاقت علی خان کے قتل کا الزام احمدیوں پر دھرتے ہوئے:۔

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۲۱

[2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۳۲۹

''قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے یہ کہہ دیا کہ قائد ملت کے قتل میں (جو گزشتہ اکتوبر میں ہوا تھا) احمدیوں کا ہاتھ تھا[۱] ''۔

مگر اس الزام کا بودا پن ایسا ظاہر و باہر تھا کہ فاضل ججوں نے اس پر محض یہ طنزیہ فقرہ چست کرنا ہی کافی سمجھا کہ:۔

''ان لوگوں کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ یہ تمام قومی مصائب کی تحقیقات کے گمشدہ سلسلے دریافت کرنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں[۲]۔''

پھر مظفر گڑھ کی ایک تقریر میں ایک نہایت مشہور احراری لیڈر نے جو اب اس جہان سے کوچ کر چکے ہیں احمدیوں پر بہتان باندھا کہ:۔

''ایک احمدی جاسوس ایک شخص گوپال داس کی معیت میں گرفتار کیا گیا ہے اور میں نے حکومت کو اس سلسلہ میں عمدہ معلومات مہیا کی ہیں[۳]۔''

اس الزام کو اپنی رپورٹ میں درج فرما کر فاضل جج تحریر فرماتے ہیں:۔

''کیا عام سیدھے سادے لوگ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ بزرگ جو اپنی کُہن سالی کے بوجھ سے زیر بار ہونے کے باوجود شمشیر کی طرح تیز ہے گوپال داس کے ساتھی کے متعلق ایسی کہانی تصنیف کرے گا جس کو سچائی سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں؟ اگر یہ سچ ہو تو کیا اس سے ''غداروں'' کے خلاف شدید جذبات مشتعل نہ ہو جائیں گے؟ اگر آپ یہ جانتے ہوئے کہ اس تقریر کی بناء جھوٹ پر ہے اس کو نظر انداز کر رہے ہیں تو یہ مقرر کے سفید بالوں کا احترام تو شائد ہو لیکن آپ اس مرض سے تغافل کر رہے ہیں جو اس نے آپ کی قوم میں پھیلا دیا ہے[۴]۔''

چنانچہ بڑے بڑے سفید ریش احرار علماء سٹیجوں پر چڑھ کر جھوٹ پر جھوٹ بولنے لگے اور

۱۔ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۳۶

۲۔ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۳۳۵

۳۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۳۳

۴۔ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۳۳۰

الزام پرالزام تراشنے لگے اور:۔

''جتنا وقت گزرتا گیا تقریروں کا لہجہ بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔۔احرار نے اپنی پوری توجہ احمدیوں کی بدگوئی پر مرتکز کر دی اور نہایت شرمناک دشنام طرازی کا آغاز کر دیا[1] ''۔

احرار کی جن تقاریر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسٹر انور علی نے نہایت شرمناک دشنام طرازی کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں ان کا پورا تعارف اس مختصر تعریف میں نہیں ہوسکتا بلکہ حقیقۃً وہ ایسی انسانیت سوز ہیں کہ ایک عام انسان سے متعلق بھی اگر وہ الفاظ استعمال کئے جائیں جو مقدس بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ سے متعلق کئے گئے تو کوئی شریف انسان انہیں سننے کی تاب نہیں لاسکتا اور تمام احرار لیڈر بشمولیت مولوی محمد علی جالندھری و ماسٹر تاج الدین انصاری و ابوذر بخاری اس دشنام طرازی اور بدکلامی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگے اور تعجب ہے کہ پھر بھی اسی نبیوں کے سردار کی جانشینی کا دعویٰ کرتے تھے جس کی زبان کوثر وتسنیم کی طرح پاک اور صاف اور شریں تھی اور جس کی تعلیم یہ تھی کہ:۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام:۱۰۹)

''(خبردار) ان معبودان باطلہ کو (بھی) گالیاں نہ دو جنہیں یہ لوگ خدا کے سوا شریک ٹھہرا رہے ہیں مبادا یہ اپنی جہالت سے خدا کو برا بھلا کہنے لگ جائیں''۔

مگر یہاں تو کوئی باطل معبود بھی مقابل پر نہیں تھا بلکہ اسلام کا ایک ایسا فدائی تھا جس نے اپنی ساری زندگی خدمت اسلام میں صرف کر دی اور جس کا ''قصور'' صرف اتنا تھا کہ اس نے خدا کے فرمان کے مطابق مہدی اور مسیح ہونے کا دعویٰ کیا اور جس کا فخر صرف یہ تھا کہ وہ احمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہے اور اسی کے دین کی اشاعت کے لئے مبعوث ہوا ہے۔ ہاں یہ ننگِ انسانیت شرمناک دشنام طرازی اسی مرزائے قادیانؑ سے متعلق کی گئی جس کی جان عشق محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم میں گداز رہا کرتی تھی اور جو کبھی تو سوز محبت سے بے قرار ہو کر اپنے محبوب آقاؐ سے یوں گویا ہوا کرتا تھا کہ:۔

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۲۰ بحوالہ مسٹر انور علی ڈی۔آئی۔جی۔سی۔آئی۔ڈی

جانم فدا شوَد برَہ دین مصطفیٰؐ

این است کامِ دل اگر آید مُیسّرم

میرے دل کی ایک ہی تمنا ہے کہ اگر مجھے موقع میسر آئے تو میری جان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی راہ میں فدا ہو۔

اور کبھی دردفراق سے بے تاب ہوکر اپنی قلبی کیفیات کا اظہار یوں کرتا تھا کہ:۔

اُنْظُرْ اِلَیَّ بِرَحْمَۃٍ وَ تَحَنُّنٍ

یَا سَیِّدِیْ اَنَا اَحْقَرُ الْغِلْمَانِ

یَا حِبِّ اِنَّكَ قَدْ دَخَلْتَ مَحَبَّۃً

فِیْ مُھْجَتِیْ وَ مَدَارِکِیْ وَ جَنَانِ

مِنْ ذِکْرِ وَجْھِكَ یَا حَدِیْقَۃَ بَہْجَتِیْ

لَمْ أَخْلُ فِیْ لَحْظٍ وَّ لَا فِیْ اٰنٖ

جِسْمِیْ یَطِیْرُ اِلَیْكَ مِنْ شَوْقٍ عَلَا

یَا لَیْتَ کَانَتْ قُوَّۃُ الطَّیَرَانٖ

(ترجمہ)''میرے پیارے! میری طرف ایک رحمت اور شفقت کی نظر ڈال۔ دیکھ میرے آقا! میں تو ایک ادنیٰ غلام ہوں۔

اے میرے محبوب! تو اپنی محبت کے ساتھ میری روح اور میرے دل و دماغ میں سرایت کر گیا ہے۔

اے میری مسرتوں کے باغ! میں تیری یاد سے کسی آن اور کسی لحظہ بھی خالی نہیں رہتا۔ گویا میرا جسم ایک شوق غالب کے ساتھ تیری سمت اڑا چلا جارہا ہے۔ اے کاش اڑنے کی طاقت ہوتی! اے کاش اڑنے کی طاقت ہوتی۔!!''

اسی خاتم النبیینؐ کے فدائی اور آپؐ کے متبعین کے متعلق احرار راہنماؤں نے فحش کلامی کو اپنی انتہاء تک پہنچا دیا اور ہر وہ گندی گالی جو پنجاب کی گلیوں میں سنائی دی جاسکتی ہے آپ کو دی

جانے لگی یہاں تک کہ فاضل ججوں نے جب ان کے بعض اقتباسات احرار اخبارات اور پولیس رپورٹوں میں ملاحظہ کئے تو ایک خاص تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے وہ یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ:۔

''ایک اردو اخبار ''مزدور'' ملتان سے شائع ہوتا ہے جس کا ایڈیٹر سید ابوذر بخاری ہے جو مشہور احراری لیڈر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا بیٹا ہے اس نے اپنی اشاعت ۱۳ رجون ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون شائع کیا جس میں جماعت احمدیہ کے امام کے متعلق عربی خط میں ایک ایسی پست اور بازاری بات لکھی کہ ہماری شائستگی ہمیں اس کی تصریح کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر یہ الفاظ احمدی جماعت کے کسی فرد کے سامنے کہے جاتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ کسی کی کھوپڑی توڑ دی جاتی تو ہمیں اس پر ذرا بھی تعجب نہ ہوتا جو الفاظ استعمال کئے گئے وہ پرلے درجے کے مکروہ اور مُبتذِل ذوق کا ثبوت ہے اور ان میں اس مقدس زبان کی نہایت گستاخانہ تضحیک کی گئی ہے جو قرآن مجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے[۱]۔''

پس یہی وہ طریق کار ہے جس کے ذریعے ان راہنماؤں نے مغربی پاکستان کے طول وعرض میں احمدیوں کے خلاف مخالفت کی ایک آگ بھڑکا دی اور خود جلتے ہوؤں کا تماشا کرنے کے لئے کنارے بیٹھ رہے اور جیسا کہ دنیا کا دستور ہے مسلمان شرفاء کی اکثریت اگرچہ سخت نفرت اور ناپسندیدگی کے ساتھ اس ''خدمت اسلام'' کو دیکھتی رہی مگر سخت مجبور و ناچار تھی کیونکہ یہ شرفاء جانتے تھے کہ ''علماء'' ایک لمبے عرصہ کی کھلی بدزبانی کے زور سے (جسے یہ ''زور خطابت'' کا نام دیتے تھے) عامی جذبات میں سخت ہیجان پیدا کر چکے ہیں اور آج ہر وہ شخص جو اس ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کرے گا خود بھی اسی ظلم و استبداد کا نشانہ بن جائے گا۔ یہ کوئی فرضی خوف نہیں تھا بلکہ عملاً ایسا ہوتا بھی رہا۔ چنانچہ ایک موقع پر جبکہ ایک غیر احمدی منصف مزاج پولیس افسر نے ایک ہنگامہ آرائی کو روکنے کی کوشش کی تو اس کے خلاف بھی افتراء پردازی اور اشتعال انگیزی کا ایک ہنگامہ گرم کر دیا گیا اور پولیس کے خلاف یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ:۔

''پولیس نے رضا کاروں کو منتشر کرتے ہوئے قرآن مجید کی توہین کی۔ اس کو ٹھوکریں

---

[۱] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۸۷

لگائیں۔اس کے اوراق پھاڑ دیئے اور ایک چھوٹے سے لڑکے کو ہلاک کر دیا۔دہلی دروازہ کے باہر جلسہ ہوا جس میں ایک لڑکا پیش کیا گیا جو اپنے ہاتھوں میں قرآن مجید کے چند پھٹے ہوئے اوراق لئے ہوئے تھا۔اس نے بیان کیا کہ میں کلام الٰہی کی اس توہین کا عینی گواہ ہوں۔ایک مولوی نے (غالباً مولوی محمد یوسف صاحب) یہ اوراق ہاتھ میں لے کر حاضرین کو دکھائے اور ایک نہایت پر تشدد تقریر کی جس سے غصہ سے بھرا ہوا مجمع اور بھی زیادہ غضبناک ہو گیا۔واقعہ کی یہ بناوٹی کہانی ہر جگہ جوش میں بھرے ہوئے لوگوں کا موضوع گفتگو بن گئی اور چند ہی گھنٹوں کے اندر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی جس سے پولیس کے خلاف غیظ و نفرت کے جذبات برانگیختہ ہو گئے [1]''۔

اور صرف جذبات ہی برانگیختہ نہیں ہوئے بلکہ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ کے مطابق:۔

''اسی غلط افواہ سے اشتعال کے نتیجہ میں سید فردوس شاہ ڈی۔ایس۔پی کی وفات کا حادثہ ہوا۔'' ''ان پر چھروں اور لاٹھیوں سے حملہ کر کے وہیں ہلاک کیا گیا۔سید فردوس شاہ کے جسم پر ۵۲ زخموں کے نشان تھے [2]''۔

یہ تھا ان مذہبی راہنماؤں کا طریق کار جو خدا تعالیٰ کے سب سے سچے بندے اور راستبازوں کے سردار حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے لے کر اور آپ کے قرآن کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے دنیا میں جھوٹ کی اشاعت کر رہے تھے اور صرف احمدی ہی ان کی مشق ستم کا نشانہ نہیں بنے بلکہ ہر وہ شریف النفس اور جرأت مند پاکستانی بھی ان کی افتراء پردازی کا شکار ہونے لگا جس نے ان کی اس بے راہ روی کے خلاف آواز اٹھائی اور ہر وہ پولیس کا سپاہی جوان کی راہ میں حائل ہونے لگا ان کی اینٹوں کا نشانہ بن گیا اور یہ صورت حال اتنی شدید ہو گئی کہ شرفاء میں اس کے خلاف آواز اٹھانے تک کی سکت باقی نہ رہی۔چنانچہ فاضل جج اپنی رپورٹ میں گوجرنوالہ کی صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

۱؎ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۵۸

۲؎ رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۱۶۰

''جب ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ٹرین کو روانہ کر دینے کی دوسری کوشش کی تو ان پر حملہ کر دیا گیا جس سے دو چار اور پولیس مین زخمی ہو گئے جن میں ایک انسپکٹر بھی تھا اسی دن شام کو پانچ ہزار کے ایک جوش میں بھرے ہوئے ہجوم نے ریلوے اسٹیشن سے کچھ فاصلہ پر سندھ ایکسپریس کو روک لیا۔سپرنٹنڈنٹ پولیس چھ پیادہ کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر اس مقام پر پہنچے مگر ان پر اینٹوں اور پتھروں کی بوچھاڑ کی گئی۔ چونکہ اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا اور اگر ہجوم منتشر نہ ہوتا تو تشدد پر اتر آتا اور ٹرین کے مسافروں کی پریشانی کا باعث ہوتا۔اس لئے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے تین پیادہ کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ بارہ راؤنڈ ہوا میں چلائیں۔اس سے ہجوم منتشر ہو گیا اور کسی قسم کا جانی نقصان نہ ہوا اور اس کے بعد معززین شہر کا ایک اجلاس ریلوے اسٹیشن پر طلب کیا گیا۔اگرچہ ان میں سے ہر ایک اس غنڈے پن کی مذمت کر رہا تھا لیکن کسی قسم کی عملی امداد کرنے پر آمادہ نہ تھا کہ مبادا وہ کافر یا مرزائی قرار دیا جائے[1] ''۔

یہ خوف کوئی فرضی خوف نہیں تھا اور عملی امداد کرنے کی سزا بڑی سنگین تھی ۔ چنانچہ تحقیقاتی عدالت کے جج اسی قسم کے ایک جرأت مندانہ اظہار شرافت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اسی شام کو ایک غیر احمدی عبدالحی قریشی کو جس نے ہجوم کو تشدد سے منع کیا تھا زدوکوب کیا گیا اور اس کا گھر لوٹ لیا گیا[2] ''۔

یہی وجہ تھی کہ بعض ایسے غیر جانبدار اخبارات بھی جو اس غیر اسلامی ہنگامہ کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اس کے خلاف جرأت مندانہ اظہار رائے سے گریز کرتے رہے۔ چنانچہ جب صورت حال کو قابو سے نکلتے دیکھ کر حکومت نے آخر کچھ مضبوط اقدام کرنے کا فیصلہ کیا اور ہوم سیکرٹری نے بعض اخبارات کے ایڈیٹروں کو بلوا کر انہیں اس امر پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ نفاذ قانون کے سلسلہ میں حکومت کی کوششوں کی تائید کریں تو مسٹر حمید نظامی نے جو اس وقت نوائے وقت کے ایڈیٹر تھے۔

۱؎ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۸۲

۲؎ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۷۷

''یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر وہ اپنے اخبار میں اس خیال کا اظہار کریں گے تو حکومت اور مسلم لیگ کے منظورِ نظر اخبارات اپنی اشاعت بڑھانے کے لئے سب سے پہلے انہیں احمدی قرار دے کر نشانۂ ملامت بنائیں گے[۱]۔''

پس یہی وہ خوف تھا جس نے پاکستان کے طول و عرض میں شرفاء کی آواز کا گلا گھونٹ رکھا تھا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ یہ خوف غالب آتا چلا گیا اور احتجاج کی آواز دبتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا کہ صوبہ سرحد کے سوا تقریباً تمام مغربی پاکستان احرار کے چنگل میں آ گیا اور '' خدمت اسلام '' کے حیرت انگیز کارنامے دنیا کو دکھائے جانے لگے۔ صوبہ سرحد ان کی زد سے محض اس لئے بچا کہ اس صوبہ کی حکومت ایک مضبوط حکومت تھی اور قانون کے آہنی شکنجہ کی پکڑ بہت سخت تھی۔ اور مشرقی بنگال اس سے اس لئے محفوظ رہا کہ اس حصہ ملک کے علماء اور عوام اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے عام طور پر مذہبی معاملات میں گالی گلوچ اور بازاری تقریروں کو بالکل پسند نہیں کرتے بلکہ الاّ ماشاء اللہ دلائل کی دنیا تک اپنے اختلافات کو محدود رکھنے کے عادی ہیں۔

---

[۱] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۳۷۳

''خدمت اسلام'' کی بعض جھلکیاں

تمام انبیاءؑ اوران کی پاک جماعتوں نے صداقت کو پھیلانے کے لئے اپنے اپنے رنگ میں جدوجہد کی ہے اوران کی کوششوں کا ذکر تمام کتب مقدسہ میں آج تک محفوظ ہے خصوصاً قرآن کریم نے ان کے طریق تبلیغ اوران ذرائع کی نہایت ہی صاف اور پاکیزہ تصویر کھینچی ہے جنہیں وہ دنیا کو ہدایت اورنور کی طرف بلانے کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں اوراس تصویر کشی میں ایک ایک نقش ایسا روشن اوراجاگر کر دیا ہے کہ گویا آج ان مقدس لوگوں کو ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اشاعت دین میں مصروف دیکھ رہے ہوں۔آپ ان سب کے حالات پر ایک نگاہ ڈالئے اور پھر اس ''خدمت اسلام'' کی طرف بھی ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھئے جسے ۵۳۔۱۹۵۲ء کی ''تحریک ختم نبوت'' کے بانی مبانی خدا تعالیٰ اوراس کے بزرگ ترین رسول خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کے نام پر بجا لا رہے تھے۔تحقیقاتی عدالت کے فاضل جج اپنی رپورٹ میں ان کوششوں کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

''۲۵؍جولائی ۱۹۵۲ء کو قصور میں نماز جمعہ کے بعد ایک جلسہ ہوا جس کے مقررین میں ایک عالم شاہ بدمعاش بھی تھا۔اس کے بعد چھاتی پیٹتا ہوا ایک جلوس نکالا گیا ایک آدمی نعرہ لگاتا تھا ''ظفر اللہ کنجر'' اور دوسرے آواز ملا کر چلّاتے تھے ''ہائے ہائے''۔ اس کے بعد عالم شاہ اورایک اورآدمی کہیں سے ایک گدھی لے آئے جس پر ''بیگم ظفر اللہ'' کے الفاظ لکھ دیئے۔پھر اس پر ایک آدمی کو سوار کرایا اوراس آدمی کو جوتیوں کا ہار پہنا دیا۔یہ شخص ''ٹاپ ہیٹ'' سر پر رکھے تھا جس پر غلام احمد مرزا لکھا تھا۔یہ جلوس احمدیوں کے ایک کارخانہ کے سامنے رکا اور پندرہ منٹ تک یہ نعرہ لگاتا رہا ''مرزائیت کو تباہ کرو۔

''ظفر اللہ کنجر''۔ ''ظفر اللہ کتا''۔ ''ظفر اللہ سوَر[1]''۔

خدارا اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ ہمارے مقدس آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق تبلیغ سے اس طریق کو کوئی دور کی بھی نسبت ہے؟

ہر سچا مسلمان بلکہ ہر سلیم الفطرت انسان کا دل یہ گواہی دے گا کہ نہیں یقیناً نہیں۔ یقیناً نہیں۔ یقیناً نہیں۔ظلمت کو بھی نور سے اتنی دور کی نسبت نہیں جتنی اس طریق تبلیغ کو ہمارے آقاؐ کے پاکیزہ طریق سے تھی۔ پھر دل کیوں خون کے آنسو نہ روئے یہ سوچ کر کہ اسلام کا یہ مذاق کسی دشمن اسلام نے نہیں اڑایا بلکہ ان لوگوں نے اڑایا جو علمائے اسلام ہونے کے دعویدار تھے۔ چنانچہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسٹر انور علی ڈی۔ آئی۔ جی نے لکھا کہ:۔

''مذہبی جنونیوں اور مولویوں نے طاقت پکڑ لی ہے اور غنڈے بھی میدان میں کود پڑے ہیں[2]''۔

کیا اس کی کوئی ایک مثال بھی تاریخ انبیاءؑ سے مل سکتی ہے کہ خدا تعالیٰ کے انبیاءؑ اور ان کے حامیوں نے ''غنڈوں'' کی حمایت حاصل کر کے خدمت دین کے لئے کوئی اس نمونہ کا جلوس نکالا ہو؟ کیا مذہب کے تصور کی اس سے زیادہ تحقیر ممکن ہے؟.....

مگر یہ تو اس قسم کے سینکڑوں مظاہروں میں سے صرف ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا علماء کی تقریریں زیادہ اشتعال انگیز ہوتی چلی گئیں اور بے شمار سینوں میں آتش غیظ وغضب بھڑکنے لگی اور وہ کثیر التعداد لاعلم عوام جنہیں اپنے آقاؐ کے اسوہ حسنہ کی کچھ بھی خبر نہ تھی ان علماء کے بتائے ہوئے طریق پر ''خدمت اسلام'' میں مصروف ہو گئے اور ہر اس نیک رسم کی بیخ کنی کی جانے لگی جسے دنیا میں قائم کرنے کے لئے عرب کے افق سے وہ بے مثال نور کا سورج ابھرا تھا۔ چنانچہ سیالکوٹ کا اسی قسم کا ایک مشتعل ہجوم:۔

''منڈیروں پر سے اینٹیں پھینکنے لگا جن کی وجہ سے پولیس نے ان گاڑیوں کے پیچھے پناہ لی جو دارالشہابیہ کے سامنے سڑک پر کھڑی تھیں۔ خشت باری کی وجہ سے ڈسٹرکٹ

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۳۵۶

[2] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۲۵۶

مجسٹریٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے چوٹیں آئیں۔ایک سب انسپکٹر پولیس کے چھرا گھونپ دیا گیا[1]''۔

اور اسی شہر میں ایک اور مقام پر:۔

''تیسرے پہر ہجوم نے ایک اے ایس آئی اور ایک کانسٹیبل پر یورش کی۔اے ایس آئی کا ریوالور اور کانسٹیبل کی بندوق چھین لی اور ان کی وردیاں جلا دیں۔ایک اور پیادہ کانسٹیبل کسی کیس کی مملوکات لئے جا رہا تھا اس پر حملہ کیا گیا اور مملوکات چھین لی گئیں۔دو احمدیوں کے چھرا گھونپ دیا اور تین دوسرے احمدیوں کے مکان لوٹ لئے گئے[2]''۔

جب انسان ان حالات کو پڑھتا ہے تو بے اختیار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایک اے۔ایس۔آئی اور ایک کانسٹیبل پر یورش سے اسلام نے کس میدان میں فتح حاصل کی؟ اور ان دو احمدیوں اور اس انسپکٹر پولیس کے خون سے جن کو چھرا گھونپا گیا اسلام کی رگوں میں کون سا تازہ خون دوڑنے لگا؟ اور اس لوٹے ہوئے مال سے جو ان تین احمدیوں کے گھروں سے لوٹا گیا اسلام کے خزانوں میں آخر کیا اضافہ ہوا؟ اور کیا اسلام کا خدا واقعی عرش سے اس ماجرا کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا جو دارالشہابیہ کی گلیوں میں گزرا؟ اور وہ پتھر جو دارالشہابیہ کے بالا خانوں سے چند مسلمان پولیس افسروں پر برس رہے تھے کیا واقعی رضائے الٰہی کے جذب کرنے والے پتھر تھے؟ ایک انسان یہ سوچنے پر بے اختیار مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا نعوذ باللہ سیّد ولد آدمؐ کا طریق تبلیغ بھی اسی طریق کے مشابہ تھا؟ مگر اس مقام پر انسان کا فکر طائف کی گلیوں سے ٹکرا کر ناکام و نامراد واپس آ جاتا ہے اور اسے اس نظارہ کی کوئی نظیر بھی آنحضرتؐ کی مقدس زندگی میں نظر نہیں آتی۔اگر وہ کچھ دیکھتا ہے تو یہی کہ خدا کا وہ سب سے پیارا رسولؐ نہتہ اور یکہ وتنہا، ایک بے پناہ عزم اپنے دل میں لئے اپنے ربّ پر توکل کرتے ہوئے عرب کی سنگلاخ ترین زمین پر آباد ایک بدقسمت بستی میں اس امید پر داخل ہوتا ہے کہ شاید یہ لوگ اس آسمانی پیغام کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں جسے مکہ کے سرکش سرداروں نے ٹھکرا دیا تھا۔اس کے ہونٹوں پر کوئی سخت کلمات نہیں، اس کے ہاتھوں میں کوئی پتھر نہیں، اس کی جھولی

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۷۶

[2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۱۷۸

سنگریزوں سے خالی ہے۔اس کے ہونٹوں پر محبت میں ڈوبی ہوئی ابدی صداقتوں اور توحید کا لازوال پیغام ہے اور اس کی جھولی آسمانی رحمتوں سے بھرپور ہے۔ وہ یہ منادی کرنے آیا ہے کہ اپنے ربّ پر ایمان لے آؤ۔ وہ انہیں نیک باتوں کا حکم دینے کے لئے آیا ہے اور بری باتوں سے رکنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ انہیں بڑے پیار سے نصیحت کرتا ہے کہ ظلم اور تعدّی سے باز آجاؤ اور غصب اور چوری اور لوٹ مار سے پرہیز کرو مگر اس رسولؐ کی طرف سے توحید اور سلامتی اور امن کے اس پیغام کو سن کر اس بدبخت بستی کے بدقسمت سردار عبد یالیل کی غیرت جوش میں آجاتی ہے اور وہ اپنے خداؤں کی یہ ہتک برداشت نہیں کرسکتا اور اپنی آنکھ کے اشاروں سے گلیوں کے اوباش لونڈے اس کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ ان کے ہونٹوں پر غلیظ گالیاں ہیں۔ ان کے ناپاک ہاتھوں میں پتھر ہیں اور ان کی جھولیاں سنگریزوں سے بھری ہوئی ہیں مگر اس مقدس رسولؐ کا عزم غیر متزلزل ہے اور اپنے انداز تبلیغ سے سرمو بھی انحراف نہیں کرتا۔ ان بے رحم پتھروں کی چوٹوں سے اس کا انگ انگ دکھنے لگتا ہے اور اس کے دل کے دکھ کا سوائے خدا کے اور کوئی راز دان نہیں۔ اس کا خون طائف کی گلیوں میں بے محابا بہنے لگتا ہے مگر آسمانی آقا کے سوا کسی کو اس خون کی خبر نہیں جو اس کے دل سے اس غم سے ٹپک رہا تھا کہ کہیں یہ ظالم لوگ اس ظلم سے ہلاک نہ ہو جائیں۔ اور ان سب دکھوں اور گالیوں اور صدموں کے جواب میں جو وہ ان ننگ انسانیت ظالموں کے ہاتھوں سے اٹھاتا ہے اس کے دل اور اس کے دماغ اور اس کی زبان پر ایک ہی دعا جاری اور طاری و ساری ہے کہ

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ

اے میرے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے دے کہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔

یہ تھا وہ طریق تبلیغ جسے آپؐ نے اختیار کیا۔ مخالف اپنے طریقِ ظلم و ستم پر جمے رہے اور آپؐ اپنے طریق رحم و شفقت پر قائم۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَ لِیَ دِیْنِ کی ایک عجیب تصویر نظر آتی تھی۔ ظالموں پر تو یہ وحشت سوار تھی کہ جس طرح بن پڑے آپؐ کو ہلاک کر دیں اور آپؐ کو یہ غم تھا کہ کہیں ظالم ہلاک نہ ہو جائیں۔ آپؐ نے صرف فلاح اور کامرانی کی طرف زبانی دعوت پر ہی اکتفاء نہ کی بلکہ اس راہ میں دن بھر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد ساری ساری رات اپنے

خدا کے حضور رو رو کر کاٹ دی کہ اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ !! یہاں تک کہ اس دردمند دل کے گہرے سوز و گداز کو دیکھ کر خدا تعالیٰ بھی عرش سے پکار اٹھا:۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعراء:۴)

کہ اے میرے عزیز ترین بندے! کیا تو اس غم میں اپنی جان ہلاک کر دے گا کہ یہ ایمان نہیں لاتے؟''

یہ تھا وہ طریق تبلیغ جو آپؐ نے اختیار کیا اور یہی وہ دعائیں تھیں اور یہی آپؐ کے سینے کے وہ پر پیچ و تاب غم تھے جو ایک دن عرب کی سرزمین پر خوش خبریاں بن کر ظاہر ہوئے اور بشارتیں بن کر فارس کے افق پر چمکے!

جھوٹ کہتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ میرے آقاؐ کا یہ طریق تبلیغ ضائع گیا اور بہتان باندھتا ہے وہ شخص جس کے نزدیک اس کی سب دردمندانہ دعائیں فضا میں پراگندہ ہو گئیں اور دور مظلومیت رائیگاں گیا اور اگر کچھ کام آیا تو تیر کام آئے اور تلواروں نے فائدہ دیا۔ کاش کہ وہ یہ جانتا کہ گو تیر ہی کام آئے مگر نیم شبی دعاؤں کے وہ تیر جو کبھی خطا نہیں جاتے اور تلواروں ہی نے فائدہ دیا مگر صبر و استقلال، شرافت و نجابت، براہین اور معجزات کی ان تلواروں نے جن کی دھار قلوب کی اتھاہ گہرائیوں تک مار کرتی ہے۔ کہاں ہیں وہ علماء جو تاریخ اسلام سے واقفیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور کہاں ہیں وہ خدام دین جو خدمت اسلام کی تمنائیں لئے ہوئے ہیں؟ کیا کوئی ہے ان میں جو خدمت دین کی ان کٹھن وادیوں کو طے کر سکے جنہیں ہمارے آقاؐ اور اس کے سچے عشاق کی جماعت نے تقریباً چودہ سو برس پہلے طے کر کے دکھایا تھا؟ کیا کوئی ہے ان میں جو رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریق تبلیغ کو اختیار کر سکے جس کا اختیار کرنا ہزار مشقتوں اور لاکھ مصائب و آلام کو دعوت دینا ہے اور اس کی پیروی میں صبر و استقلال، حلم و رشد، شرافت و نجابت اور رحمت و شفقت کے وہ اعلیٰ نمونے دکھائے جنہوں نے پُر وحشت صحرائی دلوں کو بھی رام کر لیا تھا اور جس کے دام محبت میں طائف کا عبد یالیل بھی آخر اسیر ہو کر رہا۔ جس کے دشمن فدائی بن گئے اور خون کے پیاسے غلامانِ در

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

مگر یہ عجیب بد قسمتی کا دور ہے کہ ''حریف مئے مرد افگن عشق'' تو کوئی نہیں ہوتا ہاں اس کیف و مستی کے سب خواہاں ہیں جو صرف اس مئے عشق ہی میں مضمر ہے اور وہ نہیں جانتے کہ اٹل قوانین قدرت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

میں اپنے مضمون کے تسلسل کو توڑ کر کہیں اور نکل آیا ہوں۔ دراصل آج سے چودہ سو برس پہلے کے انداز تبلیغ کی دلنشینی نے مجھے اپنے اندر ایسا جذب کر لیا کہ میں کچھ دیر کے لئے اسلام کے اس شاندار ماضی میں محو ہو گیا جس کی یاد میرا سرمایہ حیات ہے اور بھول گیا کہ میں تو اپنے گرد و پیش کی، اس ملک کی اور آجکل کی باتیں کر رہا تھا اور زیر نظر وہ طریقہ تبلیغ تھا جس کا نظارہ ہم نے ۱۹۵۳ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ذکر ان قافلہ ہائے جور و ستم کا ہو رہا تھا جو ہمارے دلوں کو پامال کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اور جس کی بعض جھلکیاں کچھ اس طرح ہیں:۔

''ایک بڑا ہجوم اس مسجد کی طرف جا رہا تھا اس کو راستے میں روک لیا گیا۔ کمشنر کی ہدایت کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہجوم کو منتشر ہونے کا حکم دیا لیکن وہ افسروں پر پل پڑا۔ پولیس کو اس ہجوم پر لاٹھی چارج کا حکم دیا گیا جس کے جواب میں آس پاس کے مکانوں سے اینٹیں برسائی گئیں۔ مسٹر خلیل الرحمٰن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سر پر شدید زخم آیا اور پولیس کی ایک گاڑی توڑ پھوڑ دی گئی[1]''۔

اور صرف اینٹیں برسانے پر ہی اکتفاء نہیں کی گئی بلکہ علماء کے بتائے ہوئے تبلیغ اسلام کے طریق پر عمل پیرا ہوتے ہوئے:۔

''۷ رمارچ کو موضع نند پور میں شورش پسندوں کے ایک ہجوم نے ایک شخص محمد حسین کو یہ سمجھ کر قتل کر دیا کہ وہ احمدی ہے۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ متوفی کے ایک دشمن نے اس کو قتل کرانے کے لئے چال چلی تھی[2]''۔

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۷۸

[2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۱۸۳

پھران مسجدوں کونذرآتش کرنا بھی تبلیغ اسلام کا ایک جزء سمجھا گیا جو محض اس لئے تعمیر کی گئی تھیں کہ ان میں خدائے واحد ویگانہ کی پرستش کی جائے۔ چنانچہ راولپنڈی میں:۔

”۶؍مارچ کو لیاقت باغ میں ایک اور جلسہ منعقد ہوا۔ایک ہجوم نے جلسہ کے بعد منتشر ہوکرمری روڈ کارخ کیا اور احمدیوں کی ایک مسجد کو اور ایک چھوٹی موٹر کار کو آگ لگادی[1]“۔

جب علماء ہی یہ درس دیتے ہوں کہ خدمت اسلام کا بہترین ذریعہ لوٹ مار اور قتل وغارت ہے تو عوام الناس ثواب کمانے کے لئے ایسے منفرد مواقع بھلا کب ہاتھ سے جانے دیتے ہیں۔ایسی خدمت کا موقع بھلا روز روز کہاں میسر آتا ہے کہ دنیا بھی سنور جائے اور عاقبت بھی۔ چنانچہ مسجد اور کار کو آگ لگانے کے بعد:۔

”اسی شام کو کچھ دیر بعد لوٹ مار اور آتش زنی کے مزید واقعات بھی رونما ہوئے۔ احمدیہ کمرشل کالج،نور آرٹ پریس اور پاک ریسٹوران شہر کے مختلف حصوں میں واقع تھے۔لیکن لوگ زبردستی ان میں گھس گئے اور انہوں نے مختلف اشیاء کو لوٹنے،جلانے اور تباہ کرنے کی کوشش کی۔ایک غیر احمدی نوجوان نور آرٹ پریس میں ملازم تھا اس کو احمدی سمجھ کر چھرا مارا گیا اور وہ اسی زخم کی وجہ سے ہلاک ہوگیا[2]“۔

پھر وہ وقت آیا کہ یہ ”تبلیغ اسلام“ کا جذبہ بے پناہ اور بے اختیار ہوگیا اور نظم وضبط کے ہر دائرہ کو توڑ ڈالا۔احمدی اور غیر احمدی میں کوئی تمیز باقی نہ رہی اور جاندار اور بے جان کا فرق مٹ گیا۔تخریب کی ہر کاروائی اسلام کی فتح متصور ہونے لگی حتیٰ کہ اسی مقدس نام پر بلا امتیاز مذہب معصوم بیبیوں کو بے آبرو کیا گیا۔لائل پور میں:۔

”دس ہزار کے ایک ہجوم نے ضلع کی کچہریوں پر حملہ کردیا۔کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ مجسٹریٹوں کو عدالتیں بند کرنے پر مجبور کردیا اور پھر ڈپٹی کمشنر کے گھر میں گھس گئے۔

۱؎ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۸۵

۲؎ رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ ۱۸۵

لائل پور کاٹن ملز کی ایک خوردہ فروشی کی دکان لوٹ لی گئی‘‘۔ (خدا جانے اس کے کتنے معصوم بچوں نے بھوک سے بلک بلک کر وہ رات گزاری ہوگی۔ کیا یہ سب خدا تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر کیا گیا۔ ناقل)

’’ریل کی پٹڑی توڑ دی گئی اور تین ٹرینیں ریلوے اسٹیشن کے قریب روک لی گئیں۔ ریلوے سٹیشن پر دکانوں اور مسافروں کو لوٹا گیا۔ ٹرین میں بعض عورتیں بے آبرو کی گئیں اور ایک کیبن مین کو بری طرح زخمی کیا گیا[1]‘‘۔

اور آسمان نے سخت حیرت و استعجاب اور دکھ کے ساتھ یہ نظارہ دیکھا کہ تبلیغ اسلام کا یہ بھی ایک طریق ہے!!!

اوکاڑہ بھی اس طرز ستم میں لائل پور سے کچھ پیچھے نہیں تھا جہاں:۔

’’تین ہزار کا ایک ہجوم ریلوے سٹیشن پر پہنچا اور اس نے ڈاؤن پاکستان میل کو تین گھنٹے تک روکے رکھا۔ ہجوم نے ڈبوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں اور ٹرین کو روکنے والی ویکیوم کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور مسافر عورتوں کو بے آبرو کیا گیا[2]‘‘۔

ان واقعات کو نقل کرتے ہوئے جو میرے دل کی کیفیت ہے میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ وہ الفاظ میرے قبضہ قدرت میں نہیں جو مختلف متلاطم اور متقابل جذبات کے یکجا ہونے کی وجہ سے میرے سینہ کے ہیجان کا نقشہ کھینچ سکیں مگر میں ہر منصف دل سے سوال کرتا ہوں جو دنیا کے کسی بھی مقدّس رسول کی طرف منسوب ہوتا ہو کہ کیا کسی ایک رسول کی روح بھی اس تصور سے خوش ہو سکتی ہے کہ اس کے تقدّس کے نام پر ’’عورتوں کو بے آبرو‘‘ کیا جائے؟.....

میرے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت ظلم توڑے گئے ہیں مگر شائد یہ ظلم ان سب ظلموں سے بڑھ کر ہے!!!

مجھے ان عوام پر غصہ نہیں آتا جن کے ہاتھوں سے یہ ظلم سرزد ہوئے اور ان مسجدوں کے

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۸۸

[2] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۱۹۰

جلانے والوں سے کوئی کدّ نہیں۔ چھرا گھونپنے والوں کو بھی میرا دل معاف کرسکتا ہے اور بے اختیار اپنے مطاعؐ کی پیروی میں دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمَنَا فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ

''اے اللہ! ہماری قوم کو ہدایت دے کہ یہ نہیں جانتے''

اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ شعر میرے جذبات کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے

اے دل تو نیز خاطرِ ایناں نگاہ دار

کاخر کنند دعویٰ حبّ پیمبرمؐ

''اے دل تو ان کی خاطر بھی ملحوظ رکھ کہ آخر یہ لوگ میرے ہی رسولؐ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔''

مگر بڑے ہی بھاری عزم کی ضرورت ہے ان علماء کو معاف کرنے کے لئے جو سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو غلط راستوں پر چلانے کے ذمہ دار ہیں اور ان نیک مقاصد کی بیخ کنی کرتے ہیں جن کا پودا اس مقدس رسولؐ نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔

ہاں ایک تصور ہے جو ہر غصہ کو ٹھنڈا کر رہا ہے اور ایک یاد ہے جو ہر جذبہ نفرت کو کالعدم کررہی ہے۔ وہ تصور رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِیْن کے پُررحمت دل کا تصور ہے اور وہ یاد فتح مکہ کے دن کی یاد ہے!

یہ تصور اور یہ یاد ہر نفرت اور ہر غصہ کو گداز کر کے ایسے جذبات دردو غم میں تبدیل کر دیتی ہے کہ دل سے آہوں کا دھواں اٹھنے لگتا ہے اور دعائے نیک کے سوا کوئی خواہش باقی نہیں رہتی۔ خدا جانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل سے یہ دعائے نیک کس شدت اور کس کرب کے ساتھ اٹھتی ہوگی کہ عرش کا خدا بھی پکار اٹھا!

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (الشعراء:۴)

کیا تو اپنی جان اس غم میں ہلاک کر لے گا کہ یہ ایمان نہیں لاتے!!!

اجتماع ضدین

(ان مخصوص متشدّد راہنماؤں کے نظریات ایک عجیب وغریب اجتماع ضدین کا منظر پیش کرتے ہیں۔ زود رنجی اور سخت بے حسی، وہمی خطرات کا پیچھا اور حقیقی خطرات سے لاپروائی ان کی شخصیت کے نمایاں خدوخال ہیں!)

گزشتہ ابواب کے مطالعہ سے قارئین پر بخوبی واضح ہو چکا ہوگا کہ مذہب کے نام کو بعض خودغرض مذہبی راہنما جس بے دردی سے استعمال کرتے ہیں شاید ہی کوئی اور نام اس بے دردی سے استعمال ہوا ہو۔ بایں ہمہ مذہب کو ہرگز اُن مظالم اور خونریزیوں کا ذمّہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا جو اس کے نام پر کی جاتی رہی ہیں اور آج بھی کی جاتی ہیں۔ کیا دیانت کے نام پر اگر بددیانتی کی جائے تو دیانت کے پاکیزہ چہرہ پر کوئی داغ لگ سکتا ہے؟

دراصل انفرادی یا قومی اعمال کسی فرد یا قوم کے ذہنی رجحانات اور قلبی کیفیات کے آئینہ دار ہوا کرتے ہیں۔ یہ جو ہم اپنے گردوپیش میں معاشرہ کی تصویر دیکھتے ہیں یہ ہمارے ہی تصورات اور اخلاق کے خدوخال ہیں اور بحیثیت قوم ہمارے باطن کا وہ عکس ہے جو آئینہ قدرت ہمیں دکھا رہا ہے۔ جس قدر کسی قوم کا باطن پاک وصاف ہوگا اور جیسے جیسے قومی اخلاق پر صفاتِ الٰہی کا رنگ چڑھتا جائے گا اُسی قدر یہ تصویر زیادہ جاذبِ نظر اور دلکش بنتی چلی جائے گی۔ یہ تصویر خودبخود قوم کے اخلاق بننے اور بگڑنے کے ساتھ ساتھ بنتی اور بگڑتی رہتی ہے اور قومی اَخلاق کے بننے اور بگڑنے میں مذہبی علماء کے اخلاق کا غیر معمولی دخل ہوا کرتا ہے۔ بڑی ہی قابلِ رشک اور خوش قسمت ہوتی ہے وہ قوم جس کے راہنماؤں کے اَخلاق تقوی اللہ کی مضبوط اور غیر متزلزل چٹان پر قائم ہوں اس کے سوا ہر دوسری بنیاد ناقابل اعتماد ہے اور وہ قوم بڑی ہی بدقسمت ہوا کرتی ہے جس کے راہنماؤں کی اَخلاقی اور نظریاتی عمارت اس چٹان پر قائم نہ ہو اور وہ عدل اور انصاف، امانت اور دیانت، وسیع

حوصلگی اور حِلم کی اعلیٰ صفات سے عاری ہو چکے ہوں۔

کیا اس سے بڑھ کر بھی کسی مذہبی قوم پر کوئی ادبار آ سکتا ہے کہ اس کے راہنما تنگ نظر اور بے حوصلہ ہو جائیں اور اپنے باہمی اختلافات میں میزانِ عدل سے کام لینا ترک کر دیں؟ جن نظریات کو قائم کرنے کے وہ دعویدار ہوں خود اپنے اعمال سے انہی کی بیخ کنی کر رہے ہوں۔ اگر ایسا ہو تو اس قوم کے دن لکھے جاتے ہیں۔ ایسی قوم یقیناً بدقسمت ہوتی ہے اور ان کے علماء ایسی روحانی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں جو دن بدن بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ ان کے دل و دماغ کو ایک گھن سا لگ جاتا ہے جو اندر ہی اندر ان کی صلاحیتوں کو چاٹ جاتا ہے اور تمام نظامِ عقل وخرد کو مفلوج کر دیتا ہے۔ خود غرضی ان کی پہچان ہوتی ہے اور تنگ حوصلگی طرۂ امتیاز۔ ہر دوسرے شخص کے عقائد پر یہ خدائی فوجدار بن کر نگران ہو جاتے ہیں اور خدا کی غلامی کے نام پر یہ دنیا کو اپنے نظریات کی غلامی پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت سخت متضاد خصوصیات کی حامل ہوتی ہے اور ایک طرف تو کسی دوسرے فرقہ کے ائمہ اور بزرگان سے متعلق سخت گندی اور ننگِ انسانیّت زبان استعمال کرنے سے بھی ان کے نزدیک کسی کی دِل آزاری نہیں ہوتی اور دوسری طرف اُن باتوں پر بھی بھڑک اٹھتے ہیں جو ان کے لئے باعث انبساط ہونی چاہیے تھیں۔ چنانچہ یہ بے دھڑک مخالف فرقوں کے بزرگان پر گند اچھالتے ہیں بلکہ ان کی مقدس ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے متعلق بھی نہایت ناپاک حملے کرنے سے باز نہیں آتے اور یومِ آخرت کو بالکل بھلا بیٹھتے ہیں۔ اگرچہ نقل کفر کفر نباشد کا مقولہ درست ہے مگر پھر بھی میری بساط سے باہر ہے کہ میں اس زبان کے چند نمونے یہاں پیش کر سکوں جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں۔ اگر قارئین کو ذاتی طور پر کسی ایسی تقریر سننے کا یا ایسی کتاب پڑھنے کا تلخ تجربہ نہیں ہوا اور وہ اس بارہ میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں تو تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ میں وہ اس ''مذہبی'' طرزِ کلام کے چند نمونے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ہر چند کہ فاضل ججوں کا قلم بھی اس قبیل کی تمام ہرزہ سرائیوں کو نقل کرنے کا متحمل نہیں ہو سکا۔

بہرکیف ایک طرف تو ان کا احساس اتنا کند ہو جاتا ہے کہ ہر قسم کی شدید ترین دل آزاری اور بہتان طرازی ان کے نزدیک ایک اظہارِ واقعی بن جاتا ہے اور وہ عام انسانی شرافت سے بھی بہت

نیچے اتر آتے ہیں اور دوسری طرف ان کے جذبات اس قدر زود حس اور بھڑ کیلے ہو جاتے ہیں کہ بعض فرقوں کی مسجدوں کی تعمیر بھی برداشت نہیں ہوتی اور جلتی پر تیل کا کام کر جاتی ہے۔ پھر ان کی آتش غضب نہیں ٹھنڈی ہوتی یہانتک کہ وہ مسجد نظر آتش یا مسمار نہ کر دی جائے اور یہاں اور وہاں سمندری یا راولپنڈی یا سرگودھا میں ایک یا دو مسجدیں گرا کر یا جلا کر وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کی ایک عظیم الشان خدمت سرانجام دی ہے اور ان کے دلوں میں اس فتح عظیم کے نقارے بجنے لگتے ہیں۔

ایک طرف تو وہ ان تمام خطرات سے یکسر آنکھیں موند لیتے ہیں جو ایک مدت سے اسلام کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور اندرونی طور پر بھی اور بیرونی طور پر بھی اس شدت سے اس مظلوم مذہب پر حملہ آور ہیں کہ ان کے خیال سے بھی ایک صاحب دل مسلمان کی راتوں کی نیند حرام ہو جانی چاہئیے اور دوسری طرف بعض وہمی اور غیر موجود خطرات کے پیچھے اس جوش وخروش کے ساتھ پڑے ہوئے ہیں جیسے کوئی بھوت کے تصور کے پیچھے لٹھ لے کر بھاگ رہا ہو اور کہے کہ میں دم نہیں لوں گا اور چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک کہ اے میرے تصور کے بھوت! میں لاٹھیوں سے مار مار کر تیرا کچومر نہ نکال دوں۔ چنانچہ وہ روزمرہ کی زندگی میں اپنے شہروں میں، اپنے قصبات میں، اپنے گاؤں کی گلیوں میں بلکہ ان گھروں میں بھی دیکھتے ہیں جن میں وہ رہتے ہیں کہ بد دیانتی قوم میں اس طرح سرایت کر گئی ہے جیسے سمندر میں ڈوبے ہوئے سوت کے کپڑے میں پانی (سوائے ان کے جو تقویٰ اللہ کا لباس اوڑھے ہوئے ہوں اور ہر قسم کے شیطانی نفوذ سے پاک ہوں) وہ رشوت ستانی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن پاتے ہیں اور چوری اور ڈاکہ اور ظلم اور بدنظری اور بے حیائی کو کُھل کھیلتا ہوا دیکھتے ہیں اور اسلام پر یہ ظلم ان کی نظروں کے سامنے ان کی سماعت کی حدود میں ان کے آگے اور ان کے پیچھے، ان کے دائیں اور ان کے بائیں توڑے جاتے ہیں۔ وہ مسجدوں کو ویران پاتے ہیں اور دلوں کو خدا تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد سے خالی دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ مذہبی دنیا نہایت سرعت کے ساتھ لامذہبیت کی طرف دوڑی چلی جارہی ہے اور شوریدہ سَری اور دہریت کا سیلاب ہے کہ اُمڈتا چلا آتا ہے۔ وہ مذہب کی سرزمین کو کناروں سے کاٹتا ہوا اور گھاؤ ڈالتا ہوا لحظہ بلحظہ آگے بڑھ رہا ہے اور اہل مذہب کی زمین چاروں طرف سے دن بدن سمٹتی اور تنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔

وہ یہ سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن ناموسِ مذہب اور احیائے دین کے لئے رگِ حمیّت جوش میں نہیں آتی اور امت محمدیہ کی اخلاقی تعمیرِ نو کے لئے وہ ذرہ بھی درد دل محسوس نہیں کرتے۔ محض خشک فتووں پر اکتفاء ہے۔ حالانکہ یہ گھُن وہ گھُن ہے جس نے اسلام کے جسم کو ایک کِرم خوردہ لکڑی کی طرح کھوکھلا کر رکھا ہے!

حق تو یہ تھا کہ وہ ان خوفناک بیماریوں سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے مستعد اور کمر بستہ ہو جاتے اور اس راہ میں اپنی جان، مال، وقت اور عزت کی کچھ پرواہ نہ کرتے ـــــ سخت کرب اور اضطراب اور گہرے دکھ اور جذبۂ ہمدردی کے ساتھ وہ لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے۔ وہ اپنے آقاؐ کی امت کے بیمار افراد سے کم از کم ویسی ہی محبت کا اظہار کرتے جیسی ایک ماں اپنے بیمار بچے سے کرتی ہے۔ دیکھو وہ اس کو بچانے کیلئے ہر اِمکانی کوشش کرتی ہے کبھی ڈاکٹروں کی طرف دوڑتی ہے، کبھی حکیموں کے دروازے کھٹکھٹاتی ہے اور کبھی اپنے بچے کو چھاتی سے لگا کر اس کی بلائیں لیتی ہے۔ اور اگر ایسی ہی نادار ہو کہ علاج کے لئے کوئی پیسہ نہ رکھتی ہو تو فاقے کاٹ کر یا بھیک مانگ کر بھی اپنے جگر گوشے کے لئے دوا لے آتی ہے اور دن کی تھکی ہاری راتوں کو بھی چین سے نہیں سوتی اور آنکھ لگ بھی جاتی ہے تو خوف و ہراس سے بار بار ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے اور بچہ پر ہراساں اور ترساں نگاہیں ڈالتی ہے اور جب اس کی بے قراری کو دیکھ کر کسی پہلو قرار نہیں آتا تو روتی اور گڑ گڑاتی ہوئی سجدے میں جا گرتی ہے کہ اے میرے آقا! اے میرے آقا! مجھ سے تو کچھ بن نہیں پڑتا، میں تو بے بس ہوئی جاتی ہوں، تو ہی فضل فرما اور میرے بلکتے ہوئے لال کو شفا دے دے!!! یہی جذبۂ ہمدردی ہے جو قوموں کی شفایابی کا موجب بنتا ہے اور اکھڑے ہوئے سانسوں کو قائم کر دیتا ہے، جو اخلاق کی بجھتی ہوئی شمعوں کو پھر روشنی بخشتا ہے اور مذہب کے مٹتے ہوئے نقوش کو پھر سے اجاگر کر دیتا ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کوئی بھی تو چارہ نہیں۔

یہی وہ جذبۂ محبت ہے جو بنی نوع انسان کی ہمدردی میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ کے سینوں میں موجزن رہا اور یہی وہ جذبۂ محبت ہے جو عرب کے ایک اُمّی نبیؐ کے دل سے رحمتوں کا سرچشمہ بن کر پھوٹا اور ایک عالم کو سیراب کر گیا۔ اور وہ آسمانی پانی یہی ہے جس نے صدیوں کے

گندے دلوں کی میل کو اس طرح الگ کر دیا جیسے بھٹی گندے کپڑوں سے میل کاٹ کر الگ پھینک دیتی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس طرف کسی کی نگاہ نہیں اٹھتی اور دل سخت ہو گئے۔ درد میں ڈوبی ہوئی تقریروں کی جگہ خشمگی فتووں نے لے لی اور سینہ دعا سے اس طرح خالی ہو گیا جیسے وہ گھونسلہ جسے پرندہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گیا ہو۔ کچھ تو وہ ہیں جو ناصح ہونے کا دعویٰ ہی ترک کر بیٹھے اور ''خدائی فوجدار'' بن کرامت کی اصلاح کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور کچھ وہ ہیں جو ناصح تو رہے مگر نصیحت کے اطوار بدل دیئے۔ سخت کلامی ان کا شیوہ ہو گیا اور جبر و تشدد ذرائع اصلاح۔ اور کسی نے پلٹ کر نہ دیکھا کہ کیا کبھی پہلے بھی ان راہوں پر چل کر بنی نوع انسان کی اصلاح ہوئی تھی؟

افسوس کہ دراصل اسلام کی سچی محبت ہی باقی نہیں رہی ورنہ ممکن نہ تھا کہ یہ دردناک منظر دیکھ کر علماء کے دل پگھل نہ جاتے۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے کہ چاروں طرف مذہب کی روح پسپا ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور لامذہبیت کی موت دلوں پر قبضہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے مگر علماء ان حالات سے صرفِ نظر کئے ہوئے اسی ڈگر پر چلے جاتے ہیں اور اپنی روشِ پارینہ کو بدلنے کے لئے تیار نہیں۔ انہیں کون سی زبان سمجھائے کہ روحانیت کی دنیا میں سخت کلامی اور تشدد کا سکہ نہ کبھی پہلے چلا تھا، نہ آج، نہ کبھی آئندہ چلے گا لیکن برا ہو اس کم مائیگی کا کہ روحانیت کی دنیا میں چلنے والے سکوں سے تو ان کا دامن ہی تہی ہے۔ ہر ایسی بے لوث خدمتِ اسلام ان پر دو بھر ہے جس کے سرے پر اقتدار، ذاتی منفعت یا نام و نمود کے طُعمے نہ لگے ہوں اور ہر مشکل کام پر ان کا اجتماع مشکل ہے۔ آج ایک بانگ تکفیر کے سوا اور کوئی بانگ انہیں میدانِ عمل میں ایک ہاتھ پر جمع نہیں کر سکتی!

<u>بیرونی حملے</u> یہ تو اندرونی حملوں کا حال ہے اور بیرونی حملوں کی یہ کیفیت ہے کہ چھوٹے چھوٹے کمزور مذہب بھی جنہیں ہم دیر ہوئی مردہ سمجھ کر پیچھے چھوڑ آئے تھے وہ گویا مردوں میں سے جی اٹھے ہیں اور بپھرے ہوئے شیروں کی طرح اسلام پر حملے کر رہے ہیں۔

عیسائیت کو ہی دیکھ لو کہ جس کے عقائد کی بنیاد سخت کمزور اور کھوکھلے مفروضوں پر مبنی ہے اور جس کے دعاوی متضاد اور باہم دگر دست بگریباں ہیں اسلام کے خلاف دنیا کے کونے کونے میں اعلانِ جنگ کر رہی ہے۔ گیدڑ تو شیروں کی طرح دندناتے پھرتے ہیں اور شیر گیدڑوں کی طرح کھوہوں

میں دبکے بیٹھے ہیں۔عیسائی پادریوں نے اسلام اور اسلام کے مقدّس رسولؐ کے خلاف اتنی کتابیں شائع کی ہیں کہ دنیا بھر میں مسلمانوں کی بھی اتنی تعداد نہیں ہے اور وہ ہر زاویہ سے ہر تیکھے ہتھیار کے ذریعہ اسلامی عمارت کی ایک ایک اینٹ پر ضربیں لگا رہے ہیں۔ وہ آنحضرتؐ کی مقدس ذات پر بھی حملہ آور ہیں اور امہات المؤمنین پر بھی سخت ناپاک حملے کرتے ہیں۔ وہ اسلام کو ایک جابر اور قاہر مذہب کے طور پر پیش کرتے ہیں اور قرآن کریم کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کے دل کی گھڑی ہوئی باتیں قرار دیتے ہیں۔ان کا علمِ تاریخ بھی اسلام پر حملہ آور ہے اور علمِ فلسفہ بھی۔ان کا علمِ منطق بھی اسلام پر حملہ آور ہے اور علمِ طبیعات بھی اور ان کی تہذیب نے اسلامی تہذیب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں مگر افسوس ہے کہ ہمارے علماء کو اس خطرہ پر بھی کوئی آگاہی نہیں اور اگر ہے تو جواب کی طاقت نہیں پاتے سوائے اس کے کہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ اس ملک میں ان کافروں کی تبلیغ کو بزور بند کر دیا جائے۔ یہ نہیں سوچتے کہ آخر کہاں کہاں اور کس کس ملک میں ان کی تبلیغ کو بزور بند کروا سکیں گے اور مغربی تہذیب اور علوم وفنون کے چور دروازوں پر وہ کون سے پہرے بٹھائیں گے جو بزور شمشیر شکوک کے ریلے کو مسلمانوں کے دل تک پہنچنے سے روک دیں۔اور کیا صرف دفاع پر ہی اسلام کے احیاء کی ضمانت لی جاسکتی ہے؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ ابھی تک دنیا کی بھاری اکثریت اسلام کے نام سے بے بہرہ ہے۔ابھی تو برّصغیر ہندو پاکستان میں ہی اسلام کو غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ابھی تو ہمیں امریکہ کو بھی اسلام کا پیغام دینا ہے اور روس کو بھی، چین کو بھی اور جاپان کو بھی۔ایشیا کے اکثر ممالک بھی ابھی تک اسلام سے کوسوں دور ہیں اور افریقہ کی بھی کثیر آبادیوں کو اسلام کی خبر نہیں اور براعظم آسٹریلیا میں تو مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔

پس کیا اسلام کے عالمگیر غلبہ کے لئے ضروری نہیں کہ ان دور دراز پھیلی ہوئی وسیع آبادیوں کو اسلام کا پیغام پہنچایا جائے اور ان جہل اور لاعلمی کے تہہ در تہہ پردوں کو اٹھا دیا جائے جو دنیا کی آنکھ اور اسلام کے حسین چہرہ کے درمیان صدیوں سے حائل پڑے ہیں۔اور مغرب کے دل کو بھی فتح کر کے اپنے آقاؐ کے قدموں میں لا ڈالا جائے اور مشرق کے دل کو بھی۔

اور کیا اسلام کی سربلندی کے لئے بس یہی کافی ہے کہ اپنی مسجد اور قباؤں کی محدود حدود میں

بیٹھ کر عبادت کے تمام ظاہری ارکان کو ایک غیر روحانی سختی کے ساتھ ادا کر دیا جائے؟

مگر افسوس کہ ان بیرونی خطرات کی طرف بھی ان علماء کی آنکھ نہیں اٹھتی اور اندرونی خطرات کی طرف بھی نہیں اور اگر اٹھتی ہے تو سخت تھکی اور ہاری ہوئی مایوس نگاہ یا ایک ایسی لاتعلق خالی نظر جو کسی خطرہ کے ادراک کی طاقت نہ رکھتی ہو۔ یہ مطلق اس امر کا خیال نہیں کرتے کہ آج جبکہ اسلام کو سخت اندرونی اور بیرونی خطرات درپیش ہیں جو اسلامی جسم کے ایک ایک عضو، ایک ایک بند، ایک ایک جوڑ پر چوٹیں لگا رہے ہیں اور کتنے ہی وحشی درندے ایک عرصہ گذر گیا کہ اسلام کی رگِ جان سے خون چوس رہے ہیں ان کے نزدیک صرف ایک ہی خطرہ اسلام کو لاحق ہے —— یہ خطرہ فرقہ ہائے اسلام میں پائے جانے والے مختلف عقائد کا خطرہ ہے۔ کہیں تو شیعہ عقائد کا خطرہ بن کر ظاہر ہوتا ہے کہیں سنّی عقائد کا ہوّا بن کر نکلتا ہے کبھی یہ بریلوی عقائد کے وحشت ناک حلیے میں نظر آتا ہے کبھی یہ اہلحدیث یا اہل قرآن کے عقائد کے ڈراؤنے خواب بن کر راتوں کی نیند حرام کرتا ہے۔ گویا خطرہ صرف ایک ہی ہے جو ہزار بھیس بدلتا ہے۔ یعنی اسلام کو صرف اسلام سے خطرہ ہے۔

جہاں تک احمدی عقائد کا تعلق ہے اس خطرہ نے تو گویا آفت ڈھا رکھی ہے اور اس طرح ہر سمت سے ان علماء کو گھیر لیا ہے جیسے ایک ڈراؤنا خواب ایک بچہ کے دل کو گھیر لیتا ہے اور وہ اپنے تصور میں ان وہمی بلاؤں سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ حقیقی خطرہ ان خوابوں سے نہیں بلکہ اس سانپ سے ہے جو اس کے دل کے قریب کُنڈل مارے بیٹھا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ بچہ تو نیند کی حالت میں ہوتا ہے اور یہ جاگے ہوئے ہیں اور بچہ تو ڈرانے والی صورتوں سے ڈرتا ہے اور یہ ان صورتوں سے ڈر رہے ہیں جو ان کے لئے ترقی اور اسلام کے احیائے نو کا پیغام لے کر ابھری ہیں۔ صرف اسی پر بس نہیں بلکہ جان بوجھ کر ان صورتوں کی طرف وہ نقوش منسوب کرتے ہیں جن کے تصور سے انہیں ڈر محسوس ہو۔ چنانچہ احمدی لاکھ کہیں اور خدا کا مقدس نام لے لے کر قسمیں کھائیں کہ ہم اپنے محبوب ترین آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین یقین کرتے ہیں اور تمام انبیاء سے افضل اور برتر جانتے ہیں۔ آپؐ کے دامِ محبت میں سرتاپا گرفتار ہیں اور ایمان رکھتے ہیں کہ آپؐ کی شریعت آخری اور کامل اور تمام بنی نوع انسان اور ہر زمانہ کے لئے ہے مگر یہ علماء نہیں مانتے اور

اس کے بالکل برعکس خیالات منسوب کر کے ہمیں بھیانک صورت میں دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ یہ حضرت بانئ سلسلہ احمدیہؑ کے اس بیان کی طرف بھی مطلق نگاہ نہیں کرتے کہ:-

''ہمارے مذہب کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہمارا اعتقاد جو ہم اس دنیاوی زندگی میں رکھتے ہیں جس کے ساتھ ہم بفضل وتوفیق باری تعالیٰ اس عالم گذران سے کوچ کریں گے یہ ہے کہ حضرت سیدنا ومولانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین وخیر المرسلین ہیں جن کے ہاتھ سے اکمال دین ہو چکا اور وہ نعمت بمرتبہ اتمام پہنچ چکی جس کے ذریعہ سے انسان راہ راست کو اختیار کر کے خدائے تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے[1]''

''سیّدنا ومولانا سیّد الکل وافضل الرسل حضرت خاتم النبیّین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کون سا درجہ باقی ہے۔ سو واضح ہو کہ وہ ایک اعلیٰ مقام اور برتر مرتبہ ہے جو اُسی ذات کامل الصفات پر ختم ہو گیا ہے جس کی کیفیت کو پہنچنا بھی کسی دوسرے کا کام نہیں چہ جائیکہ وہ کسی اور کو حاصل ہو سکے[2]۔''

ختم نبوت کے مسئلہ پر تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں جو دوست اس بارہ میں جماعت احمدیہ کے مسلک سے واقفیت حاصل کرنا چاہیں وہ کسی وقت بھی سلسلہ کے مرکز سے لٹریچر منگوا کر تفصیلی اور یقینی معلومات حاصل فرما سکتے ہیں۔ مگر میں ضمناً یہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ ہم اس خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں جس کے قبضہ قدرت میں ہماری جان ہے اور جو ہر چیز پر قادر ہے کہ ہم حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ السلام کو اس مقام سے ایک ذرّہ بھی زیادہ یا کم نہیں سمجھتے جو مقام حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے آنے والے ہادی، مہدی اور مسیح کو دیا ہے۔ ہمارے اور ہمارے دوسرے بھائیوں کے درمیان اس مسئلہ میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ جس مہدی اور مسیح کی آمد کے انتظار میں ہیں ہمارے نزدیک وہ مہدی اور مسیح آ چکا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس آنے والے کی

---

[1] ازالۂ اوہام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۱۶۹، ۱۷۰

[2] توضیح مرام، روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۶۲

انتظار سے ختمِ نبوت کی مہر نہیں ٹوٹتی تو اس کی آمد پر ایمان لانے سے وہ مہر کس طرح ٹوٹ سکتی ہے؟ اور یہ تمام جھگڑا بس اسی بات پر چکایا جا سکتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ختم نبوت کی آیت ہوتے ہوئے بھی آنے والے مسیح کو نبی اللہ کہا اور آپ ختم نبوت کی مہر توڑنے والے نہ ہوئے تو اس صادق و امینؐ کے اس سچے کلام پر ایمان لانے والا کس طرح اس مقدس مہر کو توڑنے والا قرار پایا؟ حیرت ہے اور پھر حیرت ہے......

مگر یہ بحث اس مضمون سے الگ ہے اور میں یہاں ایک محال مفروضہ کے طور پر یہ کہتا ہوں کہ اگر احمدی ختم نبوت کے منکر بھی ہوں (نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِكَ) تو کیا اسلام کو یہی ایک خطرہ درپیش ہے اور احمدیوں کے قتل و غارت سے کیا عیسائیت کی یلغار رک جائے گی؟ اور چہار دانگ عالم میں کیا اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے گا؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی صداقت اور دیانت کے معیار پھر کل عالم اسلامی میں قائم ہو جائیں گے اور کیا مسلمانوں کے اس کے بعد باہم تمام اختلافات مٹ جائیں گے اور علماء تکفیر بازی ہمیشہ کے لئے ترک کر دیں گے؟ کیا شیعہ سنی پھر بھائی بھائی بن جائیں گے اور بریلویوں اور دیوبندیوں کے جھگڑے قیامت تک کے لئے طے ہو جائیں گے؟...... اور کیا احمدیوں کے قتل و غارت کے بعد ڈاکہ، چوری اور رشوت ستانی کی لعنتیں ہمیشہ کے لئے اسلامی ممالک کو خیر باد کہہ دیں گی؟...... مسجدیں پھر سے آباد ہوں گی اور تہذیب نو کے بداثرات سے سوسائٹی یک دفعہ پاک ہو جائے گی؟ کیا اس کے بعد بیبیوں کے چہرہ سے اٹھتا ہوا نقاب پھر گرنے لگے گا؟ سینما ہال اجڑ جائیں گے اور رقص و سرود کی محفلیں ویران ہو جائیں گی؟ اور احمدیوں کے تہہ تیغ ہونے کے بعد کیا واقعی یورپ اور امریکہ اور افریقہ اور ایشیا اور آسٹریلیا کی غیر مسلم آبادیاں دیوانہ وار اسلام کی طرف دوڑی چلی آئیں گی؟...... کاش ایسا ہو سکتا!!! اور اگر ایسا ہو سکتا تو دنیا دیکھتی کہ کوئی سچا احمدی بھی اس راہ میں گردن کٹوانے سے گریز نہ کرتا۔ ہم دوڑتے ہوئے ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہوئے ایسی مقدس موت کے سمندر میں چھلانگیں لگا دیتے کیونکہ ہماری تو عبادتیں اور ہماری قربانیاں، ہماری زندگی اور ہماری موت محض اس لئے ہے کہ اسلام کو نئی زندگی عطا ہو۔ اگر آج ہماری موت سے اسلام کو زندگی عطا ہو جائے تو ہم آج اسی وقت، اسی لمحہ مرنے کے لئے تیار ہیں۔

بہرحال ان علماء کا یہ عجیب حال ہے کہ ختم نبوت کا وہ فرضی انکار جو احمدیوں نے کبھی نہیں کیا آج ان کے لئے اسلام کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا ہے اور اسلام کی زندگی اور موت کے وہ ان گنت مسائل جن سے وہ ہر روز اپنے شہروں، اپنے قصبات اور اپنے دیہات کی گلی گلی میں دوچار ہوتے ہیں ان کی نظر میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے!

ان کی زود حسی اور بے حسی کا یہ اجتماع ضدین ایک عجیب تمسخر آمیز صورت اختیار کر لیتا ہے جب ہم انہیں ایک طرف تو پاکستان بننے تک بلکہ بعد میں بھی اس نظریہ کا قائل پاتے ہیں کہ بس اکھنڈ ہندوستان ہی مسلمان کے مفاد کا ضامن ہوسکتا ہے اور مسٹر گاندھی اور ولبھائی پٹیل اور پنڈت نہرو کی قیادت میں کانگرس کی صفوں میں ''چپ وراست ...... چپ وراست'' ...... کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف چوہدری محمد ظفر اللہ خاں کی پاکستان کی مرکزی کابینہ میں شمولیت ان کی آنکھ کا پھوڑا بن جاتی ہے اور اقوامِ متحدہ میں ان کا پاکستان کی طرف سے نمائندگی کرنا انہیں اسلام کے لئے ایک ہولناک خطرہ نظر آتا ہے۔ علماء کی اس طرز فکر پر کبھی ہنسی آتی ہے تو کبھی رونا آتا ہے۔ مقدور ہو تو ایک ایک عالم کو سامنے بٹھا کر پوچھوں کہ بتاؤ تو سہی کہ گاندھی کی پیروی سے اسلام کس طرح زندہ ہوسکتا تھا اور اب ظفر اللہ خاں کی نمائندگی سے مر کس طرح سکتا ہے؟ کیا اسلام کا ان امور سے کوئی دور کا بھی واسطہ ہے؟ ...... اسلام اگر زندہ ہوسکتا ہے تو ہر مسلمان کے سینہ میں شمع ایمان کے جلنے سے زندہ ہوسکتا ہے اور مر سکتا ہے تو انہیں شمعوں کے بجھ جانے سے۔ پھر کیا گاندھی کی پیروی سے یہ سب شمعیں ایک ایک کر کے جلنے لگی تھیں اور کیا آج ظفر اللہ کی نمائندگی کے جھونکوں سے معاً یہ شمعیں بجھنے لگی ہیں؟ کیا ساٹھ کروڑ مسلمانوں کے ایمان کی زندگی اور موت بس انہی دو حادثات پر موقوف تھی یا ہے؟ ...... کیا یہ علماء نہیں جانتے کہ اسلام کو پیش آمدہ خطرات کا کسی وزیر کی وزارت سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ یہ خطرات محض اس نازک صورتِ حال کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے علّامہ حالی نہایت درجہ درد کے ساتھ رقمطراز ہیں۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقراء ہے
وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے
جو دین کہ تھا شِرک سے عالَم کا نگہباں
اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اُس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے
اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جو دین کہ ہمدرد بنی نوع بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غِناء بھی
اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غناء ہے
جو دِین کہ گودوں میں پلا تھا حکماء کی
وہ عرضۂ تیغ جُہلا و سُفہاء ہے
جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب
اب معترض اس دین پہ ہر ہرزہ سرا ہے
ہے دین ترا اب بھی وہی چشمہ صافی
دینداروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے

یاں راگ ہے دن رات تو واں رنگ شب و روز
یہ محفل اعیاں ہے وہ بزمِ شرفا ہے
چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے
دولت ہے نہ عزت، نہ فضیلت نہ ہنر ہے
اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

(مسدّس حالی)

یہ علّامہ حالی کی زبان سے مسلمانوں کی زبوں حالی کا اس وقت کا نقشہ ہے جب ابھی حالت اِس سے بہتر تھی۔ اب تو صورت حال اور بھی دگرگوں ہو چکی ہے اور اقبال کی پیش کردہ تصویر حقیقت سے نسبتاً زیادہ قریب ہے۔ان کے نزدیک مسلمانوں کے:-

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں
اُمتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آذر ہیں
بادہ آشام نئے بادہ نیا خُم بھی نئے
حَرمِ کعبہ نیا بت بھی نئے تم بھی نئے
کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمھیں پیاری ہے
طبع آزاد پہ قید رمضاں بھاری ہے
تم ہی کہہ دو یہی آئین وفاداری ہے؟
قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو
ہو نِکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟
شور ہے ہوگئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

میں علماء سے پوچھتا ہوں کہ کیا مسلمانوں کی یہ سخت دردناک حالت اس مقام تک اسی لئے پہنچی کہ ظفر اللہ خاں نے ایک دن پاکستان کا نمائندہ بننا تھا؟ اور کیا یہ تمام مسلمان جن کا ذکر علّامہ حالی اور علّامہ اقبال نے کیا ہے بس اسی وجہ سے اس خستگی کا شکار ہو گئے کہ ایک قلیل التعداد جماعت پر ''ختم نبوت'' کے انکار کا الزام لگایا جانا تھا؟

اس وقت علماء کو اسلام کے متعلق جو خطرات نظر آرہے ہیں وہ اگرچہ سچ بھی ہوں تو ان کی مثال ان حقیقی خطرات کے سامنے جو ان کو نظر نہیں آرہے ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک حملہ آور ہولناک درندے سے تو آنکھیں بند کر لے اور پیٹھ موڑ کر بیٹھ جائے اور ایک حسین پھول پر بیٹھی ہوئی حسین تتلی کو اپنی جان کا سخت دشمن سمجھ کر سخت خوفزدہ نگاہیں اس پر ڈالے اور کبھی خوف سے پیچھے ہٹ جائے اور کبھی غصہ سے آگے بڑھے تا کہ اسے اپنی انگلیوں میں مسلے اور پاؤں تلے روند ڈالے یا پھر بعینہٖ اس شخص کی طرح کہ جسے کمزور پر تو سخت غصہ آتا تھا مگر طاقتور کو دیکھ کر اس کا دل

جذبات رحم و درد سے بھر جاتا تھا۔ وائے افسوس! نہ تو یہ آریوں کے خلاف صف آراء ہوتے ہیں نہ عیسائیوں کے خلاف۔ نہ انہیں مشرک یورپ پر غصہ آتا ہے نہ دہریہ روس پر۔ اور اندرونی برائیوں کے کوہ ہائے گراں کو بھی دور کرنے کی ہمت نہیں پاتے۔ ہاں غصہ آتا ہے تو ان کمزور قلیل التعداد احمدیوں پر جن کا جرم صرف یہ ہے کہ ان کے نزدیک حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشگوئی نہایت صفائی اور شان کے ساتھ پوری ہو چکی ہے جس میں ایک مہدی اور ایک مسیح کے آنے کی خوشخبری دی گئی تھی۔ وہی مہدی اور وہی مسیح جس کے ہاتھوں سے آخری زمانہ میں عیسائیت اور دیگر مذاہب پر اسلام کا غلبہ مقدر تھا!

پس ان کو انہی قلیل التعداد احمدیوں پر غصہ آتا ہے جو اسلام کی تبلیغ کے لئے ساٹھ کروڑ مسلمانوں کا درد اپنے سینوں میں لئے ہوئے دنیا کے کونے کونے میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قرآن لے کر نکل کھڑے ہوئے ہیں جن کے مقابل پر آج ہر جگہ عیسائیت کے پاؤں اکھڑے چلے جا رہے ہیں اور اسلام آگے بڑھ رہا ہے۔ جنہوں نے یورپ کے دل میں بھی مسجدیں بنا دیں اور افریقہ کے تاریک و تار جنگلوں میں بھی کلماتِ تکبیر بلند کئے اور جن کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی کوششوں کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ سیاہ براعظم اسلام کے نور سے بڑی تیزی کے ساتھ منور ہو رہا ہے۔ کہاں وہ راتیں کہ جب عیسائی پادری یہ سمجھا کرتے تھے کہ چند سالوں کے عرصہ میں وہ سارے افریقہ کو عیسائی بنا لیں گے اور کہاں یہ دن کہ آج ایک عیسائی کے بدلہ میں دس افریقن مشرکین اسلام قبول کر رہے ہیں۔

ہاں اسی جرم کی پاداش میں یہ احمدی اس وقت اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور ان کا علاج بھی وہی ایک علاج ہے جو ہمیشہ سے ایسے مجرموں کا ہوتا چلا آیا ہے یعنی مسائل کو بالائے طاق رکھ دو اور نصیحت کا خیال تک نہ دل میں آنے دو۔ ہاں تلواریں اٹھاؤ اور ان کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو تہِ تیغ کر دو یہاں تک کہ ان کا نشان تک دنیا میں باقی نہ رہے یا پھر یہ ''منافقت'' کی زندگی اختیار کر لیں اور ان علماء کی ملت میں لوٹ جائیں جن کے ایماء پر ان کے قتل عام کا جشن منایا جا رہا ہو۔

لیکن ان علماء کی ملّت کونسی ملّت ہے اور یہ اتحاد تا بکے؟ ہم احمدیت سے توبہ کر کے وہ کونسا

مذہب اختیار کریں جس سے سب علماء کے دل یکساں ٹھنڈے ہو سکیں۔ کیا حضرت علیؓ کی محبت کا دعویٰ کریں اور ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کو گالیاں دینے لگیں؟ کیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو عالم الغیب خدا کی طرح عالم الغیب ماننے لگیں اور آپؐ کے جسم عنصری سے انکار کر دیں۔ یا پھر آپؐ کی نورانیت کو یکسر فراموش کر کے بشریت پر بیکار زور دینے لگیں اور نعوذ باللہ! آپؐ کے مقام کو ایسا گرائیں کہ بڑے بھائی سے زیادہ رتبہ نہ سمجھیں۔ کیا ایسے اہل حدیث ہو جائیں کہ قرآن کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں یا ایسے اہل قرآن کہ اپنے آقاؐ کی مقدس احادیث کو یکسر ٹھکرا دیں؟ آخر وہ کونسی ملّت واحدہ ہے جس کا فرد بزور شمشیر احمدیوں کو بنانا مقصود ہے؟

بعض حقیقی خطرات

گزشتہ صفحات کے مطالعہ کے بعد شاید کوئی یہ خیال کرے کہ علماء کا دین میں تشدّد اور جبر کو جائز قرار دینے کا مسئلہ اور قتل مرتد کا مسئلہ یہ دونوں ایسے امور ہیں جن کا ایک چھوٹے سے مسلمان فرقہ سے تعلق ہے اور کیا فرق پڑتا ہے اگر ساٹھ کروڑ کی مسلمان آبادی میں سے چند لاکھ احمدی مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے تہہ تیغ کر دیئے جائیں۔ کم از کم اس کے بعد باقی مسلمان تو امن اور چین کے سانس لیں گے۔ مگر یہ خیال ایک واہمہ سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھتا اور اس زمانہ کے بہت سے علماء کی افتادِ طبع سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ ہر طاقتور غیر مسلم کے مقابل پر ان کی قوت عمل مفقود ہو جاتی ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسرے مسلمان فرقوں کے خلاف بھی ان کا غصہ اس آسانی سے فرو ہو سکتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ امّت کے تمام علماء ایک ہی طرزِ فکر کے عادی ہیں (خدا وہ وقت نہ لائے!) مگر مشکل یہ ہے کہ شریف غیر جانبدار آواز اکثر کمزور ہوا کرتی ہے اور یہ لوگ ہر تکلیف کے موقع سے دامن بچا لیتے ہیں۔ پس میں اس وقت صرف ان علماء کی بات کر رہا ہوں جو اکثر فتویٰ بازی میں مصروف رہتے ہیں اور تکفیر جن کا دل پسند مشغلہ ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اِن کے افکار اور احساسات اکثر اجتماعِ ضدین ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو قوت عمل اتنی کمزور پڑ چکتی ہے کہ جس مشکل میدان میں بھی اسلام کو جہاد کی ضرورت ہو اس سے کوسوں دور رہتے ہیں اور جہاں ضرورت نہ ہو وہاں گفتار کے غازی بن کر کود پڑتے ہیں۔ چنانچہ اِن جہاد کی تعلیم دینے والوں کو آپ جہادِ کشمیر کے وقت سرحدوں کے قریب بھی پھٹکتا نہ دیکھیں گے۔ ہاں! آپ دیکھیں گے کہ بسا اوقات عین حالت جنگ میں جبکہ مظلوم اور بے بس کشمیری مسلمانوں کو ڈوگرہ راج کے چنگل سے رہائی دلانے کے لئے سرحد

کے غیور مسلمان برسر پیکار تھے۔ انہی علماء میں سے ایسے بھی اٹھے جنہوں نے اس جہاد آزادی کو حرام جنگ قرار دیا اور اس جرم کی پاداش میں حکومت وقت انہیں نظر بند کرنے پر مجبور ہوگئی لیکن میدان جہاد کے خطرات کے مقابل پر قید تنہائی کے سکون کو انہوں نے اپنے لئے زیادہ پسند کیا۔

یہ علماء ہر اس مسئلہ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں جس سے ان کی زود رنج طبیعت سخت برافروختہ ہو سکے اور پھر یہ باہم مسلمان فرقوں کے درمیان افتراق اور مناقشت کو ہوا دے سکیں۔ برائیوں کو دیکھنے میں یہ نہایت دور بین بلکہ سُقم ایجاد نگاہ رکھتے ہیں اور خوبیاں ان کی نظر سے پہاڑ اوجھل رہتی ہیں۔ ان کی ساری بجلیاں صرف مسلمان کا شانوں پر ٹوٹتی ہیں۔ ان کا اجماع کبھی باہمی محبت کی بناء پر نہیں ہوتا بلکہ کسی تیسرے کا بغض ان کو اکٹھا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ چنانچہ کبھی تو آپ ''اجماع امت'' احمدیوں کے خلاف دیکھیں گے اور کبھی شیعوں کے خلاف۔ کبھی بریلویوں کے خلاف یہ اجماع ہوگا اور کبھی دیوبندیوں کے مقابل پر اور کبھی سب مل کر اہل قرآن کے خلاف اجماع کا نظر فریب منظر پیش کریں گے۔ ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہتے ہیں کہ ایک باغ کے مالک نے دیکھا کہ ایک سیّد، ایک پٹھان اور ایک میراثی اس کے باغ کا پھل توڑ رہے ہیں۔ ان تینوں کے مقابل وہ اپنے آپ کو بہت کمزور پاتا تھا چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر انہیں السلام علیکم کہا اور دست بستہ عرض کی کہ قبلہ شاہ صاحب اور محترم خان صاحب آپ دونوں تو خیر معزّز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، پس آپ جو چاہے کریں کہ آپ ہی کا باغ ہے مگر یہ...... میراثی کس برتے پر اس باغ میں آنے کی جرأت کر سکا اس لئے آپ بزرگان اگر میرا ساتھ دیں تو کیوں نہ ہم مل کر پہلے اس چور کی مرمت کر لیں پھر آپ مختار ہیں جس طرح چاہیں اور جہاں سے چاہیں اس باغ کا پھل توڑیں۔ اس پر ان تینوں نے مل کر اس میراثی کو پکڑ لیا اور مار مار کر وہیں ڈھیر کر دیا۔ شاہ صاحب اور خان صاحب اس کے بعد پھر پھل کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس پر مالی شاہ صاحب کو الگ لے گیا اور گذارش کی کہ حضرت یہ سب کچھ آپ ہی کا ہے مجھے آپ پر تو کوئی اعتراض نہیں کہ آپ آل رسول ہیں مگر اس پٹھان پر بہت غصہ آ رہا ہے کہ اس کو تیسری جگہ پر یہ حق کہاں سے مل گیا کہ میرے باغ کا پھل برباد کرے۔ شاہ صاحب ذرا سیدھے سادے آدمی تھے اُن کی سمجھ میں یہ بات آ گئی چنانچہ اُن دونوں نے خان صاحب کو پکڑ لیا اور رسوں

سے باندھ کر اُن کی خوب مرمّت کی اور ادھ موا چھوڑ گئے۔ اس کے بعد شاہ صاحب پھل کی طرف لپکے اور مالی نے انہیں کمزور اور تنہا پا کر اُن کی گردن داب لی اور مار مار کر بے حال کر دیا۔

اگر ناظرین ذرا بھی غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان علماء کی War Strategy یعنی جنگی داؤ پیچ اس مثال کے بہت مشابہ ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ اس باغ کے یہ آپ خود ہی مالک بن بیٹھے ہیں ــــ بہرحال اس امر میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ یہ تشدد اور قتل مرتد کی آوازیں بلند کرنے والے علماء دل میں مستحکم ارادے لئے بیٹھے ہیں کہ جب بھی ان کو کسی مخالف فرقہ پر اقتدار حاصل ہوا یہ بزور اس کا صفایا کر دیں گے۔ ختم نبوت کے انکار کے الزام میں احمدیوں کے خلاف ہنگامہ آرائی کے کچھ مناظر آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ اس وقت یہ علماء یک زبان ہو کر عوام سے کہتے تھے کہ کافر ہیں تو یہی احمدی ہیں اور مرتد ہیں تو یہی، اور ان کے خاتمہ کے ساتھ ہی اسلام کے تمام دکھوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور ہم بھائیوں کی طرح باہم گلے مل کر بیٹھیں گے۔ ہمارے اختلافات اندرونی ہیں اور یہ ایک بیرونی اختلاف ہے۔ ہمارے اختلافات فروعی ہیں اور یہ ایک بنیادی اختلاف ہے۔ مگر انہی دنوں کی بات ہے جب یہ تحریک اپنی پوری قوت کے ساتھ جاری ہو چکی تھی تو ''جماعت اسلامی'' کا ترجمان ''تسنیم'' اہل قرآن کے خلاف یہ فتویٰ دیئے بغیر نہ رہ سکا کہ:-

> ''اگر یہ مشورہ دینے والوں کا مطلب یہ ہے کہ شریعت صرف اتنی ہی ہے جتنی قرآن میں ہے باقی اس کے علاوہ جو کچھ ہے شریعت نہیں ہے تو یہ صریح کفر ہے **اور بالکل اُسی طرح کا کفر ہے جس طرح کا کفر قادیانیوں کا ہے بلکہ کچھ اس سے بھی سخت اور شدید تر ہے۔''**

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ابھی ساری توجہ جماعت احمدیہ پر مرکوز تھی۔ اب تو خیر ہر طرف تکفیر کی گرم بازاری ہے اور ؎

کفر و ایماں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اسی کی روبکاری ہے

مذہب کے میدان میں ایک عام ہُلّڑ مچ گیا ہے۔ زیدؔ کی لاٹھی ہے تو بکرؔ کا سر۔ عمروؔ کی داڑھی

ہے تو بکرؔ کا ہاتھ، اور ہر ایک کا گریبان دوسرے کے ہاتھوں پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت میری نظر کے سامنے ایک کتابچہ ہے جس کا عنوان ہے ''دیوبندی مولویوں کا ایمان''۔ یہ (مولانا) عبدالمصطفیٰ ابو یحیٰ محمد معین الدین شافعی قادری رضوی تھانوی نے تصنیف فرمایا ہے۔ اس کے سرورق کے اندرونی صفحہ پر ہی مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کے بارہ میں غیر مبہم الفاظ میں یہ فتویٰ شائع کیا گیا ہے کہ **وہ ختم نبوت کے قائل نہ تھے**۔ اگرچہ الفاظ ایسے مہذبانہ نہیں مگر مفہوم یہی ہے۔ اس کے بعد کتاب کا اصل مضمون شروع ہوتا ہے اور مولوی اسمٰعیل صاحب دہلوی کو مرکزی حیثیت دے کر تکفیر کا نشانہ بنایا گیا ہے (عبارت چونکہ نہایت مغلق اور دقیانوسی ہے اس لئے تحریر کے نمونے پیش کرنے سے حتی المقدور احتراز کر رہا ہوں) اس کے بعد دیوبند کے دوسرے ائمہ سے متعلق نام بنام تکفیر کے فتوے ہیں۔ مولوی ثناءاللہ صاحب امرتسری کو بھی بغیر شک کے کافر قرار دیا گیا ہے اور مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کو بھی۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی دیوبندی کے کفر کی تو بناء ہی مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کی طرح **عقیدہ ختم نبوت کا انکار** قرار دی گئی ہے۔

چنانچہ ان کے کئی ایک اقتباسات درج کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب کلیۃً ختم نبوت کے منکر تھے (حالانکہ جس طرح یہ جھوٹ ہے کہ احمدی ختم نبوت کے قائل نہیں اسی طرح یہ بھی صریح بہتان ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوؒی ختم نبوت کے منکر تھے) مگر چونکہ ختم نبوت کی تشریح ان کے نزدیک احمدیوں کی طرح مولانا عبدالمصطفیٰ ......شافعی قادری وغیرہم کی تشریح ختم نبوت کے خلاف ہے اس لئے اس رسالہ کے مصنّف عبدالمصطفیٰ جناب مولوی محمد قاسم صاحب سے متعلق فرماتے ہیں:-

> ''**مسلمانو! دیکھو اس ملعون، ناپاک شیطانی قول نے ختم نبوت کی کیسی جڑ کاٹ دی ہے** ......اَب یہ ملاحظہ فرمایئے کہ مولوی قاسم نانوتوی منکر ختم نبوت ہے اور منکرین ختم نبوت کے حق میں مولوی رشید احمد و مولوی خلیل احمد وغیرھم وہابیہ نے کفر کے فتوے دیئے......''

مگر میں یہ کہتا ہوں کہ ''اب یہ ملاحظہ فرمایئے'' کہ وہی ختمِ نبوّت کے انکار کی چھری جو کبھی

ایک عظیم الشان اجماع کے ساتھ خصوصاً احرار ماہرینِ فن کے ہاتھوں احمدیوں کے دل پر چلائی جاتی تھی اب کس آزادی سے انہی لوگوں کے دل پر چلنے لگی جو یہ چھری چلانے میں مشّاق سمجھے جاتے تھے۔ یہ تو محض ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ افسوس کہ میں جگہ کی قلّت کی وجہ سے اس رسالہ کے صفحہ ۱۵ کی وہ عبارت درج نہیں کرسکتا جس کا عنوان ہے:-

''مرزائیوں قادیانیوں کی طرح دیوبندیوں وہابیوں کے عقیدوں کا مختصر نمونہ''

یہ عبارت بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

اور شورش کاشمیری کی وہ عبارت بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے جو رسالہ ''کافر ساز ملّا'' کے سرورق پر درج ہے:-

''جو شخص اکابر دیوبند کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کرتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ شقی القلب ہے۔ بدبخت ہے۔ بدزبان ہے۔ ذلیل ہے۔ فروتر ہے۔ بلکہ ہم یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ وہ دھوپ چھاؤں کی اولاد ہے۔''

اس رسالہ کے صفحہ ۷ کی عبارت بھی خاص طور پر قابل توجہ ہے جس میں شورش کاشمیری صاحب کے ''چٹان'' ۱۹۶۲ء کے مقالۂ افتتاحیہ کی یہ دھمکی درج ہے کہ:-

''ان کافر گروں سے ہماری یہ درخواست ضرور ہے کہ اپنی زبانوں کو بند کریں ورنہ ایسا نہ ہو کہ ان کا پوسٹ مارٹم کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ ہم یہ ایک لحظہ کے لئے بھی برداشت نہیں کرسکتے کہ کوئی شخص ان لوگوں کو کافر کہے جو اس ملک میں ایک صدی یا اس سے بھی زائد عرصہ سے اسلام کے صحیح خدمت گذار ہیں ...... کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ حکومت ان کی زبانیں بند کردے۔ ہمیں اس قسم کے فیض درجت حامئ سنّت ۔ ماحئ بدعت شیخ الحدیث اور ابوالفضل کہلانے والے پٹواریوں کی ضرورت نہیں۔ یہ فتنہ پرداز ہیں اور فتنہ رسول اللہ کے ارشاد کے مطابق **قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔**''

پھر اسی رسالہ کے صفحہ ۹ پر ''فی سبیل اللہ فساد'' کے زیرعنوان شورش کاشمیری صاحب کی ایک نظم درج ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس میں بریلویوں پر ''دین فروشی کی روٹیاں'' کھانے اور

شرع پیمبری بیچ کھانے کا الزام لگایا گیا ہے اور لارڈ کلائیو کا خانہ دار قرار دیا گیا ہے۔ پھر آگے چل کر اسی رسالہ میں بریلویوں کو لیگ اور قائداعظم کے دشمن کے طور پر دکھایا گیا ہے۔

اس رسالہ کے علاوہ دیوبندیوں کا شائع کردہ ایک اور دو ورقہ بھی میری نظر سے گزرا ہے جس کا عنوان ہے:-

''رضاخانی فتنہ پردازوں کا سیاہ جھوٹ''

اس میں مدیر ''چٹان'' آغا شورش کاشمیری کی یہ عبارت درج ہے:-

''ہم نے ان آنکھوں کے سامنے مولانا محمد علی، مولانا حسین احمد (مدنی)، ابوالکلام آزاد، علّامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے صفات وکمالات کے دوسرے انسانوں کو **بھڑووں اور دیّوثوں کی اولاد کے ہاتھوں رسوا ہوتے دیکھا ہے۔**''

چند سطور کے بعد فرماتے ہیں:-

''ہم ربِّ ذوالجلال کو گواہ بنا کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں گالی دینے والے پھر وہ لوگ بھی تھے جو اُن کی **بیت الخلاء کی اینٹ** سے بھی کمتر درجہ کے لوگ ہیں۔''

اس کے جواب میں بریلوی رسالہ ''شورش کی شورش'' کے صفحہ ۳ پر ایک نظم چھپی ہے جس کے چند شعر درج ذیل ہیں:-

گزری ہے ''اُس بازار'' ہی میں جس کی زندگی
ہم کو سنا رہا ہے وہ باتیں ''کھری کھری''

ہاتھوں میں لے کے پرچم گستاخی رسول
کرنے لگا ہے دہر پہ ظاہر ''شناوری''

جھانکا نہ اس نے اپنے گریبان میں کبھی
آئی نظر نہ اس کو کبھی اپنی کافری

میں پُوچھتا ہوں اس سے کہ اے بانئ فساد
کب سے ملی ہے تجھ کو سندِ علمِ دین کی
''پرشاد ''مندروں کے بتا کون کھا گیا
ہندو کی مہر کس کی جبیں پر بتا لگی
''بھارت کی جے'' کے نعرے لگاتا رہا ہے کون
خود سوچ کس نے بیچی ہے شرع پیمبری
آزادئ وطن کا مخالف بتا تھا کون
تھی کانگرس کے ساتھ بتا کس کی دوستی
نہروکو ''یارسول'' بتا کس نے تھا کہا
روندی تھی کس نے سوچ رسالت کی برتری
نانوتوی پہ کفر کا فتویٰ لگے نہ کیوں
کیونکر یہ مان لیں کہ مسلماں ہے تھانوی
کس نے کہا ہے ''باب نبوت نہیں ہے بند''
کی قادیانیوں کی بتا کس نے رہبری
کس نے سکھائی ہے تجھے توہین مصطفیٰ
سیکھے ہیں تو نے کس سے یہ ''آداب کافری''
ہم ''وارث سموم و خزاں'' ہی سہی مگر
تم سے ملی ہے کون سے پھولوں کو تازگی
ہم فتنہ و فساد کے خوگر سہی مگر
تم نے تو چھین لی ہے ہزاروں کی زندگی
انسانیت کے نام پر دیتے ہو گالیاں
اس پر بھی کہہ رہے ہو بُرے ہیں بریلوی

ننگے ہوئے ہو خود ہی شرافت کے نام پر
تہذیب و شرم تم میں ذرا بھی نہیں رہی
پھیلائے فتنے ختم نبوت کی آڑ میں
کرتے ہو نام امن پہ تم فتنہ پروری
چندے بٹورتے ہو نبوّت کے نام پر
تم کر رہے ہو نام نبی پر گداگری
نعروں سے ہے امیر شریعت کوئی بنا
راس آگئی کسی کو ''خطابت'' کی ساحری

یہ بریلویوں اور دیوبندیوں کی ایک دوسرے کے خلاف دشنام طرازی کا ایک لمبا سلسلہ ہے اور دونوں طرف کی طرزِ کلام طبیعت پر سخت گراں گزرتی ہے مگر ایک بات اسے پڑھنے سے بالکل ظاہر و باہر ہے کہ اکثر علماء کی باہمی تکفیر بازی کی عمارت محض جذبات غیظ وغضب پر مبنی ہے۔ جس سمت بھی وہ ان جذبات کا دھارا پھیر دیں وہی فرد یا جماعت یا فرقہ کافر، مرتد، واجب القتل اور مغضوب علیہم بن جاتا ہے۔ چنانچہ وہ تمام الزامات جو ۱۹۵۳ء کے فساد کے دوران میں احمدیوں پر لگا کر انہیں واجب القتل قرار دیا جاتا تھا ملزمین خود ایک دوسرے پر لگانے لگے۔ احمدیوں کے خلاف بریلویوں اور دیوبندیوں کی طرف سے مشترکہ طور پر یہ الزامات لگا کر عوامی جذبات کو خطرناک حد تک مشتعل کیا جاتا تھا کہ:-

(۱) احمدی ختم نبوت کے منکر ہیں۔
(۲) احمدی ہتک رسول کرتے ہیں۔
(۳) احمدی انگریزوں کے پٹھّو ہیں۔
(۴) احمدی پاکستان کے خلاف ہیں۔
(۵) احمدی جہاد کے خلاف ہیں۔
(۶) احمدی غیر مسلموں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔

(۷) احمدیت مذہب کے نام پر ایک دُکانداری ہے۔

اب بعینہٖ یہی الزامات دیوبندی اور بریلوی ایک دوسرے پر لگانے لگے ہیں اور عوام کو پھر انہی ذرائع سے مشتعل کرنے میں مصروف ہیں۔ خصوصاً بعض دیوبندی علماء تو ختم نبوت کے انکار کے الزام میں خطرناک حد تک بریلوی غضب کا نشانہ بنے ہوئے ہیں اور یہ تمام علماء جو کل تک اُمت کے ایک عظیم الشان اجماع کا دعویٰ لے کر ایک قلیل التعداد جماعت کے پیچھے پڑے ہوئے تھے آج خود اس اجماع کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔ ہتھیار بھی وہی ہیں، ہتھیار چلانے والے بھی وہی۔ فنون جنگ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں۔ ہاں بدلا ہے تو ہدف بدل گیا ہے۔ بے اختیار احرار سے متعلق تحقیقاتی عدالت کے ججوں کے وہ الفاظ یاد آجاتے ہیں کہ:-

''اسلام ان کے لئے ایک حربہ کی حیثیت رکھتا تھا جسے وہ کسی سیاسی مخالف کو پریشان کرنے کے لئے جب چاہتے بالائے طاق رکھ دیتے اور جب چاہتے اٹھا لیتے۔ کانگرس کے ساتھ سابقہ پڑنے کی صورت میں تو ان کے نزدیک مذہب ایک نجی معاملہ تھا اور وہ نظریہ قومیت کے پابند تھے لیکن جب وہ لیگ کے خلاف صف آراء ہوئے تو ان کی واحد مصلحت اسلام تھی جس کا اجارہ انہیں خدا کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ اُن کے نزدیک لیگ اسلام سے بے پروائی نہ تھی بلکہ دشمن اسلام بھی تھی۔ اُن کے نزدیک قائداعظم ایک کافر اعظم تھے۔''

یہ الفاظ فاضل ججوں نے احرار سے متعلق استعمال کئے ہیں اور ان کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں مگر عموماً مذہبی دنیا پر جب علماء کے احوال پر نظر پڑتی ہے تو وہاں بھی انسان یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتا کہ:-

''اسلام ان کے نزدیک ایک حربہ کی حیثیت رکھتا ہے جسے وہ کسی مخالف کو پریشان کرنے کے لئے جب چاہتے ہیں بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں اٹھا لیتے ہیں۔''

ان علماء کی خلوص نیت پر پھر یقین آئے تو کس طرح جبکہ احمدیت کے خلاف بھی وہی حربے استعمال ہوتے ہیں جو بریلویوں کے خلاف، اور بریلویوں کے خلاف بھی وہی حربے استعمال ہوتے

ہیں جو دیوبندیوں کے خلاف۔ پھر طرزِ کلام بھی وہی انوکھی طرزِ کلام ہے جس کے اختیار کا تو کیا سوال ذکر تک سے گھِن آتی ہے۔ ایک طرف آغا شورش بعض مشہور مذہبی راہنماؤں سے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ ''دھوپ چھاؤں کی اولاد'' ہیں اور دوسری طرف انہیں یہ جواب دیا جاتا ہے کہ:-

''اگر بریلوی دھوپ چھاؤں کی اولاد ہیں تو تو اپنے متعلق کیا وثوق سے کہہ سکتا ہے۔ کیا اپنی دفعہ تو پاس کھڑا تھا؟ کیا معلوم تو اندھیرے کی اولاد ہو یا......[1]''

پھر اپنی ایک ''نظم'' میں کوئی سیّد محمد ایوب تنہا کپورتھلوی شورش صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

احمد رضا کی شان سے تو آشنا کہاں
جا سونگھ ہندوؤں کی لنگوٹی سڑی ہوئی
سکّے ترا رسول ہیں سکّے ترا خدا
جس نے ذرا دکھا دیئے وہ تیری پارٹی
کرکے غلط بیانیاں جھوٹے جہان کے
ہوتا ہے اب ذلیل تو گھر گھر گلی گلی
تو نے تو دم بھرا ہے سدا کفر کا خبیث
مسلم کے ساتھ کب سے ہوا ہے تو کھتّری
تکبیر کی خبر تجھے نمرود ہے کہاں
جا ہندوؤں کے ساتھ کہیں کر ہری ہری
ایّوب جی ہے وقت کی قلّت بہت یہاں
باتیں وگرنہ اور بھی کرتے کھری کھری[2]

سید محمد ایوب تنہا صاحب بہت مصروف الاوقات آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وقت کی

---

[1] ''شورش کا آپریشن'' بجواب ''کافر ساز ملّا'' پیش کردہ حافظ محمد حسین حافظ لائل پور صفحہ ۶

[2] رسالہ ''شورش عُرف بھاڑے کا ٹٹّو'' مصنفہ غلام المشائخ جناب شاہ محمد عاصی سرہندی و جناب سیّد محمد ایوب تنہا کپورتھلوی صفحہ ۷، ۸

قلّت نہ ہوتی تو خدا جانے اور کون سی ''کھری کھری'' باتیں سناتے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سیکرٹری انجمن جماعت اہل سنت مصری شاہ لاہور کے پاس نسبتاً زیادہ وقت ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ انہوں نے دیوبندی علماءخصوصاً شورش صاحب کو دل کھول کر ''باتیں کھری کھری'' سنائی ہیں بلکہ اپنے مضمون ''شورش کی شورش'' کو بکثرت ٹھوس حوالہ جات سے مزیّن کیا ہے اور ہر بات کی دلیل پیش کی ہے۔ چنانچہ اُن ''کھری کھری'' باتوں کے ضمن میں آپ دو دیوبندی علماء کے باہمی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

''......مولانا حسین احمد صاحب نے مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیا اور قائداعظم کو کافرِ اعظم کا لقب دیا اور مولوی حسین احمد کے اسی فتویٰ کی بناء پر مولوی شبیر احمد عثمانی نے کہا تھا کہ:-

''یہ پرلے درجے کی شقاوتِ قلبی ہے کہ قائداعظم کو کافرِ اعظم کہا جائے۔''

شورش صاحب! ذرا آنکھیں کھول کر دیکھئے کہ یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کو کافر، ابوجہل، سؤر، پرلے درجے کا شقّی، احمق اور قائداعظم کو کافرِ اعظم کہنے والے کون ہیں؟ علمائے بریلی یا علمائے دیوبند......؟

شورش صاحب! اب بتایئے کہ بقول آپ کے علماءِ سوء۔ کافر گر۔ دین فروش۔ یاوہ گو۔ بے لگام۔ فتنہ گر۔ شقّی القلب۔ بدبخت و بدزبان۔ اور دھوپ چھاؤں کی اولاد علماءِ بریلی ہیں یا چشمِ بددور آپ کے دیوبندی علماء؟[۱]''

پھر اگلے صفحہ پر ایک دیوبندی عالم کے ایک فتویٰ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بتایئے دیوبندی مذہب اور اس فتویٰ کی رو سے ساری دنیا بالخصوص پاکستان میں آپ سمیت کتنے مسلمانوں کا نکاح قائم اور اولاد حلال ہوسکتی ہے؟ علمائے اہل سنّت پر تکفیر کا الزام لگانے والو ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تمہاری کافر گری و تکفیر بازی کا فتنہ کیسا متعدّی ہے کہ جس کی رُو سے دنیائے اسلام کا کوئی فرزند مسلمان و

---

[۱] شورش کی شورش صفحہ ۸

حلال زادہ نہیں ہوسکتا[1]۔''

اور کچھ آگے چل کر مولوی ظفر علی خان صاحب کے کچھ اشعار نقل کرتے ہیں جن میں احرار کا ذکر ان الفاظ میں آتا ہے:-

گالیاں دے جھوٹ بول احرار کی ٹولی میں مل
نکتہ یوں ہی ہوسکے گا حل سیاسیات کا
خالصہ کا ساتھ دے جب یہ شریعت کا امیر
کیوں نہ کہئے اس کو ''بابا ٹل'' سیاسیات کا

پس یہ ایک لمبا اور افسوسناک سلسلہ سبّ وشتم ہے جو ایک دوسرے کے خلاف جاری ہے اور تمام الزام حتیٰ کہ طرزِ کلام بھی وہی ہے جو احمدیت کے خلاف آج تک اختیار کی جاتی رہی۔ کیا علماء بتا سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس دنیا میں خدا اور اس کے رسولؐ کی عظمت کو قائم کرنے کے لئے کیا جارہا ہے؟

معاملہ صرف سبّ وشتم تک آکر رُک نہیں جاتا اور محض ایک عام اشتعال انگیزی پر ہی اکتفاء نہیں بلکہ یہ امر یقینی ہے کہ جب ایک لمبے آرزوؤں کے دور کے بعد ان میں سے کسی گروہِ علماء کو اقتدار نصیب ہوگا تو یہ مخالف فرقوں کے قتل عام سے قطعاً گریز نہیں کریں گے۔ جب حصول اقتدار سے قبل بھی مذہب کے نام پر قتل، غارت گری اور آگ لگانے کی بکثرت مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ حصولِ اقتدار کے بعد اس طرزِ عمل میں کوئی فرق آجائے گا۔

جب باہمی نفرت کا یہ عالم ہو، جب اشتعال انگیزی ہر حد سے گزر جائے اور ان شدید جذبات غیظ ونفرت پر مستزاد یہ ہو کہ اقتدار بھی حاصل ہوجائے اور تمام ملکی قوتیں ان کے مدّمقابل ہونے کی بجائے پسِ پشت جا کھڑی ہوں تو پھر بھلا کیسے ممکن ہے کہ اس مقامِ فتح وظفر پر پہنچ کر یہ علماء ظلم وتعدّی سے دفعتاً اپنے ہاتھ روک لیں گے۔

ایسے وقت میں ظلم وستم کی راہ میں صرف ایک ہی روک حائل ہوسکتی ہے کہ ربّ العالمین کے جلال کی ہیبت ان کے دلوں پر طاری ہوجائے اور تقوی اللہ کا مضبوط ہاتھ انہیں اس اقدام سے باز

[1] شورش کی شورش صفحہ ۹

رکھے لیکن اگر یہ سب کچھ خدا تعالیٰ ہی کی ''عظمت اور وقار'' قائم کرنے کے لئے کیا جا رہا ہو اور تقوی اللہ کا یہی مفہوم ان کے ذہن میں ہو۔ جب ذاتی رجحانات تشدد کو مذہبی عقائد ہی کا نام دیا جانے لگا ہو اور جب یہ ساری تعلیم جبر و تشدّد خدا ہی کے نام پر اسی کی طرف منسوب کر کے پیش کی جاتی ہو تو پھر سوائے قادرِ مطلق خدا کے قہری ہاتھ کے، ہے کوئی ہاتھ جو ان صاحب اقتدار علماء کو اپنے ارادوں کی تعمیل سے باز رکھ سکے؟

اس سلسلہ میں جہاں تک مولانا مودودی کے عقائد کا سوال ہے ان کا ذکر کسی قدر تفصیل سے پہلے گزر چکا ہے، رہے باقی علماء تو طوالت کے خوف سے ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر تو یہاں ممکن نہیں ہاں اس ضمن میں تحقیقاتی عدالت کے فاضل ججوں کی تحقیق کا ماحصل خود انہی کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے:-

''اسلامی مملکت میں ارتداد کی سزا موت ہے۔ اس پر علماء عملاً متفق الرّائے ہیں۔ (ملاحظہ ہوں مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت العلمائے پاکستان۔ مولانا احمد علی صدر جمعیت العلمائے اسلام مغربی پاکستان۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بانی وسابق امیر جماعت اسلامی پاکستان۔ مفتی محمد ادریس جامعہ اشرفیہ لاہور و رکن جمعیّت العلمائے پاکستان۔ مولانا داؤد غزنوی صدر جمعیۃ اہل حدیث مغربی پاکستان۔ مولانا عبدالحلیم قاسمی جمعیۃ العلمائے اسلام پنجاب اور مسٹر ابراہیم علی چشتی کی شہادتیں) اس عقیدے کے مطابق چودھری ظفر اللہ خان نے اگر اپنے موجودہ مذہبی عقائد ورثہ میں حاصل نہیں کئے بلکہ وہ خود اپنی رضامندی سے احمدی ہوئے تھے تو ان کو ہلاک کر دینا چاہیے۔ اور اگر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری یا مرزا رضا احمد خاں بریلوی یا ان بے شمار علماء میں سے کوئی صاحب (جو فتوے (EX.D.E.14) کے خوبصورت درخت کے ہر پتے پر مرقوم دکھائے گئے ہیں) ایسی اسلامی مملکت کے رئیس بن جائیں تو یہی انجام دیوبندیوں اور وہابیوں کا ہوگا جن میں مولانا محمد شفیع دیوبندی ممبر بورڈ تعلیماتِ اسلامی ملحقہ دستور ساز اسمبلی پاکستان اور مولانا داؤد غزنوی بھی شامل ہیں اور اگر مولانا محمد شفیع دیوبندی رئیس مملکت مقرر ہو جائیں تو وہ ان لوگوں کو جنہوں نے دیوبندیوں کو کافر قرار دیا ہے

دائرہ اسلام سے خارج قرار دیں گے اور اگر وہ لوگ مرتد کی تعریف میں آئیں گے یعنی انہوں نے اپنے مذہبی عقائد ورثے میں حاصل نہ کئے ہوں گے بلکہ خود اپنا عقیدہ بدل لیا ہوگا تو مفتی صاحب ان کو موت کی سزا دیں گے۔

جب دیوبندیوں کا ایک فتویٰ (EX.D.E.13) جس میں اثنا عشری شیعوں کو کافر قرار دیا گیا ہے عدالت میں پیش ہوا تو کہا گیا کہ یہ اصلی نہیں بلکہ مصنوعی ہے لیکن جب مفتی محمد شفیع نے اس امر کے متعلق دیوبند سے استفسار کیا تو اس دارالعلوم کے دفتر سے اس فتویٰ کی ایک نقل موصول ہوگئی جس پر دارالعلوم کے تمام اساتذہ کے دستخط ثبت تھے اور ان میں مفتی محمد شفیع صاحب کے دستخط بھی شامل تھے۔ اس فتوے میں لکھا ہے کہ جو لوگ حضرت صدّیق اکبرؓ کی صاحبیّت پر ایمان نہیں رکھتے، جو لوگ حضرت عائشہ صدّیقہؓ کے قاذف ہیں اور جو لوگ قرآن میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں وہ کافر ہیں۔ مسٹر ابراہیم علی چشتی نے بھی جنہوں نے مطالعہ کیا ہے اور اپنے مضمون سے باخبر ہیں اس رائے کی تائید کی ہے ان کے نزدیک شیعہ اپنے اس عقیدہ کی وجہ سے کافر ہیں کہ حضرت علیؓ نبوت میں ہمارے رسولِ پاکؐ کے شریک تھے۔ مسٹر چشتی نے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کیا ہے کہ اگر کوئی سنّی اپنا عقیدہ بدل کر شیعوں کا ہم خیال ہو جائے تو آیا وہ اس ارتداد کا مرتکب ہوگا جس کی سزا موت ہے؟ شیعوں کے نزدیک تمام سنّی کافر ہیں اور اہل قرآن یعنی وہ لوگ جو حدیث کو غیر معتبر سمجھتے ہیں اور واجب التعمیل نہیں مانتے متفقہ طور پر کافر ہیں اور یہی حال آزاد مفکرین کا ہے۔ اس تمام بحث کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ شیعہ، سنّی، دیوبندی، اہل حدیث اور بریلوی لوگوں میں سے کوئی بھی مسلم نہیں اور اگر مملکت کی حکومت ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو دوسری جماعت کو کافر سمجھتی ہے تو جہاں کوئی شخص ایک عقیدہ کو بدل کر دوسرا اختیار کرے گا اُس کو اسلامی مملکت میں لازماً موت کی سزا دی جائے گی اور جب یہ حقیقت مدّنظر رکھی جائے کہ ہمارے سامنے مسلم کی تعریف کے معاملے میں کوئی دو عالم بھی متّفق الرّائے نہیں ہو سکے تو اس عقیدے کے نتائج کا

قیاس کرنے کے لئے کسی خاص قوّتِ متخیلہ کی ضرورت نہیں۔ اگر علماء کی پیش کی ہوئی تعریفوں میں سے ہر تعریف کو معتبر سمجھا جائے پھر انہیں تحلیل و تحویل کے قاعدے کے ماتحت لایا جائے اور نمونے کے طور پر الزام کی وہ شکل اختیار کی جائے جو گلیلیو کے خلاف ان کویزیشن کے فیصلے میں اختیار کی گئی تھی تو اُن وجوہ کی تعداد بے شمار ہو جائے گی جن کی بناء پر کسی شخص کا ارتداد ثابت کیا جا سکے[1]۔''

پس ان حالات کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اگر ان مسلمان فرقوں میں سے کسی ایک کے علماء کے ہاتھ میں ''اقتدار'' آ جائے تو باقی تمام فرقوں کے افراد کا قتل عام جائز قرار نہیں دیا جائے گا۔ یقیناً ایسا ہی ہو گا مگر اس فرق کے ساتھ کہ اُس وقت کفر و ارتداد کے فتوے انفرادی طور پر شائع ہونے کی بجائے حکومتِ وقت کے بلیٹینز (BULLETINS) کی صورت میں شائع ہوا کریں گے یا وزراء کی پریس کانفرنس میں شاید ان کا اعلان کیا جائے اور یہ تمام فتوے یکطرفہ ہوں گے اور کسی مخالف عقیدہ کے عالم کو یہ حق نہ ہو گا کہ مسلمان حکومت کے کسی عالم کے خلاف فتویٰ جاری کر سکے بلکہ فتویٰ کا کیا سوال اُس کے لئے تو اپنی جانِ عزیز بچانا بھی ناممکن ہو گا سوائے اس کے کہ تقیّہ سے کام لے اور

''اگر وہ ایسا ہی راستی پسند ہے کہ منافق بن کر رہنا نہیں چاہتا بلکہ جس چیز پر اب ایمان لایا ہے اس کی پیروی میں صادق ہونا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو سزائے موت کے لئے کیوں پیش نہیں کرتا؟''

بلیٹینز کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ گلوٹینز (گردن اڑانے کا ایک آلہ) کی حرکت بھی تیز تر ہوتی چلی جائے گی اور دھڑا دھڑ سر دھڑ سے جدا ہونے لگیں گے۔ اور جیسا کہ ہر ایسے تشدّد کے دور میں ہوا کرتا ہے اُن راستی پسندوں کے سوا بھی جو منافق بن کر زندہ نہیں رہنا چاہتے اور گیدڑ کی سو سالہ زندگی پر شیر کی نصف گھنٹہ کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو ارتداد کے الزام میں ماخوذ کئے جائیں گے یعنی وہ لوگ جن کے دشمن انہیں حکومتِ وقت کے ہاتھوں مروانے کے لئے اُن پر کفر کے الزام لگائیں گے (جیسا کہ پہلے بھی لگتے آئے ہیں اور آج بھی لگ رہے ہیں) اور عدالتوں میں

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ صفحہ ۲۳۶، ۲۳۷

کثرت کے ساتھ حلفیہ گواہ پیش ہوا کریں گے کہ فلاں ابنِ فلاں نے بریلوی یا دیو بندی یا مودودی عقائد کے خلاف (جس کسی کی بھی حکومت ہو) یہ یہ کفر بکے تھے۔ چنانچہ ایسے ملزمین کے انکار پر لازماً انہیں پولیس کی تحویل میں مزید تحقیق کے لئے دے دیا جایا کرے گا اور انہیں طرح طرح کی خوفناک اذیّتیں دے کر پوچھا جائے گا کہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتاؤ کہ تم نے فلاں کلمۂ کفر کہا تھا یا نہیں۔ پس کچھ تو وہ ہوں گے جو خدا کو حاضر و ناظر جان کر اُس کلمۂ کفر سے انکار کریں گے اور اس ''جھوٹ'' کی پاداش میں خوفناک اذیّتیں سہہ سہہ کر جان دے دیں گے اور کچھ وہ ہوں گے جو اُن ظلموں سے تنگ آ کر آخر خدا تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر یہ اقرار کر لیں گے کہ ہاں ہم نے یہ کلمۂ کفر بکا تھا اور اس ''اظہارِ صداقت'' کی پاداش میں ان کی گردنیں شمشیر یا گلوٹین کے ایک وار سے اُڑا دی جائیں گی۔

اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''اسلامی حکومت'' کی اس عملی تصویر کو دیکھ کر غیر اسلامی دنیا سخت برافروختہ اور متنفر ہو گی اور ''اسلام'' کے خلاف شدید نفرت کے جذبات سینوں میں بھڑک اٹھیں گے حتّٰی کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی حسین تعلیم کو، جو دراصل سراپا امن اور سلامتی کی تعلیم ہے، مجسم وحشت اور بربریت کے نام دیئے جانے لگیں گے اور دنیا اس دین سے سخت برگشتہ ہو جائے گی۔ اور وہ افریقہ بھی جو احمدیت کے دلنشین پیغام کو سن کر اسلام کی طرف تیز قدموں کے ساتھ دوڑا چلا آ رہا ہے اپنے قدم روک لے گا بلکہ اُلٹے پاؤں پھر جائے گا اور وہ امریکہ بھی جس کے ہزاروں باشندوں کو احمدیت اسلام کی آغوش میں کھینچ لائی ہے سخت مشکوک نظروں سے اس مقدس تعلیم کو دیکھنے لگے گا اور یورپ کی بھی وہ تمام ریاستیں جہاں احمدی مبلغین پانچ وقت نعرہ ہائے توحید بلند کرتے ہیں یک دفعہ اسلام کے نام سے بیزار ہو جائیں گی مگر برسرِ اقتدار علماء کی بلا سے یہ سب کچھ ہوتا رہے، اُن کو تو اسلام کی سربلندی ''مرتدّین'' کے زیرِ زمین ہونے میں ہی نظر آئے گی۔ پس ان کی بلا سے اگر اسلام کی تبلیغ غیر مذاہب میں رکتی ہے تو رکتی پھرے اور ان کی بلا سے اگر مسلمان بڑھنے کی بجائے کم ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں۔ جب تک کروڑوں کروڑ مسلمان ارتداد کے الزام میں قتل نہیں کئے جائیں گے ان کے نزدیک اسلام فتح یاب اور ظفر مند نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے اس زمانہ کے علمائے اسلام کے نزدیک اسلامی ریاست کا تصور اور فتح اسلام کا

نقشہ۔ کیا یہی تصور نعوذ باللہ ہمارے آقا بانیٔ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کے دل میں بھی تھا؟

مولانا مودودی کے عقب میں کتنے ہیں وہ علماء جو اس سوال کا یہ جواب دے سکیں کہ:-

ہاں یہی تھا وہ تصور۔ وہ تصور یہی تھا۔ یہی تھا......!

اس امکانی جواب کے تصور سے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آخر کب تک امّت کے علماء اپنے مقدس و مطہّر رسولؐ کی طرف (خدا تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں اور درود ہوں اُس کی ذات اور اُس کی آل پر) ظلم و تشدّد کے تصورات منسوب کرتے رہیں گے؟، آخر کب تک انصاف کے نام پر ظلم اور امن کے نام پر بدامنی کی تعلیم دی جاتی رہے گی؟ اور کب تک رحمت کے نام پر جور و ستم اور تقدس کے نام پر باپردہ بیبیوں کی بے آبروئی کا درس دیا جاتا رہے گا؟ سبّ و شتم کی غیر اسلامی رسومات آخر کب ترک کی جائیں گی؟ اور کب مخالف فرقوں پر بے بنیاد الزام لگانے کا سلسلہ بند ہوگا؟

یہ راتیں کب ختم ہوں گی اور وہ دن کب آئیں گے جب خدا کی عظمت کو قائم کرنے کے لئے خون کی ہولی نہیں کھیلی جائے گی؟

اور میں سوچتا ہوں کہ کیا اسی طرح سپین کی انکویزیشن کی تاریخ دہرائی جاتی رہے گی اور مادام تُوسو کے ''ایوان ہائے وحشت'' آباد ہوتے رہیں گے؟ــــ اور جب میں یہ سوچتا ہوں تو معاً قرآن کریم کی اس آیت کی طرف میرا ذہن منتقل ہو جاتا ہے کہ:-

وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ۔ وَ الْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ۔ وَ شَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ۔ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ۔ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ (البروج: ۲تا۶)

مجھے ''برجوں والے آسمان اور موعود دن اور شاہد اور مشہود کی قسم ہے کہ کھائیوں والے ہلاک ہو گئے۔ یعنی کھائیوں میں وہ آگ جلانے والے جن میں خوب ایندھن جھونکا گیا تھا۔''

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے!!!

۱۹۵۳ء کا سرخ دور گزر گیا اور کتنے ہی بے کسوں کے خون نے احمدیت میں ایک نیا رنگ بھر دیا اور اس کی رگوں میں قربانیوں کا تازہ اور پاکیزہ خون دوڑنے لگا۔ اس دور میں احمدیوں کا حال کچھ اسی طرح تھا جس طرح ایک بچہ بھیانک خطرات سے دہشت زدہ ہو کر اپنے بازو کھولے ہوئے ماں کی طرف بے محابا لپکتا ہے۔ پس وہ بھی اپنے رحمٰن و رحیم خدا کی آغوش میں پناہ لینے کے لئے اس کی طرف دوڑے اور سخت گریہ وزاری کے ساتھ اس کے حضور عاجزانہ دعاؤں میں لگ گئے۔ بہت سے ایسے کمزور جو کبھی نمازوں میں بھی غفلت کر جاتے تھے اپنے بستروں سے راتوں کو اٹھ اٹھ کر سجدوں میں گرنے لگے اور اپنی سجدہ گاہوں کو خون کے آنسو رو رو کر تر کر دیا یہاں تک کہ آسمان سے ان پر سکینت نازل ہوئی اور خدا ان کے دلوں میں اتر آیا اور ہر آن ان کے ساتھ رہنے لگا۔

پس وہ ہر خطرے سے بے خطر ہو گئے اور ہر خوف ان کے دلوں سے جاتا رہا۔ انہوں نے وہ سب کچھ پالیا جس کے حصول کے لئے بنی آدم پیدا کئے گئے تھے۔ حتّٰی کہ وہ تہی دست بھی جن کے گھر لوٹے گئے تھے اور عمر بھر کے جمع شدہ اثاثے چھینے گئے تھے ایمان و عرفان کی دولت سے مالا مال ہو کر اس سودے پر خوش ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ چند حقیر پیسوں کے بدلہ میں انہوں نے وہ دولت پائی ہے جو قارون کے خزانوں کو بھی میسر نہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں فقر اور غناء کا جو مقام انہیں نصیب ہوا ہے وہ قیصر و کسریٰ کے مقدر میں بھی نہ تھا!

انہوں نے بخوشی اس راہ میں جانیں دیں، چھرے ان کے سینوں میں بھونکے گئے، وہ آگ

میں جلائے گئے، وہ مارے اور پیٹے گئے اور طرح طرح کی جسمانی اذیتیں انہیں دی گئیں لیکن وہ اس راہ میں ثابت قدم رہے جیسے ان سے پہلے بھی ہمیشہ وہ لوگ ثابت قدم رہتے آئے ہیں جن کے دل اس ایمان اور یقین سے پُر ہوا کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ وہ حق اور راستی کی راہ میں برداشت کر رہے ہیں۔ جو جانتے ہیں کہ اُن کے دلوں میں بنی نوع انسان کی بہبودی کے سوا اور کوئی جذبات نہیں۔ اُن کے اقوال بھی اس امر کی گواہی دیتے ہیں اور ان کے افعال بھی۔ اور ان کی ساری زندگی ہمدردی اور شفقت اور خوش خلقی اور صبر اور تقوی اللہ کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ اُن میں سے بعض کمزور اس امتحان کی دشوار گزار راہوں میں آخر تک وفا نہ دکھا سکے اور عشق کے مشکل ترین مقامات پر کچھ یہاں رہ گئے اور کچھ وہاں۔ مگر ایسے کمزوروں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ شاید ہزار یا دس ہزار میں سے ایک۔ مگر ان کی علیحدگی نقصان کا موجب ہونے کی بجائے جماعت کے لئے مزید تقویّت کا موجب ثابت ہوئی اور مزید برکتوں کا پیش خیمہ بنی۔ جماعت کا سوادِ اعظم بہرحال انتہائی صبر اور استقلال کے ساتھ اپنے عہد و پیمان پر قائم رہا۔

انہوں نے بخوشی اس راہ میں جانیں دیں اور انتہائی صبر کے ساتھ ہر ذلّت کو قبول کیا۔ ان کے منہ کالے کر کے انہیں گلیوں میں پھرایا گیا اور گند اور کیچڑ ان پر اچھالے گئے، اُن کے سوانگ بھرے گئے اور جوتیوں کے ہار اُن کے گلوں میں ڈالے گئے۔ وہ دنیا کی ہر مکروہ گالی اور گندے الزام کا نشانہ بن گئے اور خود اپنے محلّوں ہی کی گلیوں میں پھرنا اُن کے لئے دشوار ہو گیا۔ اُن کے اُن معصوم بچوں پر بھی آوازے کسے جانے لگے جو نہیں جانتے تھے کہ کس جرم کی سزا انہیں دی جا رہی ہے۔ وہ ہر روز مدرسوں اور بازاروں سے زخمی دل اور آبدیدہ آنکھوں کے ساتھ گھروں کو لوٹتے تھے۔ عجیب و غریب اجنبی ناموں سے اُن کو پکارا جاتا تھا اور دوسرے بچے اپنے ماحول کی تقلید میں اُن پر تالیاں پیٹتے تھے اور ''مرزائی کتّا'' کی آوازیں جگہ جگہ بلند ہوتی تھیں۔ یہ سب کچھ اُن کی سمجھ سے بالا تر تھا۔ پس وہ سر پھینکے، دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ، چھوٹے چھوٹے تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے گھروں کی پُرامن چار دیواری کی طرف بڑھتے تھے مگر اُن مختصر صحنوں کی سلامتی بھی بسا اوقات گلی سے پھینکے ہوئے پتھروں سے یک دفعہ جھنجھنا کر ٹوٹ جاتی تھی یا غلاظت کے پلندوں اور قتل کی دھمکیوں پر مشتمل

خطوط سے مکدّر ہونے لگتی تھی۔ احمدی ماں باپ نے یہ سب کچھ دیکھا اور اپنے بچوں کے زخم بھی اپنے سینوں پر کھائے مگر اُن کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی!

آخر یہ حیرت انگیز ماجرا کیوں کر گزرا اور یہ عظیم الشّان صبر کی طاقت انہوں نے کہاں سے پائی؟ وہ کون سا مستحکم یقین تھا جو ان آڑے وقتوں میں اُن کے دلوں کا سہارا بن گیا؟

اگر وہ دروغ گو اور فتنہ پرداز اور جھوٹے اور دجّال تھے۔ اگر احمدیّت ایک دکانداری تھی اور یہ سب سلسلہ انگریز کی غلامی اور دنیا کی لالچ کی خاطر قائم کیا گیا تھا تو اس پیغام کی خاطر دنیا کی ہر لالچ کو انہوں نے کیسے ٹھکرا دیا اور اپنے اموال اپنی آنکھوں کے سامنے کیسے لُٹتے دیکھے؟

اپنی جان اور عزت کے لئے ہر خطرہ کیونکر مول لے لیا اور کیوں انہوں نے غیر متزلزل عزم اور صبر کے نمونے دکھائے جن کی توفیق صرف صادق اور راستباز کو عطا ہوتی ہے؟ اِس کی وجہ درحقیقت وہی وجہ تھی جس کا ذکر کرتے ہوئے بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام فرماتے ہیں:-

قوم کے ظلم سے تنگ آ کے مرے پیارے آج
شورِ محشر ترے کوچہ میں مچایا ہم نے
کافر و ملحد و دجّال ہمیں کہتے ہیں
نام کیا کیا غمِ ملّت میں رکھایا ہم نے
تیرے مُنہ کی ہی قسم میرے پیارے احمدؐ
تیری خاطر سے یہ سب بار اٹھایا ہم نے

اور اُن خطرناک دنوں میں بھی ہمارے دل اس یقین سے پُر تھے کہ آخر ایک دن محبت کو نفرت پر فتح نصیب ہو کر رہے گی۔ یہ بگڑے ہوئے تیور ضرور بدلیں گے اور یہ روٹھے ہوئے بھائی ضرور منیں گے، جذبۂ دل آخر کام کرے گا اور اخلاق کی کشش انہیں بہرحال ہمارے سینوں کی طرف کھینچ لائے گی۔ ہمارے کانوں میں امام جماعت احمدیہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمدؓ کا یہ سکینت بخش پیغام نغمہ ریز تھا اور آج بھی ہے کہ:-

دشمن کو ظلم کی برچھی سے تم سینہ و دل برمانے دو
یہ درد رہے گا بن کے دوا ۔ تم صبر کرو وقت آنے دو
جب سونا آگ میں پڑتا ہے تو کندن بن کے نکلتا ہے
پھر گالیوں سے کیوں ڈرتے ہو دل جلتے ہیں جل جانے دو
تم دیکھو گے کہ انہی میں سے قطراتِ محبت ٹپکیں گے
بادل آفات و مصائب کے چھاتے ہیں اگر تو چھانے دو

پس آفات و مصائب کے بادل آئے اور چلے گئے ۔ اُن کی بجلیاں ہمیں جلا نہ سکیں بلکہ قطراتِ محبت ٹپکا کر چلی گئیں ۔ یہ بادل پھر بھی آتے رہیں گے اور چھاتے رہیں گے مگر ہمیشہ یہ ہمیں اپنی بجلیوں سے بے خوف قطراتِ محبت کی انتظار میں آنکھیں بچھائے ہوئے پائیں گے اور وہ دن بہت دور نہیں کہ یہ قطراتِ محبت ایسے برسیں گے کہ سب کدورتیں دھل جائیں گی تب رحمت کے آسمانی پانی سے جل تھل ایک ہو جائیں گے اور اس رحمت کے پانی پر خدا کا عرش پھر سے قائم ہو گا!

دین سے اُلٹے پاؤں پھر جانے سے متعلق اسلامی تعلیم

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ اُکْتُبُوْا لِیْ مَنْ تَلَفَّظَ بِالْاِسْلَامِ[1]

میرے پاس مردم شماری کے طور پر ان تمام لوگوں کے نام لکھ کر لاؤ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں۔

قرونِ وسطیٰ کی مسیحیت میں ''ارتداد'' سے جو مخصوص مفہوم لیا جاتا تھا اور جسے اس زمانہ میں اسلام کے نام پر مولانا مودودی نے بڑی وضاحت اور شدّ ومد سے پیش کیا ہے جبکہ عربی زبان میں ارتداد کے اس مخصوص مفہوم کے لئے سِرے سے کوئی لفظ ہی موجود نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی زمانہ کے بعض مسلم فقہاء کے نزدیک اسلام سے اُلٹے پاؤں پھر جانا سزائے موت کا مستوجب بنانے والا جُرم تھا لیکن ان فقہاء کے نزدیک ''مسلم'' کی تعریف اتنی فراخ دلی کی آئینہ دار تھی کہ جو شخص بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتا اسے اس تعریف کی رو سے دین سے الٹے پاؤں پھر جانے والا قرار دیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری راہنمائی کے لئے ہمیں ''مسلم'' کی دو تعریفیں عنایت فرمائی ہیں۔ پہلی تعریف کی رو سے آپؐ نے مدینہ کی پہلی مردم شماری کے وقت ہدایت فرمائی کہ میرے پاس مردم شماری کے طور پر ان تمام لوگوں کے نام لکھ لاؤ جن کا ہر فرد اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو[2]۔ ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا جو شخص بھی ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کر کے ہماری طرح نماز پڑھتا ہے اور ہمارا ذبیحہ کھاتا ہے وہ مسلمان ہے۔ اس کے جان و مال کی حفاظت کے اللہ اور

---

[1]، [2] صحیح البخاری کتاب الجهاد باب کتابة الامام النّاس

اس کے رسولؐ ذمہ دار ہیں۔ اللہ کی اس ذمہ داری کی ہرگز خلاف ورزی نہ کرو[1]۔

لیکن مولانا مودودی اور دوسرے علماء نے جو مسلم ممالک میں آمریت یا مطلق العنان بادشاہت پر مبنی حکومتوں کے زیردست اور مؤید ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ اس سیدھی سادی تعریف میں اپنی طرف سے بھی بعض شرائط کا اضافہ کر ڈالا ہے۔ اگر حضرت امام غزالیؒ (۴۵۰ھ تا ۵۰۵ھ مطابق ۱۰۵۸ء تا ۱۱۱۳ء) کے الفاظ کو مدّنظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو ایسے علماء نے جنت پر گنے چنے مولویوں کے مختصر ٹولے کا خصوصی استحقاق جتانے کی خاطر اللہ کی رحمت بے پایاں کو محدود کر کے رکھ دیا ہے[2]۔

پاکستان کے ایک سابق چیف جسٹس جناب جسٹس محمد منیر نے جو ۱۹۵۳ء کے فسادات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت کے پریذیڈنٹ تھے۔ ایسے علماء کی اس تمام ترتگ و دو کے نتائج پر خلاصتہً ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:-

> ''علماء کی بیان کردہ مختلف تعریفوں کو پیش نظر رکھ کر کیا ہماری طرف سے کسی تبصرے کی ضرورت ہے؟ بجز اس کے کہ دین کے کوئی دو عالم اس بنیادی امر (یعنی مسلمان کی تعریف) پر متفق نہیں ہیں؟ اگر ہم اپنی طرف سے ''مسلم'' کی کوئی تعریف کر دیں جیسے ہر عالم دین نے کی ہے اور وہ تعریف ان تعریفوں سے مختلف ہو جو دوسروں نے پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا اور اگر ہم علماء میں سے کسی ایک کی تعریف کو اختیار کر لیں تو ہم اس عالم کے نزدیک مسلمان رہیں گے لیکن دوسرے تمام علماء کی تعریف کی رو سے کافر ہو جائیں گے[3]۔''

جسٹس منیر کے اس فکر انگیز اظہارِ خیال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سرزنش کی روشنی میں پڑھا جائے جو آپؐ نے ایک خاص موقع پر اسامہ بن زیدؓ کو فرمائی تھی تو اصل حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ غزوۂ غالب بن عبداللہ الکلبی میں اسامہ بن زیدؓ اور ایک اور شخص

۱۔ صحیح البخاری کتاب الصلوٰۃ باب استقبال القبلۃ

۲۔ الغزالی۔ فیصل التّفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ قاھرہ ۱۹۰۱ء

۳۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات پنجاب (اردو) ۱۹۵۳ء صفحہ ۲۳۵، ۲۳۶

نے ایک آدمی کو اپنی زد میں لاکر ہلاک کر ڈالا۔ خود اُسامہ بن زیدؓ کے اپنے الفاظ میں اس واقعہ کی تفصیل یہاں درج کرنا مناسب ہوگا وہ کہتے ہیں:-

''میں اور ایک انصاری اُس آدمی کو اپنی زد میں لائے۔ جب ہم دونوں نے اس پر اپنے ہتھیار اٹھائے تو اس نے کہا اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں) لیکن ہم نے اس بات کا یقین نہ کر کے اپنے ہتھیار روکے نہیں اور اسے قتل کر دیا۔ پھر جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ہم نے آپؐ کو پورا واقعہ بتایا۔ آپؐ نے فرمایا ''اُسامہ! لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے اعراض پر تمہیں کون بری الذمّہ قرار دے گا؟'' اس پر میں نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! اس نے یہ کلمہ محض قتل سے بچنے کے لئے اپنی زبان سے ادا کیا تھا''۔ آپؐ نے پھر فرمایا ''اُسامہ! لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے اعراض پر تمہیں کون بری الذمّہ قرار دے گا؟''

اسامہ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں ''قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، آپؐ برابر یہی جملہ (یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے اعراض پر تمہیں کون بری الذمّہ قرار دے گا؟) دہراتے رہے یہاں تک کہ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آج سے پہلے میں نے اسلام قبول نہ کیا ہوتا اور یہ کہ میں اسے قتل نہ کرتا۔'' پھر میں نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! مجھے موقع عنایت فرمایئے میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ اب کبھی کسی ایسے شخص کو قتل نہ کروں گا جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا: اسامہ میرے بعد (یعنی میری وفات کے بعد) بھی یہی کہو گے۔ میں نے عرض کیا ہاں آپؐ کے بعد بھی[1]''

حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ کلمہ پر ایمان رکھنے اور اس کی شہادت دینے والوں کی زندگیوں کے بارہ میں میری تشویش کے باوجود میرے بعد ایسے لوگوں کو غلط کار لوگ اسلام کے نام پر قتل کرنے سے باز نہیں آئیں گے اور ان بے چاروں کو بلا وجہ اپنی زندگیوں سے ہاتھ

[1] عبدالملک بن ہشام ''سیرۃ رسول اللہ'' (گوٹنجن ۱۸۵۶ء تا ۱۸۶۰ء) صفحہ ۹۸۴، مترجمہ اے گوئیلام ''دی لائف آف محمد'' لندن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۷۰ء صفحہ ۶۶۷

دھونا پڑیں گے اسی لئے آپؐ نے اسامہؓ سے یہ عہد لیا کہ وہ آپؐ کے وصال کے بعد بھی کسی کلمہ گو کو قتل نہیں کریں گے۔ مسند احمد بن حنبل میں درج شدہ روایت کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زیدؓ سے یہ بھی فرمایا۔ کیا تم نے اس شخص کا جسے تم نے قتل کر دیا دل چیر کر یہ تسلی کر لی تھی کہ واقعی اس کا دل ایمان سے خالی ہے؟[1]۔ مراد اس سے آپؐ کی یہ تھی کہ دل کا حال تو خدا جانتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کے دل کا بھید کیسے جان سکتا ہے؟ اس لئے ایمان کے معاملہ میں زبانی اقرار ہی کافی ہے اور اس اقرار سے ہی اقرار کرنے والے کے جان و مال کو تحفظ حاصل ہو جاتا ہے اس کے باوجود اقتدار کے بھوکے ملّاں سیاسی اغراض کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنے ان مسلمان بھائیوں کے قتل پر اکساتے رہتے ہیں جن کا نقطۂ نظر ان کے اپنے نقطۂ نظر سے قدرے مختلف ہو اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ گویا انہوں نے ان کا دل چیر کر معلوم کر لیا ہے کہ ان کا ایمان بناوٹی اور مصنوعی ہے۔

اُلٹے پاؤں پھر جانے کے لئے قرآن نے ارتداد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس لفظ سے ہی ظاہر ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے متعلق یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ وہ مرتد ہے۔ امام راغب اصفہانی نے واضح فرمایا ہے کہ لفظ ارتداد کے معنی ہیں اپنے قدموں کو اس حد تک واپس لے جانا جہاں سے چل کر کوئی شخص آیا تھا[2]۔ ظاہر ہے اپنے قدموں سے چل کر واپس جانا، جانے والے کا اپنا اختیاری فعل ہے وہ اگر واپس جائے گا تو خود چل کر واپس جائے گا۔ اس لئے اپنے مرتد ہونے کا وہ خود تو اقرار یا اعلان کر سکتا ہے لیکن کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی مرضی کے برخلاف اس کو مرتد ٹھہرائے یا قرار دے۔ ارتداد کا لفظ خاص طور پر اسلام سے کفر کی طرف واپس لوٹنے کے لئے بولا جاتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کی درج ذیل آیات سے ظاہر ہے:-

اِنَّ الَّذِیۡنَ ارۡتَدُّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِہِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡہُدَی (محمد:۲۶)

ترجمہ:- وہ لوگ جو ہدایت ظاہر ہونے کے بعد اُس سے پھر گئے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِہٖ (المائدۃ:۵۵)

ترجمہ:- اے ایمان والو! جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے۔

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۰ [2] المفردات فی غریب القرآن

ردّ کا لفظ فعل لازم ہے اس کا مادہ ہے ر دد۔ اس کا فعل متعدی ہوتا ہی نہیں۔ ایک آدمی خود تو دین سے پھر سکتا ہے کوئی دوسرا شخص اس پر ارتداد کو ٹھونس کر اسے مرتد نہیں بنا سکتا۔ دین سے پھر جانا ایک رضا کارانہ عمل ہے۔ اس میں کسی بیرونی آلۂ کار یا واسطے کی شرکت و مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آزادانہ ارادے اور مرضی کا ہونا وہ مابہ الامتیاز ہے جو ارتداد کو اس کے مسیحی اور مودودی تصور سے الگ کر دکھاتا ہے۔ ارتداد کے پسِ پردہ اُلٹے پاؤں پھر جانے والے کا رضا کارانہ ارادہ اور مرضی لازمی طور پر کارفرما ہوتی ہے جبکہ مسیحی اور مودودی تصور جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں واضح کر چکے ہیں اس سے یکسر مُبرّا ہے۔ اس انوکھے تصور کی رو سے ارتداد دوسروں کی اپنی مرضی کے برخلاف ان پر ٹھونسا جاتا ہے اور انہیں زبردستی مرتد قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ارتداد اور پھر اس کی سزا کے لئے ایک بیرونی اتھارٹی یعنی مقتدرہ کا ہونا ضروری ہے۔ وہ صاحبِ اقتدار ادارہ چرچ کی شکل میں مذہبی بھی ہوسکتا ہے اور حکومت کی شکل میں غیر مذہبی بھی۔ بات واضح کرنے کی خاطر از راہِ امتثال کہا جاسکتا ہے کہ ان کا یہ تصور پھانسی یا قتل کے مترادف ہے جبکہ ارتداد خودکشی کے ذیل میں آتا ہے۔ ایک شخص دوسرے کو پھانسی دے سکتا یا قتل کرسکتا ہے اُس کو خودکشی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔

سورۃ الکافرون جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ نبوّت پر فائز ہونے کے بعد ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی تھی، آزادیٔ ضمیر سے متعلق براہ راست ایک پالیسی بیان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سورۃ میں رسولؐ اللہ سے کہا گیا کہ آپؐ کافروں کو بتا دیں کہ زندگی گزارنے اور بسر کرنے کے اُن کے طریق اور آپؐ کے طریق میں باہمی میل ملاپ یا اشتراک و تعاون کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مذہب کے بنیادی تصورات ہی میں نہیں بلکہ ان کی تفصیلات میں نیز زندگی کے دیگر پہلوؤں میں بھی دونوں کے درمیان بُعد المشرقین پایا جاتا ہے اس لئے دونوں میں کسی مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (الکافرون:۷)

ترجمہ:- تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔

یعنی اے کافرو! تم اپنے دین پر عمل پیرا رہو اور میں اپنے دین پر عمل پیرا رہوں۔ دونوں

اپنے اپنے دین پر قائم رہنے اور اُس پر عمل کرنے میں آزاد ہیں۔ جس کسی کو جو مذہب پسند ہو اُسے اس مذہب کو اختیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی پوری پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی بار بار بتایا گیا کہ اگر کفار آپؐ کے لائے ہوئے پیغام کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تو آپؐ اس پر دلگیر نہ ہوں۔ آپؐ ان کے ایمان لانے یا نہ لانے کے ذمّہ دار نہیں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوۡمُكَ وَهُوَ الۡحَقُّ ؕ قُلۡ لَّسۡتُ عَلَيۡكُمۡ بِوَكِيۡلٍ[۱] (الانعام:٦٧)

ترجمہ۔ تیری قوم نے اُس پیغام کو جو ہم نے تیرے ذریعہ بھیجا ہے مسترد کر دیا ہے حالانکہ وہ پیغام سراسر سچائی پر مبنی ہے تو اُن سے کہہ دے میں تم پر نگران مقرر نہیں کیا گیا ہوں۔

یہ اعلان مکّی دور میں کیا گیا تھا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے متبعین کو مذہب کے نام پر تعزیر و تعذیب کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ بعد ازاں جب آپؐ مدینہ تشریف لے آئے تو اس امر کے باوجود کہ وہاں آپؐ کو قوت و اقتدار حاصل تھا مذہبی آزادی کا یہ چارٹر علیٰ حالہٖ قائم رہا۔ نہ صرف یہ کہ یہ چارٹر منسوخ نہیں ہوا بلکہ یہ زیادہ واضح اور قطعی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔

پہلی مدنی سورۃ جس میں آزادیٔ ضمیر کے موضوع پر زیادہ تفصیل سے بحث کی گئی ہے سورۃ البقرۃ ہے۔ اس سورۃ کی آیت ۲۵۷ اس موضوع سے متعلق واضح ترین اعلان پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ ۚ فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ‌ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ (البقرۃ:۲۵۷)

ترجمہ:- دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر جائز نہیں۔ ہدایت اور گمراہی کا فرق خوب

۱۔ الانبیاء کی آیت ۱۰۸، یونس کی آیت ۱۰۹، بنی اسرائیل کی آیت ۵۵، الزمر کی آیت ۴۲، الشوریٰ کی آیت ۷ بھی اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ لفظ وکیل کی تشریح امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر (قاہرہ ۱۳۰۸ھ) جلد چہارم صفحہ ۲۶، ۳۶ میں نیز محمد عبدہ کی تفسیر القرآن میں اور محمد رشید رضا کی تفسیر المنار (بیروت ۱۳۳۷ھ) جلد ہفتم صفحات ۵۰۱ تا ۵۰۳، ۲۶۲، ۲۶۳ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ظاہر ہو چکا ہے۔ پس جو شخص (اپنی مرضی سے) نیکی سے روکنے والے کی بات ماننے سے انکار کرے اور اللہ پر ایمان رکھے تو اس نے ایک نہایت مضبوط اور قابلِ اعتماد چیز کو جو کبھی ٹوٹنے کی نہیں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور اللہ بہت سننے والا اور بہت جاننے والا ہے۔

یہ ایک ایسے نبی کی طرف سے انتہائی پُر اعتماد اعلان ہے جس نے ایک ایسے شہر میں ایک نئی امت کی بنیاد ڈالی ہے جس میں اسے کلی اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے۔ اس امر کے پیشِ نظر کہ کہیں جہاد کے مسئلہ کو غلط رنگ دے کر غلط فہمی نہ پیدا کی جائے یہ امر مسلمانوں کے ذہن نشین کرایا جا رہا ہے کہ نیکی، ایمان اور اعمالِ صالحہ بجا لانے میں مضمر ہے (آیات ۱۷۰ تا ۲۴۲)۔ اس کے بعد آیت الکرسی یعنی آیت ۲۵۶ میں اللہ تعالیٰ کی ارفع و اعلیٰ شان اور اس کی قوت و جبروت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر آیت الکرسی کے معاً بعد 'مذہب میں کوئی جبر نہیں' کا اعلان عام کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والے یہ سمجھ سکتے تھے کہ خدا مسلمانوں سے یہ چاہتا ہے کہ وہ طاقت کے بل پر اسلام پھیلائیں کیونکہ اس میں انہیں امت کے دشمنوں سے لڑنے اور خدا کی راہ میں قربانیاں پیش کرنے کے لئے کہا گیا ہے چنانچہ ان کی یہ غلط فہمی دور کرنے کے لئے اس آیۂ کریمہ میں مسلمانوں کو ہر قسم کے ابہام سے مبرّا انتہائی درجہ واضح الفاظ میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ اشاعتِ اسلام کی غرض سے طاقت استعمال کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ اس آیت کی اہمیت کا اندازہ ایک حدیث سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو جامع ترمذی میں درج ہے اُس حدیث کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ البقرہ قرآن کی چوٹی (یعنی اس کا بلند ترین حصہ) ہے۔ جو شخص بھی اس کی دس آیات کی تلاوت کو اپنا معمول بنائے گا شیطان اس کے گھر میں داخل نہیں ہو سکے گا (وہ دس آیات یہ ہیں سورۃ البقرۃ کی پہلی چار آیات، آیت الکرسی، اس کے معاً بعد کی دو آیات یعنی ۲۵۷، ۲۵۸ اور آخری تین آیات) اِن دس آیات میں اس آیۂ کریمہ کو شامل فرمانے سے جس میں دین کے معاملہ میں جبر جائز نہیں، کا اعلانِ عام کیا گیا ہے یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ اس اعلانِ عام کو ہمیشہ ہمیش کے لئے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

اس اصول کو کہ ''دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر جائز نہیں'' بدر کی فتح کے بعد بڑی شدّ و مدّ کے ساتھ دہرایا گیا۔ پہلے سورۃ النساء کی آیت ۲۱ میں اس کا اعادہ ہوا اور پھر سب سے آخر میں نازل

ہونے والی سورۃ یعنی سورۃ المائدہ میں اس اصول کوایک بار پھر دہرا کر اس کی اہمیت ذہن نشین کرائی گئی۔ اب جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار نہ صرف مدینہ بلکہ مکّہ میں بھی پورے طور پر قائم ہو چکا تھا اس امر کو صراحت کے ساتھ واضح کرنا ضروری تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل ذمّہ داری ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ آپؐ اللہ کے پیغام کولوگوں تک پہنچا دیں۔ چنانچہ فرمایا:-

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (المائدة:۹۳)

ترجمہ:-تم اللہ کی بھی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو اور ہوشیار رہو اور (اگر اس تنبیہ کے بعد بھی) تم پھر گئے تو جان لو ہمارے رسول کے ذمّہ تو کھول کھول کر پہنچا دینا ہی ہے۔

نیز آخر میں پھر اسی بات کو دہراتے ہوئے مزید فرمایا:-

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ (المائدة:۱۰۰)

ترجمہ:- رسول پر تو صرف بات کا پہنچانا واجب ہے۔ اور جو بات تم سے ظہور میں آجاتی ہے اس کو بھی اور جو تم سے ابھی عملاً ظہور میں نہیں آئی اس کو بھی اللہ خوب جانتا ہے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ مذہبی اعتقاد ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ یہ صرف اور صرف خدا ہی ہے جو اس کو بھی جانتا ہے جسے انسان اپنے عمل سے ظاہر کرتا ہے اور اس کو بھی جانتا ہے جسے اس نے اپنے عمل سے ظاہر نہیں کیا یعنی دل کے مخفی خیالات اور ارادوں سے خدا ہی واقف ہوتا ہے۔ نہ حکومت کو اور نہ سر برآوردہ مذہبی افراد کو یہ مقدرت حاصل ہے اور نہ ان کے دائرہ کار میں شامل ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں کے بھیدوں سے آگاہ ہو سکے یہ جان سکیں کہ دلی طور پر وہ کس بات پر ایمان رکھتے ہیں اور کس بات پر نہیں۔

اس آیت سے منافقین کی طرف ذہن کا منتقل ہونا ایک قدرتی عمل ہے۔ منافقین سے مراد مدینہ کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے محض دکھاوے کے طور پر ہی اسلام قبول کیا تھا اسی لئے ان کا ایمان مشکوک تھا۔ قرآن میں منافقین کا متعدد جگہ ذکر آتا ہے لیکن چار مقامات ایسے ہیں جہاں منافقوں کا

مرتدوں کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔اس ضمن میں پہلا حوالہ سورۃ محمد میں واقع ہوا ہے۔سورۃ محمد ایک مدنی سورۃ ہے جس میں اسلام کے رو سے جنگ کے مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ مؤمن تو ایسی وحی کو جس میں انہیں اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے بخوشی قبول کرتے ہیں لیکن برخلاف اس کے منافقین یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں مقتل کی طرف ہانک کر لے جایا جا رہا ہے۔اس طرح حقیقی مومنوں کو، ان لوگوں کے مقابلہ میں جن کا ایمان جھوٹ پر مبنی اور کھوکھلا ہے ممیّز وممتاز کر کے دکھلایا گیا ہے۔ان امور پر روشنی ڈالتے ہوئے اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے:-

اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِھِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْھُدَی ۙ الشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَھُمْ ؕ وَ اَمْلٰی لَھُمْ ۔ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ کَرِھُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ سَنُطِیْعُکُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِسْرَارَھُمْ ۔ (محمد:۲۶،۲۷)

ترجمہ:-وہ لوگ جو ہدایت ظاہر ہونے پر اس سے پھر گئے شیطان نے ان کا عمل ان کو اچھا کر کے دکھلایا ہے اور ان کو جھوٹی امیدیں دلائی ہیں۔یہ اس لئے ہوا کہ وہ ان لوگوں سے جو خدا کی تعلیم کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں کہہ رہے ہیں کہ ہم تمہاری بعض باتوں میں اطاعت کریں گے اور اللہ ان کی رازداری کو جانتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں ان منافقوں کے لئے جو مرتدوں کے زمرہ میں آتے ہیں کسی سزا کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

ایسے منافقوں کے ذکر کا دوسرا حوالہ خود سورۃ المنافقون میں وارد ہوا ہے۔یہ سورۃ ۶ ہجری مطابق ۶۲۸ء کے اواخر میں نازل ہوئی تھی۔اس سورۃ میں منافقوں کی غداری اور بے ایمانی کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور ان کے ایمان لانے کے اعلانیہ دعوے کو سراسر فریب اور جھوٹ پر مبنی قرار دیا گیا ہے۔یہ ایک اعلانیہ سرزنش تھی جو انہیں اس وقت کی گئی تھی۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْھَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ ۘ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُہٗ ؕ وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ ۔ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَھُمْ جُنَّۃً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اِنَّھُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۔ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ

فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ۔ وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَ اِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۔ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ۔ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (المنافقون: ۲تا۷)

جب تیرے پاس منافق آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم قسم کھا کر گواہی دیتے ہیں کہ تو اللہ کا رسول ہے اور اللہ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے مگر (ساتھ ہی) اللہ قسم کھا کر گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو (تیری گرفت سے بچنے کے لئے) ڈھال بنالیا ہے اور وہ اللہ کے رستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں بہت برا ہے۔ یہ کام وہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ پہلے ایمان لائے پھر انہوں نے انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور اب وہ سمجھتے نہیں ......وہ پکے دشمن ہیں پس تو ان سے ہوشیار رہ......تو ان کے لئے استغفار کرے یا نہ کرے ان کے لئے سب برابر ہے کیونکہ اللہ ان کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اللہ اطاعت سے نکل جانے والی قوم کو کامیابی کا منہ نہیں دکھاتا۔

منافقوں کے متعلق آخری دو حوالے آخر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ایک سورۃ (یعنی سورۃ التوبۃ) میں وارد ہوئے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:-

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً ۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (التوبة: ٦٦)

اب کوئی عذر نہ کرو۔ تم نے ایمان لا کر کفر کیا۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر دیں اور ایک دوسرے گروہ کو سزا دے دیں اس لئے کہ وہ مجرم تھے تو یہ ہمارا کام ہے۔

منافقوں میں سے جنہیں معاف کیا جانا تھا ظاہر ہے کہ یہ وہ منافق تھے جنہوں نے توبہ کر لی

تھی اور مخلص مسلمان بن گئے تھے ۔ جہاں تک اُن منافقوں کا تعلق ہے جنہیں سزا ملنی تھی ان کے متعلق اگلی آیات میں سے ایک آیت میں مذکور ہے:-

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (التّوبة:٦٨)

اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کفار سے جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے وہ اس میں رہتے چلے جائیں گے وہی ان کے لئے کافی ہے۔ اللہ نے ان کو دھتکار دیا ہے اوران کے لئے ایک قائم رہنے والا عذاب مقدّر ہے۔

اور آخر میں مزید فرمایا:-

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَ مَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ (التّوبة:۷۴)

وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے کوئی بات نہیں کہی حالانکہ انہوں نے کفر کی بات کہی ہے اور اسلام لانے کے بعد کفر کیا ہے اور ایسی باتوں کا ارادہ کیا ہے جن کو وہ حاصل نہیں کر سکتے اور انہوں نے مسلمانوں سے صرف اس لئے دشمنی کی کہ اللہ اور اس کے رسول نے ان کو اپنے فضل سے مالدار بنا دیا تھا۔ پس اگر وہ توبہ کریں تو ان کے لئے اچھا ہوگا اور اگر وہ پیٹھ پھیر کر چلے جائیں تو اللہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دردناک عذاب دے گا اور اس جہان میں نہ کوئی ان کا دوست ہوگا اور نہ مددگار[1]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ عبداللہ بن اُبی بن سلول منافقوں کا سردار ہے لیکن آپؐ نے اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جب اس نے وفات پائی تو آپؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ نمازِ جنازہ پڑھانے کے واقعہ کا حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں ذکر کیا:-

---

[1] اس آیہء کریمہ میں ارتداد اختیار کرنے والے منافقوں کو ملنے والی سزا کا زیادہ پُرزور انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن ابی ابن سلول کی میّت کے قریب آ کر کھڑے ہوئے اور نمازِ جنازہ پڑھانے لگے تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپؐ دشمنِ خدا کی نمازِ جنازہ پڑھا رہے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات سن کر مسکرائے اور پھر فرمایا عمر! میرے پاس سے ہٹ کر پیچھے ہو جاؤ، مجھے نماز پڑھانے یا نہ پڑھانے دونوں کا اختیار دیا گیا ہے اور میں نے نماز پڑھانے کو پسند کیا ہے۔ مجھے کہا گیا ہے چاہیں تو ان کے لئے معافی کی درخواست کریں اور چاہیں تو نہ کریں، اگر ان کے لئے ستّر بار بھی معافی کی درخواست کی تو میں انہیں معاف نہیں کروں گا۔ اگر میں جانتا کہ ستّر سے زیادہ مرتبہ دعائے مغفرت کروں تو اسے معاف کر دیا جائے گا تو میں ستّر سے زیادہ مرتبہ بھی اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنازے کے ساتھ تشریف بھی لے گئے اور اس وقت تک وہاں ٹھہرے رہے جب تک کہ اسے دفن نہ کر دیا گیا[۱]۔''

اس بات کا امتحان کہ ''دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر جائز نہیں'' اس امر میں مضمر ہے کہ ہر شخص مذہب تبدیل کرنے میں آزاد ہو۔ اس بارہ میں یک طرفہ آزادی، آزادی نہیں کہلا سکتی۔ یک طرفہ آزادی سے مراد یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کی تو آزادی ہو لیکن اسے ترک کرنے کی آزادی نہ ہو۔ قرآن مجید میں ارتداد کا براہِ راست ذکر دس مقامات پر کیا گیا ہے۔ ایک تو اس کا ذکر سورۃ النّحل میں ہے جو ایک مکی سورۃ ہے۔ باقی نو بار اس کا مدنی سورتوں میں ذکر آتا ہے۔ ان جملہ آیات میں سے کسی ایک آیت میں بھی اس بارہ میں خفیف سا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ دین سے اُلٹے پاؤں پھر جانے والوں کے لئے موت کی سزا مقرر ہے۔

ارتداد کے متعلق واضح ترین بیانوں میں سے ایک بیان سورۃ البقرہ کی آیت ۱۴۳ میں درج ہے یروشلم سے مکہ کی جانب تحویل قبلہ کا واقعہ ۲ ہجری میں پیش آیا۔ اس بارہ میں ابن اسحٰق نے تحریر کیا:-

''جب قبلہ کی تحویل شام کی سمت سے کعبہ کی سمت ہوئی تو یہود مدینہ میں سے رفاعہ بن قیس،

---

[۱] ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسول اللہ صفحہ ۹۲۷

فردم بن عمرو، کعب بن اشرف، رافع بن ابی رافع، کعب کا حلیف حجاج بن عمرو، ربیع بن الربیع بن ابی الحقیق اور کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا اے محمدؐ! آپ جس قبلہ پر تھے اُس سے کس چیز نے آپ کو پھیر دیا، آپؐ کا دعویٰ تو یہ ہے کہ آپؐ ملّت ابراہیمی اور دینِ ابراہیمی پر ہیں، جس قبلہ پر تھے اس پر لوٹ آئیں ہم آپؐ کی پیروی کریں گے اور آپؐ کو سچا مان لیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ آپؐ کو دین حق سے برگشتہ کر دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَیْهِ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ (البقرۃ:۱۴۴)

ہم نے اس قبلہ کو جس پر تو پہلے قائم تھا صرف اس لئے مقرر کیا تھا تا کہ ہم اس شخص کو جو اس رسول کی فرمانبرداری کرتا ہے اس شخص کے مقابل پر جو ایڑیوں کے بل پھر جاتا ہے ایک ممتاز حیثیت میں جان لیں اور یہ امر ان لوگوں کے سوا جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے دوسروں کے لئے ضرور مشکل ہے۔''

تحویل قبلہ کے وقت ایڑیوں کے بل پھر جانے والے یعنی ارتداد اختیار کرنے والے ان لوگوں کے لئے قرآن مجید نے کوئی سزا مقرر نہیں کی اور تاریخ میں بھی کسی ایسے مرتد کا کوئی ذکر نہیں ملتا جسے تحویل قبلہ کے بعد ارتداد کی بناء پر کوئی سزا دی گئی ہو۔

سورۃ آلِ عمران ۲ ہجری مطابق ۶۲۴ عیسوی میں بدر کی فتح کے بعد نازل ہوئی تھی۔ اس سورۃ کی مندرجہ ذیل دو آیات میں مدینہ کے بعض یہودیوں کے مرتد ہوجانے کا ذکر آتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

(۱) یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (اٰلِ عمران:۷۲)

---

[۱] ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسول اللہ صفحہ ۳۸۱

اے اہل کتاب! تم جانتے بوجھتے ہوئے کیوں حق کو باطل کے ساتھ ملاتے اور حق کو چھپاتے ہو؟

(۲) وَ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ۔ (اٰلِ عمران:۷۳)

اور اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مؤمنوں پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس پر دن کے ابتدائی حصہ میں تو ایمان لے آؤ اور دن کے پچھلے حصہ میں اس سے انکار کر دو۔ شاید (اس ذریعہ سے) وہ پھر جائیں۔

ابن اسحٰق نے ان یہودیوں کے نام بھی درج کئے ہیں جنہوں نے سورۃ آلِ عمران کی آیت ۷۳ میں مذکور منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا تھا۔ چنانچہ اس نے لکھا:-

عبداللہ بن ضَیف، عدی بن زید اور الحارث بن عوف نے متفقہ طور پر اس امر کا فیصلہ کیا کہ وہ ایک وقت میں تو جھوٹ موٹ یہ ظاہر کریں گے کہ وہ محمد اور اس کے ساتھیوں کے پیغام پر ایمان لے آئے ہیں اور پھر ان کے ذہنوں میں الجھن پیدا کرنے کے لئے دوسرے وقت میں اس کا انکار کر دیں گے۔ مقصد ان کا یہ تھا کہ اس طرح وہ مسلمانوں کو اس امر کی ترغیب دیں گے کہ وہ بھی ان کے نقشِ قدم پر چل کر اپنے مذہب سے منحرف ہو جائیں[۱]۔

ان تینوں یہودیوں میں سے کسی ایک کو بھی سزا نہیں دی گئی۔ پھر سورۃ النّساء میں بھی اس امر کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:-

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِیَهْدِیَهُمْ سَبِیْلًا (النساء:۱۳۸)

اور جو لوگ ایمان لائے پھر انہوں نے انکار کر دیا، پھر ایمان لائے اور پھر انکار کر دیا، پھر کفر میں اور بھی بڑھ گئے، اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کر سکتا اور نہ انہیں نجات کا کوئی رستہ

---

[۱] ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسول اللہ صفحہ ۳۸۴

دکھا سکتا ہے۔

اگر دین سے پھر جانے کی سزا موت ہوتو ایک مرتد بار بار ایمان لانے اور بار بار اس سے پھر جانے کی عیاشی کا کیسے متحمل ہوسکتا ہے؟ اور پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ایک شخص جسے ارتداد اختیار کرنے کی بناء پر موت کی سزا دے دی گئی ہو اس کے لئے تو یہ ممکن ہی نہیں رہتا کہ وہ مرنے کے بعد پھر ایمان لائے اور پھر اس سے منکر ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل کے پیچھے خدائی تصرف کارفرما ہوتا تھا۔ جس طرح آپؐ نے خدائی احکام پر عمل کر کے دکھایا اسے سنت کہتے ہیں۔ سنت کو شریعت کے دوسرے اہم ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ شریعت کے اس اہم ماخذ یعنی سنت کی رو سے بھی اسلام ترک کر کے اس کی بجائے کوئی اور دین اختیار کرنے کی کوئی سزا نہیں ہے۔ جن لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کی سزا دی، سیرت اور احادیث کی کتب میں ان کے نام محفوظ ہیں اور ان لوگوں کے نام بھی محفوظ ہیں جنہوں نے آپؐ کی زندگی میں اسلام ترک کر کے ارتداد اختیار کیا۔ اسی ضمن میں ایک بدو (یعنی ایک صحرا نشین عرب باشندہ) کے متعلق لکھا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے اسلام میں داخل ہوا۔ ابھی وہ مدینہ میں ہی تھا کہ بخار میں مبتلا ہونے کی وجہ سے بیمار ہو گیا۔ بیماری سے گھبرا کر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخواست کی کہ آپؐ اسے بیعت کے عہد سے آزاد کر دیں۔ اُس نے وقفہ وقفہ سے تین دفعہ یہ درخواست کی اور تینوں دفعہ اُس کی یہ درخواست منظور نہ ہوئی۔ آخر وہ خود ہی مدینہ سے چلا گیا اور کسی نے اس کا بال بھی بیکا نہ کیا۔ اس کے چلے جانے کا ذکر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مدینہ تو ایک بھٹی کی طرح ہے جو زرِ خالص سے میل کچیل اور فضلہ کو دور کر دیتی ہے یعنی زرِ خالص باقی رہ جاتا ہے اور میل کچیل کے خود بخود الگ ہو جانے سے اسے پھینک دیا جاتا ہے۔[۱]

ابن اسحٰق نے بیان کیا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لشکر کے امیروں اور سرداروں کو ہدایت فرمائی تھی کہ صرف اُن لوگوں سے ہی جنگ

۱؎ صحیح البخاری (مطبوعہ قاہرہ) جلد اول کتاب ۳

کی جائے جو اُن کی راہ میں مزاحم ہوں۔ مندرجہ ذیل مجرم اس حکم سے مستثناء تھے۔ ان کے بارہ میں آپؐ نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ جہاں بھی ملیں حتیٰ کہ اگر وہ خانہ کعبہ کے پردوں کے پیچھے بھی چھپے ہوئے ہوں انہیں قتل کر دیا جائے[۱]۔

۱۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح

۲، ۳، ۴۔ عبداللہ بن خطل (جو بنی تَیم ابن غالب کا آدمی تھا) اور اس کی گانے بجانے اور ناچنے والی دو باندیاں۔ وہ دونوں اسلام کے خلاف ہجویہ اشعار گا گا کر لوگوں کو سنایا کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام فرتَنَی تھا۔ دوسری باندی کا نام ابن اسحٰق نے درج نہیں کیا۔

۵۔ الحویرث بن نُقَیذ بن وہب بن عبد بن قُصَیّ

۶۔ مِقیَس بن صُبابہ

۷۔ سارہ۔ یہ خاندان بنی عبدالمطلب کے ایک شخص کی لونڈی تھی۔

۸۔ عکرمہ بن ابوجہل[۲]۔

ان میں سے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبین وحی میں سے ایک تھا وہ مرتد ہو گیا اور غداری کا مرتکب ہو کر مدینہ سے بھاگ نکلا اور کفّار مکہ سے جا ملا۔ چونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی املا کردہ وحی الٰہی کو ضبط تحریر میں لاتا تھا اور اس لحاظ سے اسے بہت قابل اعتماد حیثیت حاصل تھی اس لئے اس کی غداری کی وجہ سے قریش مکّہ کے ذہنوں میں وحی الٰہی کے مستند ہونے کے متعلق شکوک وشبہات کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ اس لحاظ سے اس کا غداری کا جرم کوئی معمولی جرم نہ تھا۔ جب فتح مکہ کے بعد مکہ میں امن بحال ہو گیا تو اس کے رضاعی بھائی عثمان بن عفان نے اس کی طرف سے بیچ میں پڑ کر اس کے لئے جان بخشی کی سفارش کی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاف فرما دیا[۳]۔ اگر ارتداد کی کوئی قرآنی سزا مقرر ہوتی تو آپؐ

---

۱ ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسولؐ اللہ صفحہ ۸۱۸

۲ ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسولؐ اللہ صفحہ ۸۱۹

۳ ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسولؐ اللہ صفحہ ۸۱۸، ۸۱۹

عبداللہ بن سعد کو کبھی معاف نہ فرماتے۔ ایسی سزاؤں کے متعلق جو قرآنی حدود کا درجہ رکھتی ہیں سفارش کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولی موقف کا ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ بنی مخزوم کی ایک عورت پر چوری کا الزام ثابت ہوگیا۔ جب اسامہ بن زیدؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کی سزا معاف کئے جانے کی سفارش کی تو آپؐ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کیا تم ایک ایسی سزا معاف کئے جانے کی سفارش کرتے ہو جو خدا کی مقرر کردہ ہے۔ بخدا اگر فاطمہ بنتِ محمد کبھی چوری کی مرتکب ہوتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ بھی کٹوا دیتا۔

جہاں تک عبداللہ بن خطل کا تعلق ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک انصاری کے ہمراہ ایک علاقہ میں زکوٰۃ کی وصولی کے لئے بھجوایا تھا۔ اُس انصاری کو اُس کی خدمت کے لئے ساتھ بھجوایا گیا تھا۔ جب راستہ میں ان دونوں نے ایک جگہ قیام کیا تو عبداللہ بن خطل نے سونے سے پہلے اس انصاری کو حکم دیا کہ وہ ایک بکری ذبح کر کے اس کے لئے کھانا تیار کرے۔ جب عبداللہ بن خطل نیند سے بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس انصاری نے نہ تو بکری ذبح کی ہے اور نہ کھانے کا کوئی اور انتظام ہی کیا ہے اس پر وہ بہت غضبناک ہوا۔ وہ اس انصاری کو قتل کر کے وہاں سے بھاگ نکلا اور قریش مکہ سے جا ملا اور ساتھ ہی اسلام سے اپنے مرتد ہونے کا اعلان بھی کر دیا[1]۔ وہ اس انصاری مسلم کے قتل کی پاداش میں سعید بن حریث المخزومی اور ابو برزہ اسلمی کے ہاتھوں قتل ہوا[2]۔ ابن خطل کی گانے بجانے والی دو باندیوں میں سے ایک کو ہجویہ اشعار گا گا کر لوگوں میں اشتعال پھیلانے کے جرم میں قتل کیا گیا اور دوسری لڑکی کو کسی کی طرف سے سفارش پیش ہونے پر بعد میں معافی دے دی گئی[3]۔

اب رہا الحویرث بن نُقیذ کا معاملہ۔ یہ شخص ہبّار بن الاسود بن المطلب بن اسد کی اس پارٹی

۱۔ ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسول اللہؐ صفحہ ۸۱۹

۲۔ ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسول اللہؐ صفحہ ۸۱۹

۳۔ ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسول اللہؐ صفحہ ۸۳۰

میں شامل تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو اس وقت رستہ میں جالیا تھا جب آپؓ مکہ سے مدینہ تشریف لے جارہی تھیں۔ الحویرث نے حضرت زینبؓ کے اونٹ کا تنگ کاٹ دیا جس کی وجہ سے آپؓ نیچے آگریں۔ آپؓ حاملہ تھیں گرنے کی وجہ سے آپؓ کا حمل ضائع ہوگیا اور آپؓ کو مکہ واپس جانا پڑا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی لوگوں کو اس حکم کے ساتھ مکہ بھجوایا کہ اگر ہبّار بن الاسود یا الحویرث بن نقیذ کہیں ملیں تو انہیں قتل کر دیا جائے[1] لیکن الحویرث ان کی زد میں آنے کے باوجود بچ نکلا۔ ایک اور اطلاع کی رو سے ہشام نے لکھا ہے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں حضرت فاطمہؓ اور حضرت امّ کلثوم کو ایک اونٹ پر سوار کر کے انہیں مکہ سے مدینہ لے جارہے تھے۔ الحویرث نے ان کے اونٹ کو اس طرح بھگایا کہ دونوں صاحبزادیاں نیچے آگریں[2]۔ بالآخر حضرت علیؓ نے اسے قتل کیا[3]۔

مِقیس بن صبابہ کا واقعہ یہ ہے کہ وہ مکہ سے مدینہ آیا۔ اس نے کہا میں تم لوگوں کے پاس ایک مسلمان کی حیثیت سے آیا ہوں اور اپنے بھائی کے قتل کے قصاص کا طالب ہوں۔ اس کے بھائی کو ایک انصاری نے غلطی سے قتل کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ مقیس کو اس کے بھائی ہشام کے قتل کا خوں بہا ادا کر دیا جائے۔ خوں بہا لینے کے بعد وہ کچھ عرصہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا لیکن موقع ملتے ہی اس نے اپنے بھائی کے قاتل کو قتل کرڈالا اور پھر ارتداد اختیار کر کے وہاں سے بھاگ نکلا اور مکہ جا پہنچا[4]۔ بعد میں مقیس کو تمیلہ بن عبداللہ نے ایک انصاری کو جان سے مار دینے کے جرم میں قتل کیا۔ وہ دوہرے جرم کا مرتکب ہوا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے قتل کا خوں بہا وصول کر لیا تھا اس کے باوجود اس نے اپنے بھائی کے قاتل کو مارڈالا[5]۔

---

1. ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسول اللہ صفحہ ۴۶۸، ۴۶۹
2. ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسول اللہ صفحہ ۸۱۹
3. ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسول اللہ۔ الزرقانی شرح مواہب اللدنیہ (قاہرہ ۱۳۲۵ھ) جلد دوم صفحہ ۳۱۵ نیز دیکھئے حضرت مولوی شیر علی کی کتاب قتل مرتد اور اسلام (امرتسر ۱۹۲۵ء) صفحہ ۱۱۹
4. ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسول اللہ صفحہ ۷۲۸
5. ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسول اللہ صفحہ ۸۱۹

سارہ جسے گڑ بڑ پھیلانے کے جرم میں قتل کی سزا کا مستحق قرار دیا گیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قتل نہیں ہوئی اور بعد میں بھی زندہ رہی۔

فتح مکہ کے موقع پر عکرمہ بن ابوجہل یمن کی طرف بھاگ نکلا تھا۔ اس کی بیوی امّ حکیم مسلمان ہوگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے لئے معافی اور جاں بخشی کی خواستگار ہوئی۔ آپؐ نے اس کی درخواست قبول فرماتے ہوئے عکرمہ کو معاف فرما دیا[1]۔

ان تمام واقعات میں بھی ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام سے محض ارتداد اختیار کرنے والے کسی شخص کو کوئی سزا دی ہو۔

۱۱ ہجری مطابق ۶۳۲ عیسوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے معاً بعد نوخیز مسلم حکومت کو ایک بہت بڑے بحران سے دو چار ہونا پڑا۔ جزیرہ نمائے عرب کے بعض حصوں میں لاقانونیت کی کیفیت پیدا ہوگئی اور بہت سے قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر کے مدینہ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔ یہ باغیانہ تحریک الرّدّہ کے نام سے موسوم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور خلیفہ حضرت ابوبکرؓ کو سب سے اہم معاملہ یہ درپیش تھا کہ آپ اس بے چینی اور افراتفری کا خاتمہ کریں لیکن پہلا اور سب سے مقدم کام آپ کا یہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال سے قبل جس فوجی مہم کا حکم دیا تھا آپ اس مہم کے سلسلہ میں لشکر روانہ کریں چنانچہ آپ نے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد دوسرے ہی روز اسامہ بن زیدؓ بن حارث کی کمان میں اسلامی لشکر کو شامی سرحد کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ اسامہ اور ان کے لشکر کے روانہ ہونے کے بعد اکثر قبائل نے مدینہ کی حکومت سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ صرف مکہ اور مدینہ اور ان کے ملحقہ علاقے ہی تھے جو مرکزی حکومت کے زیر نگیں باقی رہ گئے تھے۔ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قبائل میں جن لوگوں کو اپنے نمائندوں کے طور پر مقرر کیا تھا وہ ان کے علمِ بغاوت بلند کرنے پر اپنی جگہوں سے بھاگنے اور مدینہ واپس آنے پر مجبور ہو گئے تھے یہ ہر لحاظ سے بھرپور نوعیت کی کھلی کھلی بغاوت تھی۔

باغیوں کے خلاف جنگ کرنے کے فیصلہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بعض وفادار قبائل کی

---

[1] ابن ہشام کی کتاب سیرۃ رسولؐ اللہ صفحہ ۸۱۹

طرف یہ پیغام بھجوایا کہ وہ اس موقع پر مرکزی حکومت کی مدد کو پہنچیں۔ آپ ابھی ان کی طرف سے کمک کا انتظار ہی کر رہے تھے کہ اس اثناء میں خارجہ بن حصم نے یونیناہ بن حصم الفزاری اور الاقرا بن حابس التمیمی کی سرکردگی میں مسلمانوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ پہلے تو مسلمان افراتفری کے عالم میں بھاگ نکلے لیکن انہوں نے فوراً ہی دوبارہ جمع ہو کر خارجہ کے آدمیوں پر بھرپور حملہ کیا اور انہیں بھاگنے اور شکست کھانے پر مجبور کر دیا۔

ذوالقصّہ کے مقام پر ہونے والی اس جھڑپ سے پہلے عرب قبائل کا ایک وفد زکوٰۃ کے مسئلہ پر حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ گفت وشنید کرنے مدینہ آیا تھا لیکن آپؓ نے ان کے ساتھ گفت وشنید سے انکار فرما دیا۔ بعض ابتدائی اور نمایاں حیثیت رکھنے والے مہاجرین نے حضرت ابوبکرؓ کے اس فیصلہ سے اتفاق نہ کیا کہ آپ زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کرنے والوں کے خلاف جنگ کریں گے۔ اس امر سے کہ یہ قبائل گفت وشنید کے خواہاں تھے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مرتد نہیں ہوئے تھے اور یہ کہ وہ مدینہ سے تعلق منقطع کرنا نہیں چاہتے تھے البتہ وہ اپنے اوپر مدینہ کی سیاسی بالا دستی اور کنٹرول کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جہاں تک باغی قبائل کے طرزِ عمل کا تعلق ہے اللہ اور رسولؐ پر ایمان مابہ النزاع نہیں تھا۔ مابہ النزاع صرف ایک امر تھا یعنی زکوٰۃ (ٹیکس) کی ادائیگی سے انکار۔ بعض معروف اور نامور صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کی سرکردگی میں باغیوں کے خلاف جنگ کرنے سے متعلق حضرت ابوبکر کے فیصلہ پر اعتراض کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا ''اِن لوگوں کے خلاف آپ کو جنگ کرنے کا کیا حق ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا مجھے اس وقت تک ہی جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ لوگ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ نہ پکار اٹھیں۔ اگر وہ زبان سے لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دیتے ہیں تو انہیں از خود میری طرف سے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت مل جاتی ہے[1]۔''

باغی قبائل کے وفد کی مدینہ سے روانگی کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:-

''وفد نے دیکھ لیا ہے کہ مدینہ میں اب تم کتنی تھوڑی تعداد میں ہو۔ تمہیں اس بات کا

---

[1] محمد ادریس الشافعی کی کتاب ''کتاب الاُمّ جلد ۸ صفحہ ۲۵۶'' ایڈیشن شائع کردہ محمد ظاہری النجار قاہرہ

کوئی علم نہیں ہے کہ وہ دن کو تم پر حملہ کرتے ہیں یا رات کو۔ ان کا ہراول دستہ مدینہ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ ہم سے چاہتے تھے کہ ہم ان کی تجاویز قبول کرلیں اور ان کی شرائط کے مطابق ان کے ساتھ معاہدہ طے ہو لیکن ہم نے ان کی یہ درخواست مسترد کردی ہے۔ پس ان کے حملہ کو پسپا کرنے کے لئے تیاری کرو[1]۔''

ہوا بھی یہی انہوں نے تین دن کے اندر اندر مدینہ پر حملہ کر دیا۔

جنگِ ردّہ کے نتیجہ میں بہت خون خرابہ ہوا۔ بعد میں آنے والے مؤرخین کے لئے یہ بات ناقابلِ فہم تھی اور اس کی کوئی توجیہہ ان کے ذہن میں نہ آتی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد سرزمینِ عرب میں اتنی زیادہ جنگوں کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ انہوں نے اس کا سبب اپنی طرف سے اس امر کو قرار دے ڈالا کہ اسلام کے خلاف الرّدّہ نامی ایک مذہبی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی تھی[2]۔ حالانکہ یہ مذہبی تحریک تھی ہی نہیں بلکہ مرکزی حکومت کے خلاف ایک کھلی کھلی بغاوت کے علاوہ اس کی اور کوئی حیثیت نہ تھی۔ اُدھر بعد میں آنے والے فقہاء کو ایسے مسلمانوں کے قتل کے بارہ میں جن پر کفر اختیار کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہو قرآن وسنت سے کوئی سند نہ مل سکی تھی اور نہ مسلمان سیاسی طاقتوں کے خلاف جنگ کرنے کے بارہ میں کسی سند جواز تک ان کی رسائی ہو سکی تھی اس لئے انہوں نے خود تحقیق کی زحمت اٹھائے اور سر دردی مول لئے بغیر مؤرخوں کے اس مفروضہ کو کہ اسلام کے خلاف ایک مذہبی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی تھی درست تسلیم کرلیا۔

مسلمان باغیوں کے خلاف حضرت ابوبکرؓ کی جنگ کی قانونی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے حضرت امام شافعیؒ کہتے ہیں۔ ردّہ کہتے ہیں کسی پہلے سے اختیار کئے ہوئے مذہب کو ترک کر کے عدمِ ایمان کی حالت میں جا گرنے کو اور پہلے قبول کی ہوئی ذمہ داری پوری کرنے سے انکار کرنے کو[3] لیکن مرتدوں کو سزا دینے یا ان کے خلاف جنگ کرنے کے لئے ان کا محض ارتداد کافی نہیں ہے

---

[1] ابوجعفر محمد ابن جریر الطبری ''تاریخ الرسول والملک'' ایڈیشن شائع کردہ M.J.GORJE (لائیڈن ۱۹۶۴ء) جلد چہارم صفحہ ۱۸۷۴

[2] سی۔ ایچ۔ بیکر THE EXPANSION OF THE SARACENS دی کیمبرج میڈیول ہسٹری (نیویارک میکملن ۱۹۱۳ء) جلد ۱۱ صفحہ ۳۳۵

[3] محمد ادریس الشافعی کتاب الاُمّ جلد ۸ صفحہ ۲۵۶،۲۵۵

بلکہ کسی معاہدے کی خلاف ورزی یا نقضِ عہد کے ذریعہ جرم کی نوعیت اور اس کی شدت میں اضافہ کا ہونا ضروری ہے۔ایک بالکل مختلف مکتبِ فکر کے عالمِ دین ابی الحدید نے نہج البلاغہ کی تفسیر میں معاملہ کو یہ کہہ کر صاف کر دیا۔ ''جن قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا وہ مرتد نہیں تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے تو انہیں استعارۃً مرتد کہا تھا[1]۔''

مستشرقین میں سے ویل ہاؤسن WELL HAUSEN کے نزدیک ردّہ کی تحریک مدینہ کی لیڈر شپ کے خلاف بغاوت کی حیثیت رکھتی تھی۔اس میں اسلام کے خلاف بغاوت کا عنصر شامل نہ تھا۔اکثر قبائل ٹیکس ادا کئے بغیر اللہ کی عبادت جاری رکھنا چاہتے تھے۔کیتانی CAETNI نے بھی ویل ہاؤسن سے اس امر میں اتفاق کیا ہے۔وہ کہتا ہے ردّہ تحریک ارتداد نہیں تھی بلکہ ان لڑائیوں کا تعلق خالصتاً سیاست سے تھا۔ ویل ہاؤسن اور کیتانی کی پیروی کرتے ہوئے بیکر BECKER جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ خود اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:-

''محمد کی اچانک وفات نے مرکز گریز رجحانات کو ایک نئی تقویت پہنچائی۔اس ساری تحریک کی اصل نوعیت اگرچہ اس دور کے معاصرین کی نگاہوں سے پوشیدہ تھی لیکن وہ ایک مؤرخ کے ذہن میں بڑی شدت سے آئے بغیر نہیں رہتی۔الردّہ کی علیحدگی پسند تحریک مرکزی قیادت کے لئے ایک ناگزیر ضرورت کو جنم دینے کا موجب ہوتی تھی اور اس ناگزیر ضرورت نے مدینہ کی ریاست کو ایسی زبردست قوّت سے مالا مال کر دکھایا تھا کہ جس کے آگے کسی مخالف قوت کا ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔اگر ناگزیر ضرورت مدینہ کی ریاست کو ناقابلِ تسخیر قوت سے مالا مال نہ کر دکھاتی تو پورا عرب مخصوص علاقائی جزئیات کی دلدل میں غرق ہو کر رہ جاتا۔ردّہ کے خلاف لڑائی دراصل مرتدوں کے خلاف لڑائی نہ تھی کیونکہ قبائل کو اسلام پر اعتراض نہ تھا، اعتراض تو انہیں اس خراج (یا ٹیکس) پر تھا جو مدینہ کو ادا کیا جاتا تھا۔اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ فی الحقیقت عرب پر سیاسی غلبہ کی جنگ تھی[2]۔''

---

[1] عبدالحمید ہبت اللہ ابن الحدید ''شرح نہج البلاغہ'' ایڈیشن محمد ابوالفضل ابراہیم (قاہرہ ۱۹۵۶ تا ۶۴) جلد ۸ صفحہ ۸۷

[2] سی۔ایچ بیکر کی مذکورہ کتاب صفحہ ۳۳۵

مسٹر برنارڈ لیوئس BERNARD LEWIS نے اس بارہ میں بالوضاحت لکھا ہے کہ ''یہ بات عیاں ہے کہ ''الرّدّہ'' کی تحریک اس امر کی آئینہ دار ہے کہ بعد میں آنے والے مؤرخوں نے جن کا نقطۂ نظر مذہبی عصبیّت کا رنگ اپنے اندر لئے ہوئے تھا رونما ہونے والے واقعات کی اصل نوعیّت اور اہمیت کو مسخ کر کے رکھ دیا۔'' مسٹر برنارڈ لیوئس نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے مزید لکھا ہے:-

''ابوبکر کی جانشینی کو تسلیم کرنے سے قبائل کے انکار کے ہرگز یہ معنی نہ تھے کہ وہ لوگ جو اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اپنے سابقہ مشرکانہ مسلک کی طرف واپس لوٹ گئے تھے بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ طرفین میں سے ایک کی وفات سے سیاسی معاہدہ ازخود کالعدم ہو گیا ہے۔ جو قبائل مدینہ کے قرب و جوار میں آباد تھے وہ تو سوچ سمجھ کر حقیقی معنوں میں اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے تھے ان کے مفادات پوری امت مسلمہ کے مفادات سے اس قدر ہم آہنگ تھے کہ امت سے جداگانہ ان کی اپنی کوئی تاریخ مرتّب ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کی اپنی کوئی علیحدہ تاریخ مرتّب ہی نہیں ہوئی۔ محمد کی وفات کے نتیجہ میں باقی قبائل کے نقطۂ نظر کے مطابق مدینہ کے ساتھ ان کے سیاسی تعلقات کا متأثر ہونا ایک لازمی امر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب مدینہ کے ساتھ تعلق برقرار رکھنے یا نہ رکھنے میں وہ آزاد ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ابوبکر کے انتخاب کو تسلیم کرنے کا کسی لحاظ بھی پابند نہیں سمجھتے تھے اور اس لئے بھی نہیں سمجھتے تھے کہ انہوں نے ان کو منتخب کرنے میں سرے سے حصہ نہیں لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً ہی ٹیکس کی ادائیگی بند کر دی اور معاہدے کے نتیجہ میں قائم ہونے والے تعلقات کو معطّل کر دیا۔ مدینہ کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ابوبکر کو نئے معاہدے کرنے پڑے[۱]۔''

حضرت علیؓ ۶۶۱ء میں شہید ہوئے۔ آپ کی شہادت کے ساتھ ہی ایک ایسے مسلمان حکمران کا نظریہ جس کی ذات میں مملکت اور مذہب کی سربراہی مجتمع ہو رخصت ہو گیا۔ سیاسی حکمرانوں کی

---

[۱] برنارڈ لیوئس کی کتاب THE ARABS IN HISTORY (لندن ۱۹۵۸ء) صفحہ ۵۱، ۵۲

حیثیت سے بنوامیہ کے خاندانی دورِ حکومت (۶۶۱ءتا ۷۵۰ء) کا آغاز حضرت امیر معاویہؓ سے ہوا۔ ان حکمرانوں میں خلفائے راشدین کے مذہبی تقدّس کا شائبہ بھی نہ تھا۔ انہیں کم وبیش محض دنیوی بادشاہ ہی قرار دیا جاتا تھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت کے نگرانوں کی حیثیت سے علماء کوئی لحاظ سے وہی مرتبہ اور مقام حاصل ہوتا چلا گیا جو شاہ قسطنطین کے عیسائی ہونے کے بعد علمائے عیسائیت CLERGY کو حاصل ہوا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپی علمائے عیسائیت کی طرح علمائے اسلام کی بھی ان کے علم وفضل کی وجہ سے بہت عزت کی جانے لگی۔ ایک آمر یا غیر ہر دلعزیز حکمران اپنے سیاسی اقتدار کو قانوناً جائز ثابت کرنے کے لئے ان علماء کی تائید وحمایت حاصل کرتا اور اس طرح اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ رفتہ رفتہ یہ علماء حزب اختلاف کا کردار بھی ادا کرنے لگے۔ وہ خود تو اقتدار اپنے ہاتھوں میں نہ لیتے تھے لیکن سیاسی اقتدار پر اثر انداز ہوئے بغیر بھی نہ رہتے تھے۔

اس نئی صورتِ حال میں سیاسی اور معاشرتی بغاوتوں اور باغیانہ رویّوں کو مذہب کی بنیاد پر جائز قرار دیا جانے لگا اور جلد ہی ایسے حالات پیدا ہوتے چلے گئے کہ حصولِ اقتدار کی خاندانی لڑائیوں اور رقابتوں کا مذہبی عقائد سے متعلق اختلافات پر گہرا اثر پڑنے لگا جس کے نتیجہ میں نت نئے مذہبی فرقے وجود میں آنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کی شہادت (۶۴۴ء) کے بعد امّت میں جو دو بڑے فرقے خارجی ازم اور شیعہ ازم ابھر کر سامنے آئے۔ ان کا آغاز جانشینی پر ہونے والے تنازعات کے شاخسانوں کے دوران ہی ہوا۔ خارجی وہ پہلے مسلمان تھے جو اس نظریہ کے بانی مبانی تھے کہ ایک مسلمان جو پکا گناہگار ہو مسلمان نہیں رہتا یعنی یہ کہ گناہگار مسلمان اور کافر میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مزید برآں خارجیوں کو ایک اور ناروا امر کو جائز قرار دینے میں اولیت کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ یہ خارجی ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے خلاف جہاد بالسیف کا اعلان کیا اور اس لئے کیا کہ ان کے یعنی خارجیوں کے نزدیک وہ پکے اور سچے مسلمان نہ تھے۔ خارجی پہلے حضرت علیؓ کے طرف دار تھے لیکن بعد میں وہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین ثالثی کی تجویز سے اختلاف کر کے حضرت علیؓ کا ساتھ چھوڑ کر ان سے علیحدہ ہو گئے۔ اس ثالثی کے ذریعہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اختلافات کو طے کرنا مقصود تھا۔ وہ کہتے تھے

کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰہِ یعنی فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ انسانوں کی قائم کردہ ثالث کا فرض ادا کرنے والی خصوصی عدالتوں کو یہ حق پہنچتا ہی نہیں کہ وہ حَکَم بنیں۔ پھر عقائد کے مخصوص سلسلہ کو بلاکم و کاست اور بلا چون و چرا تسلیم کرانے میں بھی مرکزی کردار خارجیوں نے ہی ادا کیا۔ کسی کو مسلمان تسلیم کرنے یا اس کے اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے کی شرائط کے بارہ میں بھی وہ بہت متشدّد واقع ہوئے تھے اور وہ اس بات پر بھی بہت زور دیتے تھے کہ کسی کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے کے سلسلہ میں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ متعلقہ شخص کے اپنے مسلمان ساتھیوں اور غیر مسلم ساتھیوں کے ساتھ تعلقات کیسے ہیں۔ خارجیوں کے گروپ یا جمعیت کو اسلام میں نمایاں طور پر پیدا ہونے والے پہلے فرقہ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ خارجی ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے اس اصول کو مسترد کیا کہ کسی کے مسلمان شمار ہونے کی وجہ جواز صرف اس کا ایمان ہے۔ وہ اس بات کے سختی سے قائل تھے کہ ایک ایسا مسلمان جو پکا گناہگار ہو فی الاصل مسلمان رہتا ہی نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ایسے پکے گناہگار مسلمان کے ازسرِ نو ایمان لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اسے اس کے اہلِ خانہ سمیت قتل کر دینا ضروری ہے۔ وہ تمام غیر خارجی مسلمانوں کو اسلام کے باغی اور سراسر غیر مسلم قرار دیتے تھے۔ برخلاف اس کے قبل ازیں ہم اس امر کا مطالعہ کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے منافقوں کا بھی علم تھا اور آپؐ یہ بھی جانتے تھے کہ عبداللہ بن اُبی ان کا لیڈر ہے۔ اس کے باوجود آپؐ نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ آپؐ نے تو یہ کبھی نہیں دیکھا اور نہ کبھی اسے چنداں اہمیت دی کہ کسی مسلمان کا علم کس پایہ اور مرتبہ کا ہے۔

خارجیوں کے نظریات براہ راست قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے متصادم تھے۔ ان کا یہ اعلان کہ فیصلہ کرنا اور حکم لگانا اللہ کا کام ہے نہ کہ انسان کا (لَاحُکْمَ اِلاَّ لِلّٰہ) [1] سنت کے سراسر خلاف تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بنو قریظہ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے سعد بن معاذ کو حَکَم مقرر فرمایا تھا اور بطور حَکَم انہوں نے جو سزا سنائی تھی اس پر باقاعدہ عمل بھی کیا گیا تھا [2] سعد کے فیصلہ کے متعلق صحیح مسلم کی حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے امام النووی (وفات ۶۷۶ ہجری

---

[1] مقالاتِ اشعری جلد اول صفحہ ۱۹۱ [2] ابن ہشام کی سیرۃ رسول اللہ صفحہ ۶۸۸، ۶۸۹

مطابق ۴۴۷ عیسوی) نے لکھا ہے: مسلمانوں کو اپنے باہمی تنازعات کے بارہ میں یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ تحکیم کے ذریعہ ان کا فیصلہ کریں [1]۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر دو مسلمان گروہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہوں تو دوسرے مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ان میں صلح کرادیں۔ چنانچہ قرآن مجید کہتا ہے:-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (الحجرات:۱۱)

مؤمنوں کا رشتہ آپس میں بھائی بھائی کا ہے پس تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان جو آپس میں لڑتے ہوں صلح کرادیا کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

مسلمانوں کو کافر قرار دینا اور پھر انہیں اس بناء پر سزا دینا کہ ان کے ایمان کا معیار، کسی خاص مستند شخصیت کے معیار سے مختلف ہے — اس نوع کی تکفیر بازی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس قسم کی تکفیر بازی کا نظریہ اپنی بنیاد اور اصل کے لحاظ سے سراسر غیر اسلامی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کی یہ تعریف فرمائی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لاتا ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت پر ایمان لانے کا اقرار کرتا ہے وہ مسلمان ہے [2]۔ صرف اور صرف یہی وہ تعریف ہے جس پر کسی کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کو پرکھا جا سکتا ہے۔ تکفیر کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے مسٹر برنارڈ لیوئس لکھتے ہیں:-

''کھلی کھلی بغاوت کا بھی یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بغاوت کرنے والے ازخود تکفیر کی زد میں آجاتے ہیں۔ ۹۲۳ عیسوی میں قاضی القضاۃ بہل نے قرامطی باغیوں کو کافر قرار دینے سے اس بناء پر انکار کر دیا تھا کہ وہ اپنے خطوط اللہ تعالیٰ کے نام اور رسول پر صلوٰۃ و سلام سے شروع کرتے تھے۔ صرف اتنی بات سے ہی ان کا مسلمان ہونا مسلّم تھا۔ حضرت امام شافعیؒ کی فقہ میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھنے والا خواہ وہ بغاوت ہی کا کیوں نہ مرتکب ہوا ہو اس امر کا سزاوار ہے کہ اسے مسلمان تسلیم کیا

---

[1] صحیح مسلم مع شرح النووی (لاہور ۱۹۵۸، ۱۹۶۲) جلد دوم صفحہ ۱۱۲، ۱۱۳

[2] صحیح البخاری و صحیح مسلم کتاب الایمان

جائے اور اس کے مطابق ہی اس کے ساتھ سلوک کیا جائے یعنی یہ کہ اس کے اہلِ خانہ اور اس کے مال و متاع کی حفاظت ضروری ہے اور یہ کہ اگر وہ قیدی بن جائے تو سرسری سماعت کے ذریعہ اس پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا یا اسے بطور غلام فروخت نہیں کیا جا سکتا[۱]،،

تکفیر بازی[۲] کی بنیاد دراصل فقہاء نے ڈالی تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں یہ تو حضرت علیؓ کو برا بھلا کہنے اور انہیں خطا کار ٹھہرانے کے سلسلہ میں خارجیوں کا ایک بہانہ تھا لیکن فقہاء نے خارجیوں کی اس اُپج اور نرالی منطق کو اپنا تو لیا لیکن وہ خود مسلمان کی کوئی متفقہ تعریف متعین نہیں کر سکے۔

اگر کوئی شخص ان مسلمانوں کی تعداد معلوم کرنا چاہے جنہوں نے اسلام ترک کر کے کسی اور دین کو اختیار کر لیا تھا اور اس بناء پر انہیں قتل کر دیا گیا تھا تو اسے تیرہ سو سالہ اسلامی تاریخ کو کھنگالنے سے بھی کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ جہاں بھی ملے گا کوئی ایک آدھ واقعہ ہی شاذ کے طور پر ملے گا اور اس کے پیچھے بھی سیاسی وجوہ کارفرما ہوں گی۔ قاہرہ میں MAIMONIDES کو قتل کرنے کی ناکام کوششیں کی گئی تھیں[۳]۔ نیز لبنان میں MARONITE کے امیر یونس[۴] اور اسی طرح تبریز میں رشید الدین[۵] کو قتل کئے جانے کے واقعات ملتے ہیں لیکن یہ گنتی کے چند واقعات ہیں اور نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہندوستان کی مغلیہ سلطنت میں ایسا صرف ایک واقعہ ریکارڈ کیا گیا ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک پرتگیزی راہب نے اسلام قبول کر لیا تھا پھر وہ اپنے دین کی طرف واپس لوٹ گیا۔ اسے اورنگ آباد میں قتل کیا گیا[۶]۔ اس کے قتل کی وجوہات بھی مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھیں۔ اس کے متعلق شدید شبہ کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ قبولِ اسلام کی آڑ میں پرتگیزیوں کے لئے بطور

۱۔ برنارڈ لیوئس کی کتاب ''اسلام اِن ہسٹری'' صفحہ ۲۳۳

۲۔ برنارڈ لیوئس کی کتاب ''اسلام اِن ہسٹری'' صفحہ ۲۱۷ تا ۲۳۶ نیز کتاب دی جیوز آف اسلام صفحہ ۵۳، ۵۴

۳۔ برنارڈ لیوئس کی کتاب ''دی جیوز آف اسلام'' صفحہ ۱۰۰

۴۔ ICNAZ GOLDZIHER کی کتاب ''محمد اینڈ اسلام'' (ترجمہ انگریزی یالے یونیورسٹی پریس ۱۹۱۷ء) صفحہ ۴۷ نوٹ ۳

۵۔ برنارڈ لیوئس کی کتاب ''دی جیوز آف اسلام'' صفحہ ۱۱۱

۶۔ سر جادو ناتھ سرکار کی کتاب ''شارٹ ہسٹری آف اورنگزیب'' (مطبوعہ کلکتہ ۱۹۵۴ء) صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶

جاسوس خدمات بجالا رہا تھا۔

۱۲۴ یا ۱۲۵ ہجری مطابق ۷۴۲ یا ۷۴۳ عیسوی میں جدّ ابن درہم کو ہشام بن عبد الملک کے حکم سے کوفہ یا واسط میں قتل کیا گیا۔ اس کے خلاف خلق قرآن اور جبر و اختیار کے معتزلی عقائد کو پھیلانے اور عام کرنے کا جرم عائد کیا گیا تھا۔ ۱۶۷ یا ۱۶۸ ہجری مطابق ۷۸۸ عیسوی میں عراقی شاعر بشار بن برد پر زندقہ کا الزام لگایا گیا اور پھر اسے زدوکوب کر کے بطیحہ کے قریب دلدل میں پھینک دیا گیا۔ ۳۰۹ ہجری مطابق ۹۳۰ عیسوی میں الحسین بن منصور الحلاّج کو کفریہ کلمات کہنے کی پاداش میں سولی دی گئی۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات میں حلول کر لیا ہے۔ ۵۷۸ ہجری مطابق ۱۱۹۹ عیسوی میں الملک الظاہر کے حکم سے شہاب الدین یحیٰ السہروردی کو قتل کیا گیا۔ اُس کا جرم یہ تھا کہ وہ خیال کرتا تھا کہ ہر چیز جو موجود ہے یا حرکت میں ہے اپنا ایک وجود رکھتی ہے وہ ایک صداقت ہے۔ وہ خدا کی ہستی کے ثبوت میں بھی نور یا روشنی کی علامت کو پیش کرتا تھا۔

سترھویں صدی کا شہید محمد سعید سرمد نامی ایک شخص تھا۔ وہ کاشان میں یہودی والدین کے گھر پیدا ہوا تھا۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ ایک یہودی رِبی تھا۔ یہ عظیم ایرانی شاعر وحدتِ جوہر کا قائل MONIST تھا اور مادہ کے علیحدہ وجود کو تسلیم نہ کرتا تھا۔ اسے اورنگ زیب کے عہدِ حکومت (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) میں قتل کیا گیا۔ اس کا مزار جامع مسجد دہلی کے سامنے سڑک کے اس پار واقع ہے۔ سینکڑوں مسلمان روزانہ اس مزار پر پھول چڑھاتے اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔

افغانستان میں دو احمدیوں کو حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام کے اس دعوے کو درست تسلیم کرنے کی پاداش میں کہ امّت میں جس مسیح کے آنے کا وعدہ کیا گیا تھا میں وہی مسیح موعود ہوں، قتل کیا گیا۔ ان میں سے ایک حضرت صاحبزادہ سید عبد اللطیف صاحب تھے۔ یہ وہ بزرگ تھے جنہوں نے شاہِ افغانستان امیر حبیب اللہ خان کی رسمِ تاجپوشی اپنے ہاتھوں سے ادا کی تھی۔ انہیں ۱۹۰۳ء میں سنگسار کر کے شہید کیا گیا۔ اِسی طرح مولوی نعمت اللہ خان کو ۱۹۲۴ء میں شہید کیا گیا۔ دونوں کو یہ مہلت دی گئی تھی کہ وہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانیؑ کے دعاوی کا انکار کر کے اپنی جان بچا

لیں لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

سوڈان میں محمد محمود طٰہٰ کو ۱۹۸۵ء میں پھانسی دی گئی۔ وہ یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ قرآن مجید میں درج جو قوانین مدینہ میں نازل ہوئے تھے وہ آئندہ زمانوں کے لئے قابلِ عمل نہیں ہیں۔

یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ مملکتِ ترکیہ کے عثمانی سلطان نے ہر چند کہ وہ ایک مذہبی سلطنت کا سربراہ اور تمام مسلمانوں کا خلیفہ تھا۔ بہاء اللہ (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۲ء) کو ارتداد کی بناء پر قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بہاء اللہ نے اپنے آپ کو بابؔ کی پیشگوئی کے بموجب آنے والا موعود قرار دے کر بہائی مذہب کی بنیاد ڈالی تھی [۱] بہائی مذہب اسلام سے کلی طور پر مختلف تھا اور ہنوز مختلف ہی ہے۔ اس مذہب کی رو سے (نعوذ باللہ) قرآن مجید اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی لائی ہوئی تعلیم کا زمانہ گزر چکا ہے اور اب یہ تعلیم دنیا کے لئے کارآمد نہیں ہے۔ بہاء اللہ کو حیفا کے نزدیک عکّہ کے مقام پر قید کیا گیا اور پھر اسے فلسطین کے اُس حصّہ میں جو اب اسرائیل کہلاتا ہے قید میں رکھا گیا۔ برخلاف اس کے جب ایک یہودی راہب سبّا تائی زیوی (۱۶۲۷ء۔۱۶۷۶) SABBATAI ZEVI نے ۱۶۴۸ء میں مسیح ہونے کا دعویٰ کیا تو سلطنتِ عثمانیہ کے شیخ الاسلام نے اس کے قتل کا حکم صادر کیا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن محض موت سے بچنے کی خاطر اپنے دعوے سے تائب ہونے کا اعلان کر کے وہ مسلمان ہو گیا۔ بہاء اللہ نے دعویٰ یہ کیا تھا کہ اس کے وجود میں خدا کا ایک نیا ظہور ہوا ہے۔ اس دعوے کے ساتھ ہی وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا تھا لیکن اس کے ارتداد کے باوجود اسے قتل نہیں کیا گیا کیونکہ اس کا وجود سلطنتِ عثمانیہ میں قانون کی حکمرانی اور امن وامان کے لئے خطرہ کا موجب نہیں تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں ارتداد کے مسئلہ کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے نزدیک تو اس کی حیثیت ایک اجنبی مسئلہ کی ہے۔ اسی لئے اسلام کی رو سے اس دنیا میں ارتداد کی سرے سے کوئی سزا مقرر نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۵۳ء کے فسادات کے سلسلہ میں پنجاب ایکٹ دوم مجریہ ۱۹۵۴ء کی رو سے جو تحقیقاتی عدالت قائم کی گئی تھی اس میں پیش ہونے والے علماء نے بڑے شدّ و مد سے اس امر پر اصرار کیا کہ ایک اسلامی مملکت میں اسلام سے

---

[۱] لیکن مرزا محمد علی باب نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا اسے ۹ر جولائی ۱۸۵۰ء کو تبریز میں قتل کیا گیا۔

ارتداد اختیار کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ جس کی سزا موت مقرر ہے۔ان علماء کے نام یہ ہیں:-

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان پنجاب ۔ مولانا احمد علی صدر جمعیۃ العلمائے اسلام مغربی پاکستان ۔ابوالاعلیٰ مودودی بانی و سابق امیر جماعتِ اسلامی پاکستان ۔مفتی محمد ادریس جامعہ اشرفیہ لاہور و رُکن جمعیۃ العلمائے پاکستان ۔مولانا داؤد غزنوی صدر جماعت اہل حدیث مغربی پاکستان ۔مولانا عبدالحلیم قاسمی جمعیۃ العلمائے اسلام پنجاب اور مسٹر ابراہیم علی چشتی[۱] ۔

مذکورہ بالا علماء کے اس اصرار پر کہ اسلام میں ارتداد کے لئے قتل کی سزا مقرر ہے تحقیقاتی عدالت نے تبصرہ کرتے ہوئے جس رائے کا اظہار کیا وہ خود اس کے اپنے الفاظ کی رو سے یہ ہے:-

''اس عقیدے کے مطابق چوہدری ظفر اللہ خاں نے اگر اپنے موجودہ مذہبی عقائد ورثے میں حاصل نہیں کئے بلکہ وہ خود اپنی رضامندی سے احمدی ہوئے تھے تو ان کو ہلاک کر دینا چاہیے۔ اور اگر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری یا مرزا رضا احمد خاں بریلوی یا ان بے شمار علماء میں سے کوئی صاحب [جو فتویٰ (EX.D.E.14) کے خوبصورت درخت کے ہر پتے پر مرقوم دکھائے گئے ہیں] ایسی اسلامی مملکت کے رئیس بن جائیں تو یہی انجام دیوبندیوں اور وہابیوں کا ہوگا جن میں مولانا محمد شفیع دیوبندی ممبر بورڈ تعلیماتِ اسلامی ملحقہ دستور ساز اسمبلی پاکستان اور مولانا داؤد غزنوی بھی شامل ہیں۔ اور اگر مولانا محمد شفیع دیوبندی رئیسِ مملکت مقرر ہو جائیں تو وہ ان لوگوں کو جنہوں نے دیوبندیوں کو کافر قرار دیا ہے دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیں گے اور اگر وہ لوگ مرتد کی تعریف میں آئیں گے یعنی انہوں نے اپنے مذہبی عقائد ورثے میں حاصل نہ کئے ہوں گے بلکہ خود اپنا عقیدہ بدل لیا ہوگا تو مفتی صاحب ان کو موت کی سزا دے دیں گے۔

جب دیوبندیوں کا ایک فتویٰ (EX.D.E.13) جس میں اثنا عشری شیعوں کو کافر و مرتد قرار دیا گیا ہے عدالت میں پیش ہوا تو کہا گیا کہ یہ اصلی نہیں بلکہ مصنوعی ہے لیکن جب مفتی محمد شفیع نے اس امر کے متعلق دیوبند سے استفسار کیا تو اس دارالعلوم کے

[۱] منیر کمیشن رپورٹ صفحہ ۲۱۸، ۲۱۹

دفتر سے اس فتویٰ کی ایک نقل موصول ہوگئی جس پر دارالعلوم کے تمام اساتذہ کے دستخط ثبت تھے اور ان میں مفتی محمد شفیع صاحب کے دستخط بھی شامل تھے۔ اس فتوے میں لکھا ہے کہ جو لوگ حضرت صدیق اکبرؓ کی صحابیت پر ایمان نہیں رکھتے، جو لوگ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے قاذف ہیں اور جو لوگ قرآن میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں وہ کافر ہیں۔ مسٹر ابراہیم علی چشتی نے بھی جنہوں نے اس مضمون پر وسیع مطالعہ کیا ہے انہوں نے بھی اس رائے کی تائید کی ہے ان کے نزدیک شیعہ اپنے اس عقیدہ کی وجہ سے کافر ہیں کہ حضرت علیؓ نبوت میں ہمارے رسولِ پاکؐ کے شریک تھے۔ مسٹر چشتی نے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کیا ہے کہ اگر کوئی سنّی اپنا عقیدہ بدل کر شیعوں کا ہم خیال ہو جائے تو آیا وہ اس ارتداد کا مرتکب ہوگا جس کی سزا موت ہے؟ شیعوں کے نزدیک تمام سنّی کافر ہیں اور اہلِ قرآن یعنی وہ لوگ جو حدیث کو غیر معتبر سمجھتے ہیں اور واجب التعمیل نہیں مانتے متفقہ طور پر کافر ہیں اور یہی حال آزاد مفکرین کا ہے۔ اس تمام بحث کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ شیعہ، سنّی، دیوبندی، اہل حدیث اور بریلوی لوگوں میں سے کوئی بھی مسلم نہیں اور اگر مملکت کی حکومت ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو دوسری جماعت کو کافر سمجھتی ہے تو جہاں کوئی شخص ایک عقیدے کو بدل کر دوسرا اختیار کرے گا اُس کو اسلامی مملکت میں لازماً موت کی سزا دی جائے گی اور جب یہ حقیقت مدّنظر رکھی جائے کہ ہمارے سامنے مسلم کی تعریف کے معاملے میں کوئی دو عالم بھی متفق الرائے نہیں ہو سکے تو اس عقیدے کے نتائج کا قیاس کرنے کے لئے کسی خاص قوّتِ متخیّلہ کی ضرورت نہیں۔ اگر علماء کی پیش کی ہوئی تعریفوں میں سے ہر تعریف کو معتبر سمجھا جائے پھر انہیں تحلیل وتحویل کے قاعدے کے ماتحت لایا جائے اور نمونے کے طور پر الزام کی وہ شکل اختیار کی جائے جو گلیلیو کے خلاف انکیوزیشن کے فیصلے میں اختیار کی گئی تھی تو اُن وجوہ کی تعداد بے شمار ہو جائے گی جن کی بناء پر کسی شخص کا ارتداد ثابت کیا جا سکے[۱]۔''

---

۱ رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے فسادات پنجاب اردو ایڈیشن صفحہ ۲۳۶، ۲۳۷

ارتداد کی سزا کا مسئلہ

قبل از یں ہم کتاب ہٰذا کے بعض ابواب میں قرآن مجید اور تاریخ اسلام کے متعدد حوالوں کی رو سے عقیدۂ قتل مرتد کا باطل ہونا واضح کر چکے ہیں۔ اس عقیدہ کے حق میں بالعموم جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ہم نے ان کا تفصیلی جائزہ لے کر ان کا ردّ پیش کیا تھا۔ اس ضمن میں عکرمہ کی روایت اور حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں منکرینِ زکوٰۃ سے متعلق رونما ہونے والے واقعات کا جائزہ بھی لیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ اس سے قطعاً یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ جو لوگ اسلام ترک کر کے کوئی اور مذہب اختیار کر لیں اسلام نے انہیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ہم نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ اس روایت اور ان واقعات سے عقیدۂ قتل مرتد کے حامی جو استدلال کرتے ہیں اس کا اصل حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اب اس باب میں ہم قتل مرتد کے حامیوں کے پیش کردہ بعض مزید دلائل کا جائزہ لے کر واضح کریں گے کہ یہ دلائل بھی اپنے اندر قطعاً کوئی وزن نہیں رکھتے۔

یہ اندازہ لگانا آسان نہیں ہے کہ اسلام میں جبر کا نظریہ کیسے داخل ہوا یعنی آیا کسی اسلامی سرزمین میں اس نظریہ نے جنم لیا یا یہ نظریہ ہے تو مستشرقین کے دماغ کی پیداوار لیکن انہوں نے بعد میں اسے اسلام کی جھولی میں ڈال دیا۔ اسلامی تاریخ کی روشنی میں اس سارے معاملہ کا گہری نظر سے جائزہ لینے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں اس کی رو سے میں پوری دیانتداری سے اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اوّلاً یہ نظریہ خود اسلامی دنیا کی اپنی پیداوار ہے اور ہمارا اسے مستشرقین کے ذہن کی اختراع قرار دینا ہرگز درست نہیں ہے۔ انہوں نے اس نظریہ کو خود مسلمانوں سے اخذ کیا اور پھر اسے مسلمانوں ہی کے خلاف استعمال کر کے اسلام کو بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس وقت اور اس زمانہ میں جبکہ ابھی مستشرقین کا کہیں نام ونشان نہ تھا قرونِ وسطیٰ کے اسلامی طرزِ فکر میں جبر کا نظریہ

موجود تھا۔ بنو امیہ کے دورِ اقتدار کے آخری حصہ میں یہ نظریہ معرض وجود میں آیا اور پھر عباسیوں کے دور میں یہ مسلسل پھلتا پھولتا رہا اور اس طرح زیادہ مضبوطی سے جڑ پکڑتا چلا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عباسی حکمران اسلام کے دشمنوں ہی کے خلاف نہیں بلکہ خود اپنے لوگوں کے بھی خلاف طاقت استعمال کرنے اور انہیں دبا کر رکھنے کے خواہاں تھے۔ اپنے زیر اثر علماء سے وہ کبھی کبھار ہی نہیں بلکہ اکثر اور بار بار طاقت کے استعمال کے حق میں فتوے حاصل کیا کرتے تھے۔ پس اسلام میں جبر کا نظریہ خلافت راشدہ کے بعد کے زمانہ میں علی الخصوص بغداد کی حکومتوں کے اندازِ حکمرانی، ان کے مخصوص طرز عمل اور پالیسیوں کی وجہ سے پیدا ہوا اور انہی کے دور میں اس نے جڑ پکڑی اور خوب پھولا پھلا۔

مغرب کے اہل علم جو بیرونی طور پر ہی نہیں بلکہ دور بیٹھ کر اسلام کے بارہ میں تحقیق کر رہے تھے غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے کہ جبر کا نظریہ ایک اسلامی نظریہ ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو جبر کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سرے سے اسلامی نظریہ ہے ہی نہیں۔ یہ بعد میں قائم ہونے والی بعض مسلمان حکومتوں کو اپنی مخصوص روش اور طرزِ عمل کے جواز کے طور پر اور اس کے لئے بنیاد فراہم کرنے کی خاطر وضع کیا گیا تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسلمان ملکوں میں یہ نظریہ ایک ایسے دور میں رائج ہوا کہ جب ساری دنیا میں عقیدے کی اشاعت اور اثر و رسوخ کے پھیلاؤ کے لئے طاقت کے استعمال کو جائز سمجھا جاتا تھا اور ایسا سمجھنے سے کوئی قوم بھی مستثنیٰ نہ تھی۔

بہرحال یہ بات واضح ہے کہ یہ الزام کہ اسلام اپنے عقائد اور نظریات کی اشاعت کے لئے طاقت کے استعمال کا حامی ہے اور اپنے متبعین کو اس کی ترغیب دلاتا ہے اسلامی تعلیمات کے اصل ماخذوں کے براہِ راست مطالعہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ بعد میں قائم ہونے والی بعض مسلمان حکومتوں کے طرزِ عمل کے جائزے کے بعد اسے گھڑا گیا ہے۔ اب جبکہ ایک نیا دور شروع ہو چکا ہے جس میں احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سمیت جملہ اسلامی لٹریچر کھلے عام دستیاب ہے اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم بھی شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور ان تمام ماخذوں تک مغربی مستشرقین کو براہِ راست رسائی حاصل ہے ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس الزام کو بار بار

دہرائیں اور بہ اصرار دہراتے چلے جائیں۔ ان کو چاہیئے کہ وہ خود اصل ماخذوں تک پہنچیں یعنی وہ قرآن مجید کی تعلیمات، احادیثِ نبویؐ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی نمونہ کا براہ راست مطالعہ کریں تا کہ اصل حقیقت ان پر کھل سکے۔

اس کتاب میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ ہم اس سارے مسئلہ کا ایک خاص نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیں اور وہ نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ہم یہ نہ دیکھیں کہ کسی زمانہ کے مسلمانوں نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا بلکہ یہ دیکھیں کہ اس بارہ میں قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات کیا ہیں اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات اور اپنے عملی نمونہ کے ذریعہ ان تعلیمات کو کس رنگ اور کس پیرائے میں دنیا پر آشکار فرمایا۔

کسی مذہب کی تعلیمات کو اس کے متبعین کے طرزِ عمل کی روشنی میں جانچنے کا رجحان اس لحاظ سے بہت گمراہ کن ہے کہ اس کے نتیجہ میں لوگ اکثر غلط نتائج اخذ کر کے اس مذہب کی اصل اور حقیقی تعلیمات کے بارہ میں عجیب وغریب نظریات اپنا لیتے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ دنیا بھر میں اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایک عرصہ کے بعد تمام مذاہب کے متبعین ان کا اثر قبول کرنا ترک کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالآخر ان کے اعمال اپنے اپنے مذہب کی تعلیم کے مطابق نہیں رہتے، مذہب کی تعلیم اور متبعین کے اعمال میں مطابقت مفقود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں آج بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ہر کوئی آج کے زمانہ کے بدھسٹوں اور ابتدائی دور کے بدھسٹوں کے اعمال کا موازنہ کر کے اور اسی طرح ہندو حکومتوں کے اعمال و کردار کا جائزہ لے کر نیز دوسرے مذاہب کے موجودہ زمانہ کے متبعین اور ان کے ابتدائی پیروؤں کے افعال واعمال کا باہم مقابلہ کر کے دیکھ سکتا ہے کہ ان میں زمین وآسمان کا فرق پایا جاتا ہے بعض جگہ تو اصل تعلیم اور متبعین کے اعمال وکردار میں فرق اتنا زیادہ نظر آتا ہے کہ دونوں میں کسی تعلق یا نسبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مزید برآں یہ امر بھی بہت ضروری ہے کہ سیاست اور مذہب کو باہم خلط ملط نہ کیا جائے۔ کسی قوم کے سیاسی کردار کو اس کے مذہب کی تعلیمات کا آئینہ دار نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ ہر قوم کا یہ فرض متصوَّر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تعلیم پر عمل پیرا ہو لیکن ایسی صورت میں جبکہ قوم ان تعلیمات کو

فراموش کر بیٹھے اور من مانی کرنے پر اتر آئے تو اس کے متضاد کردار کو اس کے مذہب کی تعلیم اپنے اندر منعکس کرنے والا آئینہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ ہے وہ پس منظر جس کی روشنی میں ہمیں عقیدۂ قتل مرتد کے حامیوں کے دلائل کا جائزہ لینا ہے۔

مرتد کی تعریف قرآن مجید کہتا ہے:-

وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ (البقرة:۲۱۸)

اگر ان کی طاقت میں ہو تو تم سے لڑتے ہی چلے جائیں تا کہ تمہیں تمہارے دین سے پھرا دیں اور تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھر جائے اور پھر کفر کی حالت میں مر بھی جائے تو (وہ یاد رکھے کہ) ایسے لوگوں کے اعمال اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اکارت جائیں گے اور ایسے لوگ دوزخ (کی آگ میں) پڑنے والے ہیں۔ وہ اس میں (دیر تک) رہیں گے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص بھی تلوار کے خوف سے (یا سزا دہی کی تکلیف سے ڈر کر) اسلام کو ترک کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو ایسا کرنا اور کر گزرنا اس کا بنیادی حق ہے۔ دوسرے اس سے یہ امر بھی ظاہر و باہر ہے کہ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کو مرتد قرار دے۔ خود اپنے آپ کو مرتد قرار دینے کا اختیار صرف اس شخص کو حاصل ہے جو اسلام کو ترک کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی کسی کو مرتد قرار دینے کا حق دوسروں کو نہیں دیا گیا۔ مطلب یہ ہوا کہ ہر شخص اپنے مذہب کو ترک کرنے میں آزاد ہے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو مرتد قرار دے۔ اسلامی تعلیم کی رو سے نہ مذہبی علماء نہ مفتی و ملاں، اور نہ کوئی غیر روادارانہ رویہ رکھنے والا فرد یا ایسی کوئی حکومت الغرض کوئی بھی کسی کو از خود گھڑ گھڑا کر مرتد نہیں بنا سکتا۔ جو بھی مرتد ہوگا خود اپنی مرضی سے ہوگا کوئی دوسرا اسے زبردستی مرتد نہیں ٹھہرا سکتا۔

ارتداد کے متعلق قرآن مجید کی بعض دیگر آیات قرآن مجید اس ضمن میں مزید کہتا ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَ اَمْلٰى لَهُمْ ۔(محمد:۲۶)

وہ لوگ جو ہدایت ظاہر ہونے اور اسے پالینے کے بعد اس سے پھر گئے شیطان نے ان کو ان کا عمل اچھا کر کے دکھایا ہے اور ان کو جھوٹی امیدیں دلائی ہیں۔

اس ضمن میں قرآن مجید نے اپنی بعض دیگر آیات میں یہ بھی فرمایا ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۔

(المائدة:۵۵)

اے ایماندارو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو (وہ یاد رکھے) اللہ اس کی جگہ جلد ہی ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے جو مؤمنوں پر شفقت کرنے والے ہوں گے اور کافروں کے مقابلہ پر سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ جسے پسند کرتا ہے اسے یہ فضل دے دیتا ہے اور اللہ وسعت بخشنے والا اور بہت جاننے والا ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔(النحل:۱۰۷)

جو لوگ بھی ایمان لانے کے بعد اللہ کا انکار کریں سوائے ان کے جنہیں کفر پر مجبور کیا گیا ہو لیکن ان کا دل ایمان پر مطمئن ہو (وہ گرفت میں نہ آئیں گے) ہاں وہ جنہوں نے اپنا سینہ کفر کے لئے کھول دیا ہو ان پر اللہ کا بہت بڑا غضب نازل ہوگا اور ان کے لئے بڑا بھاری عذاب مقدر ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا ثُمَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا ثُمَّ ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا لَّمۡ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغۡفِرَ لَہُمۡ وَ لَا لِیَہۡدِیَہُمۡ سَبِیۡلًا (النساء:۱۳۸)

اور جو لوگ ایمان لائے اور پھر انہوں نے انکار کر دیا، پھر ایمان لائے اور پھر انکار کر دیا، پھر کفر میں اور بھی بڑھ گئے اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا اور نہ انہیں نجات کا کوئی راستہ دکھائے گا۔

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۠ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّنۡقَلِبۡ عَلٰی عَقِبَیۡہِ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیۡـًٔا ؕ وَ سَیَجۡزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیۡنَ (آلِ عمران:۱۴۵)

اور محمد صرف ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے سب رسول فوت ہو چکے ہیں۔ پس اگر وہ وفات پا جائے یا قتل کیا جائے تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے؟ اور جو شخص اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جائے وہ اللہ کا ہرگز کچھ نقصان نہیں کر سکتا اور اللہ شکر گزاروں کو ضرور بدلہ دے گا۔

قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات سے ان کے مفہوم کو کھینچ تان کر کسی لحاظ سے بھی یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ ان میں مرتدوں کے لئے قتل کی سزا کا ذکر کیا گیا ہے۔

سورۃ التوبہ کی بعض متعلقہ آیات عقیدۂ قتل مرتد کے حامیوں کی طرف سے اس تلاش میں کہ قرآن مجید کی کم از کم ایک آیت ہی ایسی مل جائے کہ جس سے یہ ثابت کرنے میں مدد مل سکے کہ ارتداد کی سزا موت ہے کچھ کم دوڑ دھوپ اور سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ تلاشِ بسیار کے بعد ان کی طرف سے قرآن مجید کی نویں سورۃ یعنی سورۃ التوبہ کی آیات ۱۲، ۱۳ کا سہارا لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دکھانے کے لئے کہ ان کی یہ کوشش بھی کس قدر بے نتیجہ ثابت ہوئی ہے ہم اس سورۃ کی آیات ۳ تا ۱۴ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ یہ آیات اپنا مفہوم خود واضح کر رہی ہیں۔ ان سے ہر اس شخص کی کوششیں بیکار ثابت ہوئے بغیر نہیں رہتیں جو ان سے من مانا کوئی مفہوم اخذ کر کے ان کے برخلاف کچھ اور ثابت کرنا چاہے۔

آیت ۳۔ وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمام لوگوں میں حج اکبر کے دن یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اسی طرح اس کا رسول بھی مشرکوں (کے سب الزاموں) سے بری ہو چکے ہیں۔سو اگر (فتح مکہ کا نشان دیکھ کر) تم توبہ کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور اگر تم پیٹھ پھیر لو تو تم ہرگز اللہ کو ہرا نہیں سکتے اور تو کفار کو خبر دے کہ ان کے لئے دردناک عذاب مقدر ہے۔

آیت ۴۔ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۔

ہاں مشرکوں میں سے جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے اور پھر انہوں نے تم سے بالکل عہد شکنی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی کی مدد نہیں کی تم ان کے عہد کو عہد کی مدتِ مقررہ تک نبھاؤ۔اللہ یقیناً متقیوں کو پسند کرتا ہے۔

آیت ۵۔ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔

پس جب وہ چار مہینے گزر جائیں جن میں لڑائی سے منع کیا گیا تھا تو مشرکوں کے اس خاص گروہ کو جہاں بھی پاؤ قتل کرو اور ان کو گرفتار کرلو اور ان کو ان کے قلعوں میں محصور کر دو اور ہر گھات کی جگہ پر ان کے لئے بیٹھو۔پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ کھول دو۔اللہ یقیناً بڑا بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

آیت ۶۔ وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ

ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ۔

اور مشرکوں میں سے اگر کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دے کیونکہ وہ ایسی قوم ہے جو (حقیقت کو) نہیں جانتی۔

آیت ۷۔ كَيۡفَ يَكُوۡنُ لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ عَهۡدٌ عِنۡدَ اللّٰهِ وَ عِنۡدَ رَسُوۡلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ‌ ۚ فَمَا اسۡتَقَامُوۡا لَـكُمۡ فَاسۡتَقِيۡمُوۡا لَهُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ۔

اللہ اور اس کے رسول مشرکوں سے کس طرح عہد و پیمان کر سکتے ہیں سوائے ان مشرکوں کے جن کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے پاس عہد کیا تھا۔ پس جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ معاہدہ پر قائم رہو۔ اللہ متقیوں (یعنی عہد توڑنے سے بچنے والوں) کو ہی پسند کرتا ہے۔

آیت ۸۔ كَيۡفَ وَاِنۡ يَّظۡهَرُوۡا عَلَيۡكُمۡ لَا يَرۡقُبُوۡا فِيۡكُمۡ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً‌ ؕ يُرۡضُوۡنَكُمۡ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَتَاۡبٰى قُلُوۡبُهُمۡ‌ ۚ وَاَكۡثَرُهُمۡ فٰسِقُوۡنَ۔

ہاں دوسرے مشرکوں کو کوئی رعایت کیسے دی جاسکتی ہے کیونکہ وہ اگر تم پر غالب آجائیں تو تمہاری کسی رشتہ داری یا معاہدہ کی پرواہ نہیں کریں گے۔ وہ تم کو اپنے منہ کی باتوں سے خوش رکھتے ہیں حالانکہ ان کے دل (ان باتوں سے) انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر عہد و پیمان کو توڑنے والے ہوتے ہیں۔

آیت ۹۔ اِشۡتَرَوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِهٖ‌ ؕ اِنَّهُمۡ سَآءَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ۔

انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلہ میں ایک حقیر سی قیمت وصول کی ہے اور اس کے راستہ سے لوگوں کو روکا ہے۔ یقیناً ان کے اعمال بہت برے ہیں۔

آیت ۱۰۔ لَا يَرۡقُبُوۡنَ فِىۡ مُؤۡمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً‌ ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُعۡتَدُوۡنَ۔

کسی مومن کے بارہ میں وہ رشتہ داری کا پاس نہیں کرتے اور نہ عہد و پیمان کا، اور وہ حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔

آیت ۱۱۔ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ ؕ وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔

پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نمازوں کو قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں اور ہم اپنی آیات کو علم والی قوم کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔

آیت ۱۲۔ وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ۔

اور اگر (یہ لوگ) اپنے عہد و پیمان کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر طعن کریں تو (ایسے) سردارانِ کفر سے لڑائی کرو تا کہ وہ شرارتوں سے باز آجائیں۔

آیت ۱۳۔ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔

(اے مومنو!) کیا تم اس قوم سے نہیں لڑو گے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور رسول کو (اس کے گھر سے) نکالنے کا فیصلہ کرلیا اور تم سے (جنگ چھیڑنے میں) انہوں نے ہی ابتداء کی، کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مومن ہو تو سمجھ لو کہ اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔

آیت ۱۴۔ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۔

ان سے لڑو۔ اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں سے عذاب دلوائے گا اور ان کو رسوا کرے گا اور تمہیں ان پر غلبہ دے گا اور اس ذریعہ سے مومن قوم کے دلوں کو (صدمہ اور خوف سے) نجات دے گا۔

ہم نے سورۃ التوبہ کی آیات ۳ تا ۱۴ اس لئے درج کی ہیں تا کہ ان میں جو مضمون بیان ہوا

ہے وہ پورے سیاق و سباق کے ساتھ سامنے آجائے اور اس کے بارہ میں قطعاً کوئی شبہ باقی نہ رہے۔قبل اس کے کہ ہم ان آیات کے اصل مضمون کی طرف آئیں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ لوگ جو سورۃ التوبہ کی آیات ۱۱، ۱۲ کے اصل مضمون سے اعراض کرتے ہوئے ان سے زبردستی یہ استنباط کرتے ہیں کہ ارتداد کی سزا قتل ہے وہ اس امر کی کوئی وضاحت نہیں کرتے کہ ان کے اس استنباط اور قرآن مجید کی متعدد دوسری آیات میں جو زبردست تضاد پایا جاتا ہے اسے کیونکر حل کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس تضاد کو دور کر ہی نہیں سکتے۔

جو لوگ اس امر کے حامی ہیں کہ ارتداد کی سزا قتل ہے انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مذکورہ بالا جملہ آیات مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں (ملاحظہ ہو آیت ۳) اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ قریشِ مکہ اسلام کو بزورِ شمشیر صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کے لئے کھلی کھلی دشمنی کی راہ پر گامزن ہو چکے تھے۔سو یہ آیات ان مشرکوں کے بارہ میں ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں کو جان بوجھ کر توڑا تھا اور اسلام کا تمسخر اڑانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ان آیات میں ایسے لوگوں کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے جو اسلام پر ایمان لانے کے بعد اس سے پھر گئے ہوں اور جنہوں نے اسلام کو ترک کرنے کا اعلان کیا ہو۔مومنوں کو مخاطب کر کے ذکر تو صرف اس امر کا کیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے تمہارے ساتھ معاہدہ کرنے اور پختہ عہد باندھنے کے بعد اسے عمداً توڑ دیا ہے وہ تمہارے دین کے ساتھ دشمنی میں حد سے بہت زیادہ بڑھ چکے ہیں اور اسے بزورِ شمشیر مٹانے پر تل گئے ہیں۔اور پھر جارحیت کی ابتداء بھی انہوں نے ہی کی ہے تمہیں ان سے لڑنے کی تو اجازت ہے لیکن یہ اجازت صرف ان کے سرداروں کے خلاف لڑنے تک محدود ہے کیونکہ ان کے عہد و پیمان سب جھوٹے اور سراسر بے وقعت ثابت ہو چکے ہیں۔نیز یاد رہے کہ یہ اجازت تمہیں اس لئے دی گئی ہے تا کہ وہ تمہارے خلاف جارحانہ اقدامات سے باز آجائیں — یہ ہے صحیح مفہوم ان آیاتِ کریمہ کا جسے توڑ مروڑ کر قتل کی سزا کے حامیوں نے اپنا مؤقف درست ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ان آیات میں خفیف سے خفیف اشارہ بھی ان لوگوں کی طرف نہیں ہے جنہوں نے اسلام پر ایمان لانے کے بعد اسے ترک کر دیا ہو اور انہیں جبراً اسلام میں واپس

لانے کی کوشش کی جارہی ہو۔ جن لوگوں کا ان آیات میں ذکر ہے ان کا قرآن مجید کی ایک اور سورۃ میں بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہم اس سورۃ کی متعلقہ آیات بھی ذیل میں درج کر رہے ہیں تاکہ یہ بات اور زیادہ واضح ہو جائے کہ سورۃ توبہ کی آیات ۳ تا ۱۴ میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ ہرگز مرتد نہیں تھے بلکہ یہ وہ لوگ تھے جو سرے سے ایمان ہی نہیں لائے تھے بلکہ اسلام کو بزورِ شمشیر مٹانے کے لئے جنہوں نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ چنانچہ قرآن مجید ایک اور سورۃ میں مومنوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:-

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (الممتحنة: ۸ تا ۱۰)

قریب ہے کہ اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو کافروں میں سے تمہارے دشمن ہیں محبت پیدا کر دے اور اللہ اس پر قادر ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا اور بے انتہاء رحم کرنے والا ہے۔ اللہ تم کو ان لوگوں سے نیکی کرنے اور عدل کا معاملہ کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دینی اختلاف کی وجہ سے نہیں لڑے اور جنہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تم کو صرف ان لوگوں سے (دوستی کرنے سے) روکتا ہے جنہوں نے تم سے دینی اختلاف کی وجہ سے جنگ کی اور جنہوں نے تم کو گھروں سے نکالا یا تمہارے نکالنے پر تمہارے دوسرے دشمنوں کی مدد کی اور جو لوگ بھی ایسے لوگوں سے دوستی کریں وہ ظالم ہیں۔

عارضی ایمان اور ایمان لانے سے عارضی انکار قرآن مجید کی ایک اور آیت میں مذکور ہے:-

وَ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ۔ (آلِ عمران:۷۳)

اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مومنوں پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس پر دن کے ابتدائی حصہ میں تو ایمان لے آؤ اور اس کے پچھلے حصہ میں اس سے انکار کر دو۔ شاید اس ذریعہ سے وہ (یعنی مسلمان اپنے دین سے) پھر جائیں۔

اس آیت میں اہل کتاب سے مراد یہودِ مدینہ ہیں۔ان کی یہودیانہ انداز کی یہ ایک چال تھی کہ اس طرح مسلمانوں میں شبہات پیدا کئے جائیں۔وہ یہ امید رکھتے تھے کہ شاید اس طرح بعض مسلمان شبہات کا شکار ہوکر اسلام ترک کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔اگر ارتداد کی سزا موت ہوتی تو پھر یہودیوں کے لئے اپنے اس منصوبہ پر عمل پیرا ہونا کیونکر ممکن ہوسکتا تھا۔اگر ارتداد کے جرم میں کسی ایک کو بھی قتل کیا گیا ہوتا تو دوسروں کے لئے یہ امر ایک روک بن جاتا اور وہ اس مرتد کے نقش قدم پر چلنے سے باز رہتے۔ایسی صورت میں یہودی ایسا منصوبہ بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ان کا یہ منصوبہ صاف بتا رہا ہے کہ ارتداد کی سزا قتل کا نظریہ بہت بعد کے زمانہ کی پیداوار ہے۔

قتل کی سزا کے حامیوں کا کہنا یہ ہے کہ اس آیت میں صرف یہودیوں کے ایک منطقیانہ نظریہ کا ذکر کیا گیا ہے جس پر انہوں نے کبھی عمل نہیں کیا۔اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ محض ایک نظریاتی بات تھی تو بھی یہ آیت اس امر کا ایک بین ثبوت ہے کہ ارتداد کی اس دنیا میں کوئی سزا مقرر نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی ایسی سزا (یعنی قتل کی سزا) مقرر ہوتی تو یہودی ایسے کسی نظریہ کو کیوں ہوا دیتے۔ مزید برآں یہ کہنا ہی غلط ہے کہ یہ نظریہ پر مبنی محض ایک مفروضہ تھا کیونکہ کتب احادیث میں اس امر کا ذکر موجود ہے کہ خیبر اور عرینہ کے بارہ یہودی راہبوں کی طرف سے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا گیا تھا (بحوالہ تفسیر بحر المحیط جلد دوم صفحہ ۴۹۳)۔

تمام تفاسیر اس امر پر متفق ہیں کہ سورۃ التوبۃ، فتح مکہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیانی زمانہ میں نازل ہوئی تھی۔اس سے یہ بات دو اور دو چار کی طرح ثابت ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ یہودیوں نے اپنے اس منصوبہ پر اُس زمانہ میں عملدرآمد کیا جبکہ اسلام عرب میں پوری مضبوطی کے

ساتھ قائم ہو چکا تھا۔ اگر ارتداد کی سزا قتل مقرر تھی تو ایسی صورت میں یہودی خودکشی پر مبنی ایسی احمقانہ حکمت عملی کیسے وضع کر سکتے تھے؟ مسلمانوں کو وہ اس امر کی ترغیب کیسے دلا سکتے تھے کہ وہ اپنے مذہب پر اس رنگ میں عمل پیرا ہوں کہ دن میں تو اس کی صداقت کا اعتراف کریں اور دن کے آخری حصہ میں اس امر کا انکار کر دیا کریں درآنحالیکہ وہ جانتے تھے کہ جو مسلمان بھی اس طرح اپنا مذہب تبدیل کریں گے وہ قتل کر دیئے جائیں گے؟

احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جو لوگ اس عقیدہ کے حامی ہیں کہ ارتداد کی سزا قتل ہے ان کا ایک عجیب وطیرہ یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث کو دور از کار تاویلات کا سہارا لے کر غلط معانی پہناتے ہیں۔ اور اس طرح بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں حالانکہ یہ وہ احادیث ہیں جن سے ان کے نظریہ کی قطعاً کوئی تائید نہیں ہوتی۔ وہ جان بوجھ کر ایسی احادیث کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو اس امر پر شاہد ناطق ہیں کہ اس زندگی میں ارتداد کی سرے سے کوئی سزا ہے ہی نہیں۔ اس ضمن میں ہم بات کو اس کے اختتام تک پہنچانے کی غرض سے ایک ایک کر کے اُن احادیث کو لیتے ہیں جو ارتداد کے لئے سزائے قتل کے حامیوں کی طرف سے بالعموم پیش کی جاتی ہیں۔

(ا) ابوقلابہ، حضرت انسؓ کی سند پیش کر کے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکال یا عرینہ کے لوگوں سے، جو آپ کے ساتھ ملاقات کے لئے حاضر ہوئے تھے، فرمایا کہ وہ مدینہ کے باہر جا کر آپؐ کی اونٹنیوں کے رکھوالے کے پاس قیام کریں گے۔ ان لوگوں نے اونٹنیوں کے رکھوالے کو قتل کر دیا اور اونٹنیوں کے گلّہ کو ہانک کر لے گئے۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ وہ سب مرتد ہو گئے تھے لیکن ان کو جو سزا دی گئی تھی وہ ارتداد کی پاداش کے طور پر نہیں دی گئی تھی بلکہ اونٹنیوں کے رکھوالے کو قتل کرنے کی وجہ سے دی گئی تھی۔

(ب) جہاں تک ابن خطل کا تعلق ہے وہ بلاشبہ ان چار میں سے ایک تھا جنہیں فتح مکہ کے موقع پر قتل کیا گیا تھا اور وہ تھا بھی مرتد لیکن یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس نے اپنے ہمسفر کو قتل کر دیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے قتل کا حکم ارتداد کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ خود قتل کا مجرم ثابت ہو چکا تھا۔

(ج) ایک اور واقعہ جو بالعموم پیش کیا جاتا ہے مقیس بن صبابہ کے قتل سے متعلق ہے۔ اس نے اپنے بھائی ہشام کی موت کا بدلہ لینے کے لئے ایک انصاری کو قتل کر دیا تھا حالانکہ اس کا بھائی ذی قرد کے غزوہ کے موقع پر ایک اتفاقی حادثہ کے نتیجہ میں مرا تھا۔ اس واقعہ کے بعد مقیس مرتد ہو گیا۔ اسے ایک انصاری کو قتل کے جرم میں موت کی سزا دی گئی تھی۔

مذکورہ بالا تینوں واقعات میں جن تین اشخاص کو قتل کی سزا دی گئی تھی ان میں سے ہر شخص پہلے کسی اور کو قتل کر چکا تھا۔ تینوں نے بے شک ارتداد اختیار کر لیا تھا لیکن اس امر سے کیسے آنکھیں بند کی جاسکتی ہیں کی وہ تینوں ہی قاتل تھے اور تینوں کو ان کے اس جرم کی پاداش کے طور پر قتل کیا گیا تھا نہ کہ ان کے ارتداد کی بناء پر۔ اب ظاہر ہے قاتلوں کے خلاف قتل کی سزا کے نفاذ کو ارتداد کی طرف کیسے منسوب کیا جاسکتا ہے۔

(د) جو لوگ اس نظریہ کے حامی ہیں کہ ارتداد کی سزا قتل ہے وہ اس نظریہ کے ثبوت میں ایک حدیث پر بہت انحصار کرتے ہیں جس میں ارتداد اختیار کرنے کی پاداش کے طور پر ایک عورت کے قتل کئے جانے کا ذکر ہے۔ اس حدیث کے بارہ میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ حدیث انتہائی نا قابل اعتبار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی ارتداد کی بناء پر کسی عورت کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں مذکور ہے:-

> **''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارتداد کی پاداش میں عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرما دیا تھا کیونکہ اس بارہ میں تعزیری احکام کا اصل الاصول یہ ہے کہ سزا دہی کے عمل کو آخرت پر ہی چھوڑ دیا جائے کیونکہ اگر اس زندگی میں ارتداد کی کوئی سزا دی جائے تو ایسا کرنا خدا تعالیٰ کے اختیار میں مداخلت کے مترادف ہوگا۔ یہ ایک ایسا مقدمہ ہوگا کہ جس میں اس امر کے متعلق باز پُرس ہوگی جس کی باز پُرس کرنا خدا تعالیٰ کا اپنا کام ہے۔ اس اصول کو صرف اس وقت توڑنا جائز ہوگا جبکہ مقصد متعلقہ شخص کو (جنگ کے دوران) جارحیت جاری رکھنے سے روکنا ہو۔ چونکہ عورتیں اپنی فطرت کے لحاظ سے جنگ کرنے کی اہل نہیں ہوتیں اس لئے ایک مرتد عورت کو سزا دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔''**

عجیب بات ہے کہ مودودی صاحب جیسے عالم بھی ایسی ضعیف حدیثوں پر انحصار کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے جنہیں بڑے بڑے نامور علماء مسترد کر چکے ہیں حالانکہ مودودی صاحب جیسے عالموں کے متعلق بالعموم سمجھا یہی جاتا ہے کہ ایسی ضعیف حدیثوں پر انحصار کرنے سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں ان سے وہ بخوبی آگاہ ہوں گے۔

(ر) عبداللہ بن سعد کا واقعہ ہم قبل ازیں صفحہ ۱۹۹ پر بیان کر چکے ہیں۔ اگر ارتداد کی کوئی سزا مقرر ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس ارشاد کی رو سے کہ کوئی شخص بھی قانون سے بالا نہیں ہے اس کے نفاذ میں کسی رو رعایت کے کبھی روادار نہ ہوتے اور اس بارہ میں ہرگز بھی پس و پیش سے کام نہ لیتے۔ آپؐ کے نزدیک خدائی قوانین کے نفاذ اور ان پر عمل درآمد کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور یہ کہ ان کے نفاذ سے سرمو انحراف کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اندریں صورت اگر ارتداد کی سزا قتل تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان بن عفان کی سفارش پر عبداللہ بن سعد کو کیسے معاف کر سکتے تھے۔

<u>صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین</u> ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ارتداد کی پاداش میں قتل کی سزا کے حامیوں کو اپنے اس نظریہ کو درست ثابت کرنے میں نہ تو قرآن مجید سے کوئی مدد ملتی ہے اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے۔ وہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں قرآن مجید اور احادیث نبوی کا کوئی واضح اور ناقابل تردید حوالہ پیش کر ہی نہیں سکتے لیکن کئی اور ڈھب ہیں جنہیں اختیار کرنے کے وہ عادی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کے دیگر دلائل کا بھی تفصیل سے جائزہ لے کر یہ دکھایا جائے کہ ان کے دوسرے دلائل بھی اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتے۔ ان کے یہ دلائل براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی فیصلوں پر مبنی نہیں بلکہ آپؐ کے صحابہؓ کی آراء پر مبنی ہیں۔ شروع میں ہی یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ صحابہ کرامؓ کے تبصروں یا آراء کی ان کی ذاتی توضیحات سے بڑھ کر اور کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ان کو قرآن مجید کے احکام کی طرح واجب العمل قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ انہیں ذاتی آراء ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس وضاحت کے بعد ہم سزائے قتل کے حامیوں کے دیگر دلائل کی طرف آتے ہیں۔

(ا) زکوٰۃ کی ادائیگی سے متعلق بڑے پیمانے پر رونما ہونے والے واقعات کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں (ملاحظہ ہوں صفحات ۲۰۲ تا ۲۰۶)۔ عبس اور ذبیان وہ دو قبائل تھے جنہوں نے مدینہ پر حملہ آور ہو کر جارحیت کا آغاز کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت اسامہؓ کے اپنی مہم سے واپس آنے سے قبل ہی فوج کشی کر کے ان کے خلاف جہاد کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرتدین جارح تھے کیونکہ وہ لڑائی میں پہل کر کے کھلی کھلی جارحیّت کے مرتکب ہوئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تھا بلکہ وہ مسلمانوں پر تلواریں سونت کر حملہ آور بھی ہوئے تھے۔ وہ مرتد ہی نہیں بلکہ اسلامی حکومت کے باغی بھی تھے۔ انہوں نے اپنے درمیان رہنے والے مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا تھا، ان میں سے بعض کو زندہ جلا ڈالا تھا اور جنہیں قتل کیا تھا ان کے ناک، کان اور بعض دیگر اعضاء کاٹ کر ان کا مُثلہ بھی کیا تھا۔ جو لوگ اس واقعہ کو بنیاد بنا کر یہ قرار دیتے ہیں کہ مرتد کی سزا قتل ہے وہ یا تو تاریخی حقائق سے ناواقف ہیں یا باغیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل پر پردہ ڈال کر عمداً لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ب) پھر ارتداد کے لئے سزائے قتل کے حامی یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ اگر ارتداد کی کوئی سزا مقرر نہ تھی تو مسیلمہ کذاب کو اس کے حال پر کیوں نہ چھوڑ دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیلمہ سیاسی اقتدار کا خواہاں تھا۔ وہ بنو حنیفہ کی معیّت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا بھی تھا اور اس نے اس شرط پر آپؐ کی اطاعت قبول کرنے کی پیشکش کی تھی کہ آپؐ اسے اپنا جانشین مقرر فرماویں۔ آپؐ نے جواباً فرمایا تھا میں اسے (مسیلمہ کو) کھجور کے درخت کی ایک شاخ بھی دینے کے لئے تیار نہیں۔ یہ جواب سن کر مسیلمہ واپس چلا گیا اور اس امر کا مدعی بن بیٹھا کہ آدھا عرب اس کی ملکیت ہے۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک خط بھی بھجوایا جس میں اپنے اس دعوے کا اعلان کیا کہ ''میں اقتدار میں تمہارا شریک اور حصّہ دار مقرر کیا گیا ہوں''۔ آپؐ نے اس خط کے جواب میں سورۃ الاعراف کی آیت ۱۲۹

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔

لکھوا بھیجی جس میں اس امر کا ذکر ہے کہ ملک تو اللہ کا ہے اپنے بندوں میں سے وہ جس کو چاہتا ہے اس کا وارث کر دیتا ہے اور اچھا انجام متقیوں کے ہی ہاتھ رہتا ہے۔

مسیلمہ نے اپنے دعوٰی نبوت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت حبیب بن زید کو پکڑ لیا۔ پھر ان کا ایک ایک عضو کاٹ کر بہت اذیت ناک طریق پر ان کو قتل کیا اور اسی پر بس نہیں بلکہ ان کے جسم کے ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے انہیں نذرِ آتش کر دیا۔ ارتداد کے لئے سزائے قتل کے حامی قتل کے اس بھیانک جرم کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ مسیلمہ کا ایک ہی جرم تھا کہ وہ مرتد ہو گیا تھا۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ اگر اس نے خود ایک بے گناہ کے قتل کا ارتکاب نہ کیا ہوتا تو کیا محض ارتداد کی بناء پر اسے قتل کر دیا جاتا؟ کیا قتل کے ارتکاب، سفاکی سے ایک ایک عضو کو کاٹنا اور فساد فی الارض کی پاداش میں اسے عدالتی کارروائی کا سزاوار نہیں ٹھہرایا گیا اور کیا انصاف کے تقاضے ان وجوہات کی بناء پر پورے نہیں کئے گئے؟ اس امر کی خفیف سے خفیف شہادت بھی موجود نہیں ہے کہ یہ سننے کے بعد کہ مسیلمہ نے آپؐ کی نبوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اس بناء پر اسے قتل کئے جانے کا سزاوار ٹھہرایا ہو یا اپنے کسی صحابیؓ کو اسے قتل کرنے کا حکم دیا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مسیلمہ کے خلاف سزا کا کوئی حکم صادر ہونے کی کوئی شہادت تلاش کرنے میں ناکامی کے بعد مولانا مودودی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مزعومہ خواہش کا سہارا لینا پڑا ہے۔ اس خود ساختہ اور نام نہاد خواہش کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ آپؐ نے اپنی وفات کے آخری لمحات میں اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ مسیلمہ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی کسی خواہش کا اظہار فرمایا ہوتا تو یہ یقین کرنا ناممکنات میں سے ہے کہ خلیفہ رسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپؐ کی اس خواہش کو نظر انداز کر دیا اور آپؐ کی اس خواہش کے احترام میں مسیلمہ کے خلاف فوجی مہم کا آغاز نہ فرمایا ہوتا ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ آنحضورؐ اس خواہش کا اظہار فرماتے اور حضرت ابوبکرؓ اسے پورا کرنے میں تاخیر سے کام لیتے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اُس وقت تک کیوں انتظار کیا جب تک کہ مسیلمہ نے خود جارحیت کا آغاز نہ کیا اور مسلمانوں کے خلاف کھلی کھلی بغاوت پر نہ اتر آیا؟

چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسیلمہ نے ایک زبردست فوج جمع کی جو بنو حنیفہ کے چالیس ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی اور پھر مدینہ کی طرف پیشقدمی کر کے خود جارحیت کا آغاز کیا۔ چنانچہ جب وہ جارحیت کا آغاز کر بیٹھا تب حضرت ابوبکرؓ نے اس کی کھلی کھلی بغاوت اور حضرت حبیبؓ بن زید کے قتل کی بھیانک واردات کے جواب میں اس کے خلاف اسلامی لشکر کو کوچ کرنے کا حکم دیا۔

(ج) ایک اور واقعہ جسے بطور مثال پیش کیا جاتا ہے نبوت کے ایک اور جھوٹے مدعی طلیحہ سے متعلق ہے۔ اس نے صرف نبوت کا جھوٹا دعویٰ ہی نہیں کیا تھا بلکہ اس نے عکاشہ بن محصن اور ثابت بن ارقم انصاری کو قتل کر ڈالا تھا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے اس کے خلاف جنگ کا آغاز کرنے سے قبل ایک سفیر کے ذریعہ اسے یہ پیغام بھجوایا کہ وہ صلح کر لے اور خون خرابے سے باز رہے۔ سزائے قتل کے حامی اس امر کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ اگر ارتداد کی سزا قتل ہوتی تو پھر طلیحہ کو معافی دینے کی غرض سے اس کے پاس کسی سفیر کو بھیجنے میں کوئی تک نہ تھی۔

(د) ایسا ہی معاملہ اسود عنسی کا ہے۔ اس نے ارتداد اختیار کر کے علم بغاوت بلند کیا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اس نے یمن کے مسلمان گورنر شہر بن باذان کو قتل کر کے اس کی بیوہ سے زبردستی شادی کر لی، خود یمن کا حاکم بن بیٹھا اور پورے یمن میں اپنے حاکم ہونے کا باقاعدہ اعلان کروایا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بغاوت کا علم ہوا تو آپؐ نے معاذ بن جبلؓ اور دوسرے مسلمانوں کو ایک خط کے ذریعہ اس کا مقابلہ کرنے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ وہ بعد ازاں مسلمانوں کے ساتھ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس کی موت کی خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے ایک روز بعد مدینہ پہنچی۔

(ہ) اسی طرح لقیط بن مالک ازدی مرتد ہو گیا اور اس نے بھی نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس نے جعفر اور عباد کو جو سرکاری اہل کاروں کے طور پر عمان میں مقرر تھے وہاں سے نکال باہر کیا۔ اس کا بھی دوسرے مدعیانِ نبوت کی طرح مذہب سے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا۔ وہ بھی ارتداد کی آڑ میں اپنے سیاسی مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ اسلامی مملکت میں رہنے کے باوجود اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے، اقتدار پر قبضہ جمائے اور اس طرح سیاسی غلبہ حاصل کرے۔

اس صورتِ حال میں ارتداد کا سوال ہی سراسر بے محل اور بے معنی ہے۔ اس کا اصل جرم تھا ہی علی الاعلان بغاوت۔ لمحہ بھر کے لئے ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ لقیط بن مالک ازدی اور اس کے ساتھیوں نے اسلام سے ارتداد اختیار نہیں کیا تھا بلکہ وہ مسلم ریاست کے خلاف صرف بغاوت کے مرتکب ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں حکومت بغاوت فرو کرنے کے لئے اقدام کرتی یا نہ کرتی؟ ظاہر ہے کہ بغاوت فرو کرنے کے لئے اس نے اقدام کرنا ہی تھا۔ ملک میں افراتفری پھیلانے اور فساد برپا کرنے کی سزا قرآن مجید نے قتل مقرر کی ہے، مجرد ارتداد کی یہ سزا ہرگز مقرر نہیں ہے۔

(و) ارتداد کی بناء پر قتل کی سزا کے حامی امِّ قرفہ کے واقعہ کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ یہ عورت حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں مرتد ہوگئی تھی۔ اس کے تیس بیٹے تھے اور وہ انہیں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر مسلسل اکساتی رہتی تھی۔ اسے اس کی غداری اور قتل و غارت گری کی بناء پر قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کو یہ سزا اس کے ارتداد کی وجہ سے ہرگز نہیں دی گئی تھی۔

(ز) خوارج کے خلاف حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مہم جوئی کا بھی اکثر حوالہ دیا جاتا ہے۔ خوارج وہ لوگ تھے جنہوں نے زمین میں فساد برپا کیا تھا۔ انہوں نے بہت سے مسلمان مردوں اور عورتوں ہی کو نہیں بلکہ حضرت علیؓ کے مقرر کردہ گورنر، اس کی ایک غلام عورت اور حضرت علیؓ کے سفیر کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا (خوارج کے متعلق بحث صفحہ ۲۰۷، ۲۰۸ پر کی گئی ہے)۔

(ہ) حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری یمن میں گورنر مقرر ہوئے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ سزائے قتل کے حامی اپنے نظریہ کی تائید میں اس واقعہ کو بھی پیش کرتے ہیں۔ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب یہ دونوں (حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) اپنی تقرری کے بعد یمن روانہ ہونے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہدایات دیتے ہوئے فرمایا۔ لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کرو اور انہیں مشکل میں نہ ڈالو۔ ان کے ساتھ خوش دلی سے کلام کرو اور ایسا رویہ اختیار نہ کرو جو انہیں ناگوار گزرے اور انہیں تم سے دور کرنے کا باعث ہو۔ ایک دن حضرت معاذؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے ملنے آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص کو لوگوں نے رسی سے جکڑا ہوا ہے۔ جب حضرت معاذؓ نے اس شخص کے بارہ میں

دریافت کیا تو انہیں بتایا گیا کہ یہ ایک یہودی ہے جو مسلمان ہو گیا تھا لیکن اب یہ مرتد ہو کر پھر اپنے مذہب کی طرف واپس لوٹ گیا ہے۔ راوی نے مزید بیان کیا گزشتہ دو تین ماہ سے مسلمان اس شخص کے ساتھ بحث کر کے اسے سمجھا رہے ہیں کہ وہ پھر مسلمان ہو جائے لیکن اس پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ اس پر حضرت معاذؓ نے کہا۔ میں سواری سے اس وقت تک نہیں اتروں گا جب تک اس شخص کو قتل نہ کر دیا جائے۔ نیز یہ بھی کہا کہ یہ خدا اور اس کے رسول کا فیصلہ ہے۔ حضرت معاذؓ کے قول کا آخری حصہ ان کی ذاتی رائے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق خدا اور رسول کا جو منشاء سمجھا اسے بیان کر دیا۔ قانون کی نگاہ میں ایسی ذاتی آراء اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتیں تاوقتیکہ واضح حقائق کی روشنی میں باقاعدہ حوالہ جات کی رو سے ان کا باوزن ہونا ثابت نہ کر دیا جائے۔ (اسی باب میں آگے چل کر اس اصول کو قدرے وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے)۔

آیئے اب ہم اس حدیث کے صحیح ہونے یا نہ ہونے کا جائزہ لیتے ہیں۔ حضرت معاذؓ کا مذکورہ بالا قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کے سراسر خلاف ہے کہ لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کرو اور ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کرو جو انہیں منحرف کرنے کا موجب بنے۔ ایک ایسے بنیادی مسئلہ کے بارہ میں جس سے انسانی حقوق براہِ راست طریق پر متاثر ہو رہے ہوں معاذؓ کے قول کی اصابت کو جانچے بغیر اس بارہ میں صرف ایک حدیث پر انحصار کرنا اپنے اندر کوئی معقولیت نہیں رکھتا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک اس حدیث، اس کے سلسلہ اسماء الرجال اور اس کے مستند ہونے کا تعلق ہے اس بارہ میں بہت سے شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ جب شکوک وشبہات کی وجہ سے کسی حدیث کے بارہ میں اختلاف پایا جاتا ہو تو اصولاً ایسی حدیث کو بکلّی مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ احادیث ظہورِ اسلام کے تین چار صدیوں بعد جمع اور مرتّب کی گئی تھیں۔ اندریں صورت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یادداشت میں غلطی کے امکان کو کلّی طور پر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ ایک حدیث کی رو سے اس یہودی کو معاذؓ کی زیر ہدایت قتل کیا گیا۔ ایک اور حدیث کی رو سے معاذؓ نے خود اسے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ بنیادی اہمیت کے ایک واقعہ میں جب

ایسے بنیادی اختلافات پیدا ہو جائیں تو اس قسم کی احادیث کو مستند احادیث کے طور پر کیسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ لوگ کسی کی کہی ہوئی بات کو تو بھول سکتے ہیں لیکن اگر وہ کسی واقعہ کے عینی شاہد ہوں تو انہیں کم از کم اتنا تو یاد رہے گا کہ بالآخر اس مرتد کا انجام کیا ہوا اور یہ کہ اس کے ساتھ کیا گزری۔

کسی حدیث کی صحت کو جانچنے کے مسلّمہ اصول اب ہم اس حدیث کی طرف آتے ہیں جسے سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے کیونکہ اس مکتبِ فکر کی طرف سے جو ارتداد کی پاداش کے طور پر سزائے قتل کا حامی ہے اسے معتبر گردان کر اس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس مکتبِ فکر کے استدلال کا تمام تر انحصار اس حدیث پر ہوا ہے۔ خاص اس حدیث پر بحث کو عمداً اس لئے مؤخر کیا گیا ہے تا کہ مسئلہ زیر بحث پر سلسلہ وار دیگر مواد کے زیر غور آنے کی ترتیب میں فرق نہ آئے اور آخر میں خاص اس حدیث کے تمام پہلوؤں پر تدبر اور تفکر کا مالۂ و ماعلیہ کے رنگ میں تحقیق و تدقیق کا حق ادا ہو سکے لیکن اس حدیث کے تفصیلی جائزہ سے پہلے اس بارہ میں بعض اصولوں کے انطباق سے متعلق بعض پہلوؤں کی وضاحت ضروری ہے۔ یہ وہ مسلّمہ اصول ہیں جو ہر زمانہ کے مسلمان علماء کے نزدیک قابلِ قبول رہے ہیں اور ان اصولوں کو تسلیم کرنے سے کبھی کسی عالم نے انکار نہیں کیا۔ یہ اصول قرآن مجید اور کسی حدیث کے مابین یا خود متعدد حدیثوں کے مابین پائے جانے والے اختلافات کو حل کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مختصراً وہ اصول یہ ہیں:-

(۱) خدا تعالیٰ کا کلام سب سے فائق اور سب سے مقدم ہے۔

(۲) اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کا درجہ ہے جسے بالعموم سنّت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۳) اس کے بعد درجہ ہے احادیث کا جو روایت در روایت ہم تک پہنچی ہیں اور روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فرمودہ الفاظ پر مشتمل ہیں۔

(ا) اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فرمودہ الفاظ کا مستند ہونا ہر لحاظ سے مسلّم ہو اور اس کے مسلّم ہونے پر کسی قسم کے اعتراض کی سرے سے کوئی گنجائش نہ ہو تو ایسے الفاظ فی الاصل وہ الفاظ ہیں جو خدائے قادر نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کہلوائے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور قرآن مجید میں کوئی تناقض نہ ہو تو ایسی حدیث مستند تسلیم کی جاتی ہے۔

(ب) اس مسلمہ حقیقت کے بارہ میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ جب کبھی کوئی نام نہاد حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جائے لیکن وہ قرآن مجید کے واضح حکم سے ٹکراتی ہو یعنی اس سے متناقض ہو تو ایسی حدیث کو جھوٹی حدیث قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا ہے اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر مشتمل تسلیم نہیں کیا جاتا۔

(ج) اگر ایسی کسی حدیث سے قرآن مجید کے کسی حکم کی واضح خلاف ورزی نہ ہوتی ہو اور دونوں میں مطابقت کی گنجائش موجود ہو تو بہترین طریق یہی ہے کہ ایسی حدیث کو مسترد کرنے سے پہلے دونوں میں مطابقت کی راہ تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔

(د) ایک ایسی حدیث کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوتی ہو قرآن کے ساتھ مطابقت تلاش کرنے میں اس امر کو ہر آن ذہن میں مستحضر رکھنا ضروری ہے کہ ایسی حدیث کی خاطر قرآن مجید کی واضح تعلیمات کے بارہ میں کسی مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے بلکہ مخلصانہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ حدیث کی ایسی تشریح کی جائے جو تعلیماتِ قرآنی کے عین مطابق ہو۔ پس جب بھی کبھی کسی حدیث کے بارہ میں شبہ ہو تو اسے قرآن مجید کی کسوٹی پر کسنا اور اس کے مطابق اسے پرکھنا ضروری ہے۔

(ر) اگر قرآن مجید اور حدیث میں کوئی تناقض نہ ہو تو اس امر کی تعیین کہ معتبر ہونے کے لحاظ سے یہ کس درجہ کی حدیث ہے اس کے ماخذوں اور راویوں کے سلسلۂ اسماء الرجال کی صحت و اصابت کے مطابق لیا جائے گا۔

(س) ایسی حدیث کا دوسری مستند اور بہت وسیع پیمانے پر معتبر تسلیم کی جانیوالی احادیث سے بھی موازنہ کیا جائے گا تا کہ یہ تسلی ہو سکے کہ یہ حدیث دوسری حدیثوں سے متناقض نہیں ہے۔

(ص) اس ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ کسی حدیث کے مستند ہونے کی تحقیق و تفتیش کا ایک قابلِ اعتماد طریقہ یہ بھی ہے کہ خود اس حدیث کی داخلی شہادت کا بہت تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا جائے۔

اگر حدیث کے مندرجات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم المرتبت تشخص سے ٹکراتے ہیں جو آنحضورؐ کے طرزِ عمل سے ابھرتا ہے اور جس کی آنحضورؐ کی حیات طیبہ کے ایک ایک لمحہ سے تائید و توثیق ہو رہی ہے تو ایسی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط طور پر منسوب ہونے کی وجہ سے یا منطق کے اصولوں اور عقلِ عمومی کے برخلاف ہونے کی بناء پر مسترد کر دی جائے گی۔

عکرمہ سے مروی زیر بحث حدیث مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں اب ہم اس زیر بحث حدیث کا جائزہ لیتے ہیں، حدیث یوں بیان کی جاتی ہے:-

عَنْ عِكْرِمَةَ، قَالَ: أُتِيَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، بِزَنَادِقَةٍ فَأَحْرَقَهُمْ، فَبَلَغَ ذٰلِكَ ابْنَ عَبَّاسٍ، فَقَالَ: لَوْ كُنْتُ أَنَا لَمْ أُحْرِقْهُمْ، لِنَهْيِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تُعَذِّبُوا بِعَذَابِ اللّٰهِ وَلَقَتَلْتُهُمْ، لِقَوْلِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ [۱]

"عکرمہ سے مروی ہے کہ بعض زندیق حضرت علیؓ کے سامنے پیش کئے گئے تو آپ نے انہیں زندہ جلا دیا۔ حضرت ابن عباسؓ تک یہ بات پہنچی تو آپ نے فرمایا اگر میں ہوتا تو میں انہیں ہرگز نہ جلاتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ اس مناہی کے مطابق کہ اللہ کے عذاب سے (کسی کو) عذاب نہ دو بلکہ میں انہیں قتل کر دیتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے مطابق کہ جو اپنا دین بدل دے اسے قتل کر دو۔"

یہ حدیث الفاظ کی کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ترمذی، ابوداؤد، النسائی، اور ابنِ ماجہ کے مجموعہ ہائے احادیث میں بھی ملتی ہے۔

قرآن مجید سے تناقض ایک فہیم اور سمجھدار انسان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ اس حدیث اور قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات میں کوئی مطابقت معلوم کر سکے:-

سورۃ البقرۃ : آیات ۵۷، ۱۰۰، ۱۰۹، ۲۱۸، ۲۵۷، ۲۷۳

سورۃ آلِ عمران : آیات ۲۱، ۷۳، ۸۶ تا ۹۲، ۱۴۵

۱؎ جامع صحیح بخاری کتاب استتابة المرتدین و المعاندین باب حکم المرتد و المرتدۃ

سورۃ النساء	: آیات ۸۳، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۶
سورۃ المائدۃ	: آیات ۵۵، ۶۲، ۹۱ تا ۹۳، ۹۹، ۱۰۰
سورۃ الانعام	: آیات ۶۷، ۱۰۵ تا ۱۰۸، ۱۲۶
سورۃ الاعراف	: آیات ۱۲۴ تا ۱۲۹
سورۃ التوبہ	: آیات ۱۱ تا ۱۴
سورۃ یونس	: آیات ۱۰۰ تا ۱۰۹
سورۃ الرعد	: آیت ۴۱
سورۃ الحجر	: آیت ۱۰
سورۃ النحل	: آیات ۸۳، ۱۰۵ تا ۱۰۷، ۱۲۶
سورۃ بنی اسرائیل	: آیت ۵۵
سورۃ الکہف	: آیت ۳۰
سورۃ مریم	: آیت ۴۷
سورۃ طٰہٰ	: آیات ۲۷ تا ۴۷
سورۃ الحج	: آیت ۴۰
سورۃ النّور	: آیت ۵۵
سورۃ الفرقان	: آیات ۴۲ تا ۴۴
سورۃ الشعراء	: آیت ۱۱۷
سورۃ القصص	: آیت ۵۷
سورۃ العنکبوت	: آیت ۱۹
سورۃ الزمر	: آیات ۳۰ تا ۴۲
سورۃ المؤمن	: آیات ۲۶، ۲۷
سورۃ الشوریٰ	: آیات ۷، ۸، ۴۸، ۴۹

سورۃ محمد : آیت ۲۶

سورۃ ق : آیت ۴۶

سورۃ الذّٰریٰت : آیت ۵۷

سورۃ التغابن : آیات ۹ تا ۱۳

سورۃ التحریم : آیت ۷

سورۃ الغاشیۃ : آیات ۲۲، ۲۳

مندرجہ بالا آیات میں سے بعض آیات حوالہ کے طور پر گزشتہ صفحات میں پہلے بھی پیش کی جاچکی ہیں مزید وضاحت کی خاطر بعض آیات اب ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔ (آلِ عمران: ۸۶ تا ۹۲)

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرنا چاہے تو (وہ یاد رکھے) وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ جو لوگ ایمان لانے کے بعد (پھر) منکر ہو گئے ہوں اور شہادت دے چکے ہوں کہ (یہ) رسول سچا ہے اور ان کے پاس دلائل بھی آچکے ہوں انہیں اللہ کس طرح ہدایت پر

لائے اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب ہی کی لعنت ہو۔ وہ اس میں رہیں گے۔ نہ تو ان پر سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں ڈھیل دی جائے گی، سوائے ان لوگوں کے کہ جو اس کے بعد توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں اور اللہ یقیناً بہت سننے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لانے کے بعد منکر ہو گئے ہوں اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے ہوں ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا بھی، جسے وہ فدیہ کے طور پر پیش کرے، ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب (مقدّر) ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

ان آیاتِ کریمہ سے بھی یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کو اس کے ارتداد کی بناء پر کوئی سزا نہیں دے سکتا۔ ''وہ اس میں ہی رہتے چلے جائیں گے'' کے الفاظ سے واضح طور پر اگلے جہان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی یہ کہ اسلام سے ارتداد اختیار کرنے والے کو اگلے جہان میں سزا ملے گی نہ کہ اس جہان میں۔ خیالی گھوڑے دوڑا کر کتنا ہی کھینچ تان سے کام لیا جائے کوئی سمجھدار انسان ''مرتد پر اللہ کی لعنت'' کے ذکر سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرسکتا کہ اسے اس امر کی اجازت مل گئی ہے کہ جو بھی اس کی اپنی نگاہ میں مرتد ہو اسے وہ قتل کردے۔ اس موضوع سے متعلق جملہ دیگر آیات کی طرح ان آیات میں بھی مرتد کو قتل کی سزا دینے کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر مرتد کو قتل کی سزا دینا یا بالفاظِ دیگر دوسروں سے اسے قتل کی سزا دلوانا مقصود ہوتا تو معیّن الفاظ میں اس سزا کا اسی طرح ذکر کیا جاتا جس طرح تمام دوسری حدود کے ضمن میں قرآن میں واضح طور پر معین سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے قرآن مجید نے تو ایسے مرتدوں کے لئے توبہ واستغفار اور ان کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے معافی کے امکان کا ذکر کیا ہے۔ یعنی اگر ایسے مرتد توبہ کرکے پھر اسلام قبول کرلیں تو خدا تعالیٰ انہیں معاف کردے گا۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ کوئی مرتد جسے سزا کے طور پر قتل کردیا گیا ہو اس دنیا میں توبہ کرکے تلافیٔ مافات کس طرح کرسکتا ہے؟ ظاہر ہے جسے قتل کردیا گیا ہو اس کے لئے تو یہ ممکن ہی نہیں رہتا کہ وہ توبہ واستغفار کے ذریعہ تلافی کرسکے۔ تلافی کے امکان کا ذکر صاف

بتا رہا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے ہی نہیں۔

ارتداد کے لئے سزائے قتل کے حامی ذرا اس امر پر بھی غور کریں کہ اگر ان کی پیش کردہ حدیث کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس حدیث اور قرآن میں جو واضح تضاد پایا جاتا ہے اسے وہ کس طرح دور کریں گے؟ وہ خاص طور پر مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں اپنے مؤقف پر دوبارہ غور کریں اور خالی الذہن ہو کر پوری غیر جانبداری سے ان آیات کے اصل مفہوم کا پھر سے جائزہ لیں۔

پھر اسی پر بس نہیں قرآن مجید نے اس مسئلہ پر بار بار روشنی ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر ایسی مشکوک حدیث کو قرآن مجید کے درج ذیل واضح اور غیر مبہم احکام سے زیادہ باوزن کیسے قرار دیا جا سکتا ہے:-

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (یونس: ۱۰۰، ۱۰۱)

اور اگر اللہ (ہدایت کے معاملہ میں) اپنی ہی مشیت کو نافذ کرتا تو جس قدر لوگ زمین پر موجود ہیں وہ سب کے سب ایمان لے آتے۔ (پس جب خدا بھی مجبور نہیں کرتا) تو کیا تُو لوگوں کو اتنا مجبور کرے گا کہ وہ مومن بن جائیں۔ اور اللہ کے دیئے ہوئے اِذن کے سوا کسی شخص کے اختیار میں نہیں کہ وہ ایمان لے آئے۔ اور وہ اپنا غضب ان لوگوں پر نازل کرتا ہے جو عقل رکھتے ہوئے اس سے کام نہیں لیتے۔

جب خدا تعالیٰ خود لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کرتا تو ہم کون ہیں کہ ہم تلوار ہاتھ میں لے کر لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کریں یا مودودی صاحب کے تیار کردہ چوہے دان لگا کر لوگوں کو پھانسنے کی کوشش کریں اور جو لوگ ان میں آ پھنسیں انہیں ان میں سے نکلنے نہ دیں۔ مرتد کے لئے سزائے قتل کے حامیوں کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ سینکڑوں سال بعد جمع کی گئی احادیث میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب بعض احادیث کو بھی جو واضح اور کھلے طور پر قرآن مجید کی تعلیم کی تردید کر رہی ہوتی ہیں لفظاً لفظاً درست تسلیم کر لیتے ہیں۔

سنت نبوی کی صریح خلاف ورزی ہمارے قانون کا دوسرا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل اور اسوۂ حسنہ ہے جسے سنّت رسولؐ کا نام دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ہم اس دعوے کا کھوکھلا پن کہ ارتداد کے جرم کی پاداش کے طور پر بعض کو قتل کی سزا دی گئی تھی، پہلے ہی واضح کر چکے ہیں۔

دعوٰی نبوت کے بعد قریش کے ظالمانہ ردّعمل کے بالمقابل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا موقف کیا تھا؟ یہی تو تھا کہ آپؐ کو خدائی پیغام پر ایمان لانے، پُرامن طور پر اس کا اعلان کرنے اور دوسروں تک اُسے پہنچانے دیا جائے اور اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ کھڑی کی جائے۔ مکہ والوں نے آپؐ کو اس امر کی اجازت نہ دی۔ جن لوگوں نے آپؐ پر ایمان لانا شروع کیا انہیں انہوں نے سزا کا مستوجب گردانا اور پھر سزا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جہاں تک مکہ والوں کا تعلق تھا ان کے نزدیک جو لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان لے آئے تھے وہ بت پرستی کے اعتقاد سے ارتداد اختیار کر کے مرتد ہو جاتے تھے اسی لئے وہ انہیں سزا کا مستوجب گردانتے تھے۔ اس کے بالمقابل اگر دیکھا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام زندگی بنیادی انسانی حقوق کی حمایت جاری رکھی۔ آپؐ کا اوّل دن سے یہی موقف تھا اور تا دمِ آخر یہی موقف رہا کہ ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ وہ اپنی پسند کا مذہب اختیار کر سکے اور کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہ کرے۔ گویا جہاں تک مذہب کی تبدیلی کا تعلق ہے یہ اختیار کلیۃً ہر شخص کو خود حاصل ہونا چاہیے کہ وہ جس مذہب کو ترک کرنا چاہے اسے ترک کر سکے اور جس مذہب کو اختیار کرنا چاہے اسے اختیار کر سکے۔ اس اختیار کو استعمال کرنے میں کسی دوسرے کی مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کا یہی اصل اور حقیقی مفہوم ہے اور یہی وہ جہاد ہے جسے تاریخ مذاہب کی رو سے تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنے مخالفین کے خلاف زندگی بھر جاری رکھا۔ قرآن مجید نے انبیائے ماسبق کے حوالے سے اس جہاد کا بار بار ذکر کیا ہے (حوالہ کے لئے دیکھیں سورۃ البقرۃ آیت ۵، سورۃ الانعام آیت ۱۱۳، سورۃ الانبیاء آیت ۴۲، سورۃ الفرقان آیت ۳۲، سورۃ یٰسین آیات ۸، ۳۱، سورۃ الزخرف آیت ۸) پھر قرآن کریم نے مختلف انبیاء کا نام لے کر بھی ان کے اس جہاد پر

روشنی ڈالی ہے۔ان انبیائے کرام میں سے بعض کے اسماءاوران کے جہاد کے ذکر پر مشتمل آیات کے حوالے یہ ہیں:-

حضرت ابراہیمؑ (سورۃ الانعام آیات ۷۵ تا ۷۹، سورۃ مریم آیت ۴۷، سورۃ الانبیاء آیات ۵۳۔۵۹۔۶۱۔۶۹۔۷۰،سورۃالصّٰفّٰت آیات ۸۹ تا۹۱،۹۸)

حضرت الیاسؑ (سورۃالصّٰفّٰت آیات۱۲۶ تا۱۲۷)

حضرت لوطؑ (سورۃالشعراءآیات ۱۶۶ تا ۱۶۸،سورۃالنمل آیت ۵۷،سورۃالحجر آیت ۷۱)

حضرت نوحؑ (سورۃ الاعراف آیت ۶۰، سورۃ یونس آیت ۷۲، سورۃ ہود آیات ۲۶، ۲۷، سورۃالشعراءآیت ۱۱۷،سورۃنوح ۲ تا ۲۱)

حضرت موسیٰؑ (سورۃالاعراف آیات ۱۰۵،۱۰۶۔ ۱۲۴ تا ۱۲۷،سورۃ یونس آیات ۷۶ تا ۷۹، سورۃ بنی اسرائیل آیات ۱۰۲، ۱۰۳،سورۃطٰہٰ آیات ۴۴، ۴۵۔ ۵۰ تا ۵۳۔سورۃالشعراءآیات ۱۹ تا ۳۴)

حضرت عیسٰیؑ (سورۃ آلِ عمران آیات ۵۲ تا ۵۶،سورۃ المائدہ آیت ۱۸،سورۃ مریم آیت ۳۷، سورۃالزخرف آیت ۶۵)

ان جملہ انبیاءعلیہم السلام کی تمام تر جدو جہد کس خاطر تھی؟ دراصل انبیاءعلیہم السلام کے مخالفین کا ایک ادّعا ہمیشہ یہ ہوا کرتا تھا کہ انبیاءکو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کے ساتھیوں اور دیگر ہمعصر لوگوں کو مذہب تبدیل کرنے کی ترغیب دلائیں۔ وہ اپنے مخالفین کے اس سراسر ناروا اور ناواجب ادّعا کے خلاف جدوجہد کرنے کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کا یہ حق ہے کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کرے۔اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے مذہب کی طرف سے محبت کا پیغام پُرامن طریق پر پھیلانے کی کوشش کرتا ہے توکسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ایسی پُرامن مساعی میں طاقت کے بل پر زبردستی مزاحم ہواوران مساعی کے سلسلہ کومنقطع کرنے پر تُل جائے۔انبیاءعلیہم السلام کے اس انتہائی معقول اور انسانیت دوستی کے آئینہ دار موقف پر ان کے مخالفین کا ردّعمل ہمیشہ ہی بہت نامعقول اور ہٹ دھرمی پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ وہ انبیاءعلیہم السلام کے انتہائی معقول اور سرتا پا جائز

موقف کو مسترد کر دیا کرتے تھے اور اپنے اس انتہائی نامعقول موقف پر اڑے رہتے تھے کہ انہیں (یعنی انبیاء کو) ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں سے ان کا مذہب تبدیل کرائیں۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر انبیاء اپنے طرزِ عمل اور تبلیغی جدوجہد سے باز نہ آئے تو پھر انہیں خود مرتد ہونے اور دوسروں کو مرتد کرنے کی سزا بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہیے اور وہ سزا انبیاء کے مخالفین کے نزدیک موت یا جلاوطنی کے سوا اور کوئی نہ تھی۔ اپنے مخالفین کے اس ادّعائے باطل کے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عظیم الشان جدوجہد کی وہ جملہ انبیائے ماسبق کے طرزِ عمل اور جدوجہد سے پوری پوری مطابقت رکھتی تھی۔ ایک معقول اور سمجھدار انسان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مقدس مشن کا جسے آپؐ نے زندگی بھر جاری رکھا کیسے انکار کرسکتا ہے اور مذکورہ بالا بنیادی اصول کے بارہ میں آپؐ کے نہایت مضبوط موقف کو کیسے چیلنج کرسکتا ہے۔ زیرِ بحث حدیث، قرآنِ مجید، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور متعدد مستند احادیث سے اس درجہ متناقض ہے کہ اسے جھٹلانے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ اس حدیث کا غیر معتبر ہونا اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ اس بارہ میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ماخذوں اور راویوں کے قابل اعتماد ہونے کے معیار جس حدیث کے درست ہونے سے انکار کیا گیا ہے وہ بظاہر تو ائمہ احادیث بخاری، ترمذی، ابوداؤد، النسائی اور ابن ماجہ کے نزدیک مستند شمار ہونے کے قابل نظر آتی ہے کیونکہ یہ احادیث کے چھ مسلمہ مجموعوں میں سے پانچ مجموعوں میں شامل ہے لیکن اس کے مستند ہونے کا معاملہ اس سے آگے نہیں بڑھ پاتا بلکہ یہیں تک محدود ہوکر رہ جاتا ہے۔

کسی حدیث کے مستند قرار پانے کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ وہ احادیث کے کسی مستند مجموعے میں شامل ہے۔ بعض اور بھی پہلے سے طے شدہ معیار ہیں جن پر کسی حدیث کا پورا اترنا اس کے مستند ہونے کے لئے ضروری ہے۔ ان میں سے سب سے اہم معیار یہ ہے کہ اسماء الرجال میں شامل مختلف مراحل کے درمیانی راویوں کی شہرت، ان کے چال چلن اور طرزِ عمل کا گہری نظر سے تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ ایسے علمائے احادیث ہوگزرے ہیں جنہوں نے مذکورہ بالا امر کے مطالعہ اور تحقیق

میں اپنی عمریں کھپا دیں۔ ان علماء کی تحقیق میں انتہائی عرق ریزی کی بدولت ہی آج ہمارے لئے یہ امر بالکل ممکن ہے کہ ہم کسی بھی حدیث کے اسماء الرجال میں سے ہر راوی کی حیثیت اور مرتبہ کا تفصیلی جائزہ لے سکیں۔

آیئے ہم اب زیر بحث حدیث کے متعلق اس امر کا جائزہ لیں کہ یہ حدیث مقررہ معیاروں پر کس حد تک پورا اترتی ہے۔ سو یہ حدیث آحاد اور غریب کی اصطلاح کے تحت آنیوالی احادیث میں سے ایک ہے (یعنی یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کے راویوں کا صرف ایک ہی سلسلہ ہے اور جو صرف ایک ہی ماخذ پر جا کر مختتم ہوتا ہے)۔ احادیث کے جن پانچ مجموعوں میں یہ حدیث شامل ہے ان پانچوں نے راویوں کے سلسلہ کو صرف ایک ہی ماخذ تک پہنچا کر اسے اس سے ہی ماخوذ قرار دیا ہے اور وہ ہے عکرمہ۔ لکھنؤ کے مولوی عبدالحی مرحوم نے خاص طور پر عکرمہ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ چونکہ محض بخاری نے اس کی روایت کردہ حدیث کو اپنے مجموعۂ احادیث میں شامل کر لیا تھا اس لئے دوسرے ائمہ حدیث نے خود براہ راست تحقیق کئے بغیر ان کی پیروی پر ہی اکتفا کیا اور عکرمہ کی حدیث کو اپنے مجموعوں میں شامل کر لیا۔

یہ صحیح ہے کہ ایک حدیث راویوں کے صرف ایک ہی سلسلہ سے مروی ہونے کے باوجود بھی مستند اور قابل اعتبار ہو سکتی ہے تاہم اس میں بھی کلام نہیں ہے کہ ایسی حدیث کو اس درجہ قابلِ اعتماد قرار نہیں دیا جا سکتا جتنا قابل اعتماد ان احادیث کو قرار دیا جاتا ہے جو راویوں کے ایک سے زیادہ قابل اعتبار سلسلوں سے مروی ہوں۔ راویوں کے صرف ایک ہی سلسلہ سے مروی احادیث کو قانون کا درجہ رکھنے والے ایسے فرمانوں پر جو حقوق، ذمہ داریوں اور جرم و سزا سے متعلق ہوں اثر انداز نہیں ہونے دیا جاتا۔ جہاں تک حدود پر اثر انداز ہونے کا تعلق ہے سو اس بارہ میں اور بھی زیادہ احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''حدود'' کا لفظ ایک اصطلاح ہے جو محض ان سزاؤں کے لئے بولی جاتی ہے جو معین طور پر قرآن مجید میں بیان کر دی گئی ہیں۔ ارتداد کے لئے موت کی سزا کے حامی اپنے نظریہ کو قرآنی احکام پر مبنی قرار دے کر اسے حدود کے تحت آنے والی سزاؤں کا ہم پلّہ قرار دیتے ہیں۔ ہم ان کے اس دعوے کو پہلے ہی سرتاپا غلط ثابت کر چکے ہیں۔

عکرمہ زیر بحث حدیث کا اصل راوی کس حیثیت کا مالک تھا؟ حدیث کی صحت جانچنے کے سلسلہ میں اس امر کا جاننا بھی از بس ضروری ہے۔ عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کا ایک غلام تھا اور شاگرد بھی۔ جہاں تک اس کے شاگرد ہونے کا تعلق ہے وہ ایک ایسا شاگرد تھا جس کا پڑھائی سے دل اچاٹ تھا اور بہت پیچھے رہ جانے والے انتہائی پھسڈّی قسم کے شاگردوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اپنی اس حیثیت کی اس نے یہ کہہ کر خود تصدیق کی ہے کہ حصول علم کے بارہ میں اس کی عدم دلچسپی اور بلا اجازت مسلسل غیر حاضری پر حضرت ابن عباسؓ بہت برافروختہ ہو جایا کرتے تھے اور وہ اسے اپنے درس میں حاضر رہنے پر مجبور کرنے کے لئے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیا کرتے تھے۔

مزید برآں عکرمہ اسلام کے خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مخالف تھا اور خوارج کی طرف میلان رکھتا تھا۔ خوارج کی طرف اس کا میلان اس زمانہ میں بہت بڑھ گیا تھا جب حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے درمیان اختلافات ابھرنے شروع ہوئے۔ جہاں تک عباسی خلفاء کا تعلق ہے وہ سیاسی خدشات کے پیشِ نظر اُن تمام لوگوں کے شدید مخالف تھے جو حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کی نسل کے کسی نہ کسی رنگ میں حامی یا ساتھی شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ جب عباسیوں کا دور شروع ہوا تو عکرمہ کو حضرت علیؓ سے اس کی مخاصمت اور خوارج کے ساتھ اس کی راہ و رسم کے باعث ایک بالغ نظر عالم کی حیثیت سے بہت شہرت اور عزت و عظمت حاصل ہوئی۔

ذہبی کا بیان ہے کہ چونکہ عکرمہ خوارج میں سے تھا اس لئے اُس کی بیان کردہ احادیث مشکوک اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ارتداد کی سزا کے بارہ میں سند کا درجہ رکھنے والے امام علی بن المدائینی کی بھی عکرمہ کے بارہ میں یہی رائے ہے۔ یحیٰ بن بکر کہا کرتے تھے کہ مصر، الجزائر اور مراکش کے خوارج عکرمہ کے مؤید اور پکے ساتھی تھے۔

یہ بات بالعموم دیکھنے میں آئی ہے کہ ارتداد کے لئے سزائے موت سے متعلق احادیث بصرہ، کوفہ اور یمن سے چلی ہیں۔ حجاز (یعنی مکہ اور مدینہ) کے لوگ ایسی احادیث سے بالکل بے خبر اور لاعلم تھے۔ اس حقیقت سے آنکھیں موند لینا ممکن نہیں ہے کہ عکرمہ کی بیان کردہ زیرِ بحث حدیث ایک عراقی حدیث کے طور پر مشہور ہے۔ مشہور و معروف مکی امام طوس بن قیسان کہا کرتے تھے کہ

عراقی حدیثیں بالعموم مشکوک ہوتی ہیں۔

ایک بہت بڑے عالمِ دین یحییٰ بن سعید الانصاری نے عکرمہ کی ناقابلِ اعتبار حیثیت کی بناء پر اس کی شدید مذمت کی ہے۔ انہوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ وہ ایک کذاب تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے نزدیک پرلے درجہ کا جھوٹا اور بے پر کی اڑانے والا تھا۔

عبداللہ بن الحارث نے ایک بہت دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس کے وہ عینی شاہد تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ علی بن عبداللہ بن عباس سے ملنے ان کے گھر گئے۔ وہ یہ دیکھ کر سخت حیران ہوئے کہ ان کے گھر کے دروازے کے باہر کسی نے عکرمہ کو ایک لمبے کھمبے کے ساتھ جکڑ کر باندھ رکھا ہے۔ انہوں نے اس ظالمانہ حرکت پر اپنے دلی صدمہ کا اظہار کرتے ہوئے علی بن عبداللہ بن عباس سے کہا کیا تمہارا دل خوفِ خدا سے خالی ہے؟ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ عکرمہ اپنی پارسائی کی شہرت اور عزت واحترام کی وجہ سے ایسے ظالمانہ اور ذلت آمیز سلوک کا مستحق نہیں ہے چہ جائیکہ اپنے مرحوم آقا کے فرزند کے ہاتھوں ہی اسے ایسی ذلت اٹھانی پڑے۔ اپنے اس سلوک کو درست ثابت کرنے کے لئے علی بن عبداللہ بن عباس نے جواباً کہا عکرمہ اس قدر گستاخ واقع ہوا ہے کہ اسے میرے مرحوم والد ابن عباسؓ کی طرف سراسر جھوٹی اور من گھڑت باتیں منسوب کرنے میں بھی کوئی عار نہیں ہے۔ عکرمہ کے چال چلن اور اوضاع واطوار کے متعلق علی بن عبداللہ بن عباس سے بڑھ کر اور کس کی گواہی معتبر ہو سکتی ہے؟ اس بارہ میں تعجب بے محل ہوگا کہ احادیث جمع کرنے والوں میں اوّلیّت کا شرف رکھنے والے بزرگ، فقہ کے نامور امام حضرت امام مالک بن انس (۹۵ تا ۱۷۹ ہجری) جنہیں پوری اسلامی دنیا میں عزت واحترام اور تعظیم وتکریم کا بہت بلند مقام حاصل ہے فرمایا کرتے تھے عکرمہ کی بیان کردہ احادیث سراسر غیر معتبر ہیں۔

درج ذیل نامور علماء نے علی الاعلان کہا ہے کہ عکرمہ میں مبالغہ آرائی کا میلان کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا (۱) امام یحییٰ بن سعید الانصاری (۲) علی بن عبداللہ بن عباس (۳) عطا بن ابی ربیعہ۔

سو یہ ہے وہ شخص جس سے ہمارا واسطہ آن پڑا ہے اور جس کی اکیلی گواہی اور سند کے ساتھ مذہب تبدیل کرنے والوں کی زندگی اور موت کا معاملہ اٹکا ہوا ہے اور تا قیامت اٹکا رہے گا۔

ابن عباسؓ حدیثیں روایت کرنے والوں کے سلسلہ میں جب بھی سرفہرست حضرت ابن عباسؓ کا نام آتا ہے تو مسلمان علماء کی بھاری اکثریت مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ جھوٹی حدیثیں گھڑنے والوں کا یہ عام وطیرہ تھا کہ وہ حضرت ابن عباسؓ کے نام اوران کی شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راویوں کے اپنے من گھڑت سلسلہ کوان سے جاملاتے تھے تاکہ ان کی وضع کردہ حدیث مستند شمار ہو سکے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان تمام حدیثوں کو جو حضرت ابن عباسؓ کے نام سے شروع ہوتی ہوں گہری نظر سے جانچا اور پرکھا جائے۔

مزید برآں اگر کسی راوی نے حضرت ابن عباسؓ کی کہی ہوئی بات کو آگے پوری دیانتداری سے بیان کیا ہو تو بھی اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت ابن عباسؓ نے جو کچھ کہا آگے عکرمہ نے بوجہ انسان ہونے کے اس کا مطلب سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ یہ بات درج ذیل مثال سے بخوبی واضح ہوسکتی ہے:-

فَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ...قَدۡ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ المَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبَعۡضِ بُكَاءِ أَهۡلِهِ عَلَيۡه فَقَالَ ابۡنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا: فَلَمَّا مَاتَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ، ذَكَرۡتُ ذٰلِكَ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهَا، فَقَالَتۡ: رَحِمَ اللّٰهُ عُمَرَ، وَاللّٰهِ مَا حَدَّثَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللّٰهَ لَيُعَذِّبُ المُؤۡمِنَ بِبُكَاءِ أَهۡلِهِ عَلَيۡهِ، وَلَكِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ لَيَزِيدُ الكَافِرَ عَذَابًا بِبُكَاءِ أَهۡلِهِ عَلَيۡهِ، وَقَالَتۡ: حَسۡبُكُمُ القُرۡآنُ: وَلاَ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزۡرَ أُخۡرَىٰ[1]

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مرے ہوئے شخص پر رونا پیٹنا اس وفات یافتہ شخص کو عذاب میں مبتلا کرنے کا موجب ثابت ہوتا ہے۔ ابن عباس مزید کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ وفات پا گئے تو میں نے یہ حدیث حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کی۔ انہوں نے کہا اللہ عمرؓ کو معاف

[1] بخاری کتاب الجنائز

کرے۔ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ہرگز نہیں کہی۔ آپؐ نے صرف یہ فرمایا تھا کہ اگر کسی کافر کے ورثاء اس کی نعش پر روتے پیٹتے ہیں تو ان کے اس فعل سے اس کی سزا میں اضافہ ہو جاتا ہے نیز حضرت عائشہؓ نے دلیل کے طور پر یہ بھی کہا کہ قرآن کا یہ فرمان ہمارے لئے کافی ہے کہ ''کوئی بوجھ اٹھانے والی ہستی دوسری ہستی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔''

اگر حضرت عمرؓ کے مرتبہ اور مقام کا شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب سمجھنے میں غلطی کر سکتا ہے (ایسا خواہ شاذ کے طور پر ہی ہوا ہو) تو حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا مطلب سمجھنے میں معمولی راویوں سے غلطی سرزد ہونے کا امکان کس قدر زیادہ ہو سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو آگے پہنچانے میں غلطی کے ایسے وسیع امکانات کی موجودگی میں ایک سمجھدار انسان صرف اس ایک حدیث کی شہادت پر کیسے انحصار کر سکتا ہے اور اس سے زندگی اور موت کے معاملات اور بنیادی انسانی حقوق سے متعلق دور رس اہمیت کے حامل نتائج کیسے اخذ کر سکتا ہے۔ مزید برآں یہ بھی احتمال ہے کہ عکرمہ نے یہ حدیث خود گھڑی ہو اور منسوب اسے حضرت ابن عباسؓ کی طرف کر دیا ہو جیسا کی علی بن ابن عباس کے بیان کے مطابق ایسا کرنا اس کا عام وطیرہ تھا۔

داخلی جانچ پڑتال کے مختلف پہلو جب ہم زیر غور حدیث کے نفس مضمون کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کے مندرجات کا کئی لحاظ سے غلط ثابت ہونا اظہر من الشّمس ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:-

(ا) حضرت علیؓ جیسے عظیم المرتبت انسان کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اسلام نے کسی بھی انسان کو سزا کے طور پر آگ کا عذاب دینے سے واضح طور پر منع کیا ہے۔

(ب) ''جو کوئی بھی اپنا دین بدل لے'' کے الفاظ اس درجہ کی عمومیت کے حامل ہیں کہ انہیں ایک نہیں کئی توضیحات کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے اور ان کا اطلاق مردوں، عورتوں، اور بچوں

سب پر ہوسکتا ہے جبکہ امام ابو حنیفہ اور فقہ کے بعض دوسرے مکاتیب کے نزدیک ایک مرتد عورت کو کسی حال میں بھی قتل نہیں کیا جاسکتا۔

(ج) اس حدیث میں عربی کا لفظ ''دین'' استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ایک عمومیت کا حامل لفظ ہے جس سے مراد کوئی بھی مذہب ہوسکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سے مراد صرف اسلام ہی ہو۔ خود قرآن میں مشرکوں کے مذہب کو دین قرار دیا گیا ہے۔ (حوالہ کے لئے دیکھیں سورۃ الکافرون)۔

اس حدیث میں عمومیت کی حامل جو زبان استعمال کی گئی ہے اس کی روشنی میں اس حدیث کے اطلاق کو صرف ایک ایسے مسلمان تک کیسے محدود کیا جاسکتا ہے جو اپنا مذہب ترک کرنے کا اعلان کردے؟ ٹھیٹھ قانونی اصطلاحات کی روشنی میں اس حدیث کے مطابق تو جو شخص بھی اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے خواہ وہ کسی بھی مذہب کا پیرو ہو اسے موت کے گھاٹ اتارنا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک یہودی اگر عیسائی ہوجاتا ہے تو اسے قتل کرنا ہوگا، اسی طرح جو عیسائی مسلمان ہوجاتا ہے اسے بھی قتل کرنا ہوگا اور اس لامذہب ملحد کو بھی قتل کرنا ہوگا جو اپنا آبائی مسلک ترک کر بیٹھے اور اس کی بجائے کوئی اور مذہب اختیار کرلے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ جو کوئی شخص بھی مسلم مملکتوں کی جغرافیائی حدود کے پرے کسی اور علاقہ میں یعنی کہیں بھی اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے اس پر بھی اس حدیث کا اطلاق ہوگا۔ خواہ وہ آسٹریلیا کا قدیمی باشندہ ہو یا قدیمی افریقن نسل کا کوئی پست قامت انسان یا جنوبی امریکہ کا کوئی ریڈ انڈین ہو وہ جونہی اپنا مذہب ترک کرکے کوئی نیا مذہب اختیار کرے اس کو اسی لمحہ قتل کرکے موت کے گھاٹ اتارنا ہوگا۔

اسلام تبلیغ و اشاعت پر بے انتہاء زور دیتا ہے حتّٰی کہ ہر مسلمان کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دے کر مجاہد فی سبیل اللہ بنے۔ اب یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ آجکل کے بہت سے نامور مسلم علماء تنگ نظری پر مبنی قتلِ مرتد کے عقیدے سے چمٹ کر اسلامی جہاد کی روح یعنی تبلیغی جہاد کی نفی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان علماء کے نزدیک اسلام کہتا ہے کہ جو شخص بھی اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے (اور یہاں مذہب سے ان کی مراد اسلام ہے) اسے فوری طور پر قتل کردیا جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن لوگوں کے متعلق کیا حکم ہے جو دوسرے مذاہب کے ماننے والے ہیں اور

اپنا مذہب تبدیل کر لیتے ہیں؟ کیا ان مذاہب کے ماننے والے ایسے لوگوں کو بھی قتل کیا جائے گا؟ اسلام نے تو تمام مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ پُرامن ذرائع سے کام لے کر تمام غیر مسلموں سے اُن کا مذہب تبدیل کرانے کی جدّوجہد میں مسلسل مصروف رہیں اور اس مقدس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ یہ کام اس قدر اہم ہے اور مسلسل جدّوجہد کا اس درجہ متقاضی ہے کہ ہر مسلمان کو اس امر کا مکلّف کیا گیا ہے کہ وہ آخری سانس تک اس جدّوجہد میں مصروف رہے اور کبھی اور کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہو۔ مثال کے طور پر قرآن مجید فرماتا ہے:-

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۔

(النّحل: ۱۲۶)

(اے رسول!) تو لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے اپنے ربّ کی راہ کی طرف بلا اور اس طریق سے جو سب سے اچھا ہو ان سے بحث کر۔ تیرا ربّ ان کو بھی جو اس کی راہ سے بھٹک گئے ہوں بہتر جانتا ہے اور ان کو بھی بہتر جانتا ہے جو ہدایت پاتے ہیں۔

جو لوگ سراسر تعصّب پر مبنی قتل مرتد کے ظالمانہ عقیدے کے حامی ہیں وہ اس امر پر کبھی دھیان نہیں دیتے کہ اس عقیدہ کے نتیجہ میں بین الاقوامی روابط اور بین المذاہب انسانی تعلقات کا بری طرح متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اسلام کے بارہ میں انہوں نے خود جو نقطہ نظر اپنایا ہے وہ عملاً کیسی غیر منصفانہ صورت حال کو جنم دینے کا موجب بنتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی رو سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے جبکہ صرف مسلمانوں کو اس حق سے محروم کیا گیا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو مطلب اس کا بجز اس کے اور کچھ نہیں بنتا کہ اسلام کو یہ امتیازی حق حاصل ہے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو تو اپنا حلقہ بگوش بنائے لیکن دوسرے مذاہب کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ وہ مسلمانوں کو بذریعہ تبلیغ اپنے اندر داخل کر سکیں کیونکہ جو مذہب بھی کسی مسلمان کو اپنا حلقہ بگوش بنائے گا

عقیدۂ قتل مرتد کے حامی ایسے مسلمان کی فوراً گردن اڑا دیں گے۔ اس عقیدہ کی روشنی میں اسلامی تصوّر عدل کی کیسی افسوسناک صورت ابھر کر دنیا کے سامنے آتی ہے۔

آخر میں یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ ارتداد نام ہے کسی شخص کے ایسے مذہب سے واضح اور کلی انکار کا جس کے ساتھ وہ پہلے وابستہ تھا۔ عقائد کے بارہ میں اختلافات کو خواہ وہ کتنی ہی شدید نوعیت کے کیوں نہ ہوں ارتداد کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ مزید برآں خود اسلام کی رو سے کسی کو ارتداد کی سزا دینا صرف اور صرف خدائے قادر کے اختیار میں ہے کیونکہ جو شخص بھی اسلام کو ترک کر کے اپنے مرتد ہونے کا خود اعلان کرتا ہے وہ صرف اور صرف اسلام کو بھیجنے والے کا مجرم ہے نہ کہ کسی اور کا۔ وہ ارتداد جس کے ساتھ واضح طور پر کسی اور قابلِ تعزیر جرم کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو اور اس طرح اس کے نئے نئے شاخسانے نہ نکالے گئے ہوں اس دنیا میں ایسے ارتداد کی کوئی سزا مقرر نہیں ہے۔ اس لحاظ سے محض ارتداد اس دنیا میں قابل سزا جرم شمار ہی نہیں ہوتا۔ یہی وہ تعلیم ہے جو خدا اور اس کے رسولؐ نے دی ہے اور یہی وہ نظریہ ہے جس کی حنفی فقہاء[1] فتح القدیر[2]، چیلپی[3]، حافظ ابن قیّم، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور بہت سے دوسرے فقہاء نے تصدیق کی ہے۔ مودودیوں کا اس حدیث کے بارہ میں (جسے وہ مستند سمجھتے ہیں) متفق علیہ ہونے کا دعویٰ محض ایک فسانہ ہے اس سے زیادہ اس کی اور کوئی حیثیت نہیں ہے۔

---

[1] هداية

[2] فتح القدیر جلد۴ صفحہ ۳۸۹ جلد ۳ صفحہ ۵۸۰

[3] چیلپی شرح فتح القدیر صفحہ ۳۸۸

کائنات کے لئے رحمت

''وہ اپنی عیاری کی وجہ سے خوب جانتے تھے کہ مسلمانوں کے جذبات کسی موضوع پر اس قدر آسانی سے اور تیزی وتندی سے برانگیختہ نہیں کئے جاسکتے اور ان کے غیظ و غضب کو بیدار نہیں کیا جاسکتا جس قدر رسولِ پاک صلعم کی حقیقی یا خیالی توہین پر کئے جاسکتے ہیں لہٰذا انہوں نے یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ ان کی سرگرمیوں کا مقصد یہ ہے کہ رسولِ پاک کی نبوت کی حفاظت کی جائے اور آپؐ کی ناموس پر احمدیوں کے حملوں کا مقابلہ کیا جائے...... یہ چال کامیاب ہوگئی اور حاضرین کی کثیر تعداد ان کے جلسوں میں شریک ہونے لگی اور چونکہ بعض احراری مقرر الفاظ وفقرات کے انتخاب اور تشبیہہ واستعارہ کے استعمال میں بڑے ماہر واقع ہوئے ہیں اور اپنی تقریروں میں طنز وظرافت کے چھینٹے بھی خوب دیتے ہیں (خواہ وہ ظرافت کتنی ہی مبتذل کیوں نہ ہو) لہٰذا وہ روز بروز مقبولِ عام ہونے لگے۔'' (جسٹس منیر)[1]۔

اہانت انبیاء کا سلسلہ ایک بہت قدیم سلسلہ ہے۔ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود بعثت انبیاء کا سلسلہ قدیم ہے کیونکہ کوئی ایک نبی بھی ایسا مبعوث نہیں ہوا کہ جس کے ساتھ اس کی قوم نے استہزاء واہانت کا سلوک روا نہ رکھا ہو حتیٰ کہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنہیں اللہ تعالیٰ نے رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْن قرار دے کر پوری کائنات کے لئے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا اپنی قوم کی طرف سے استہزاء واہانت کا نشانہ بنے۔ آپؐ کے ساتھ نہ صرف آپؐ کی زندگی کے مکی دور میں استہزاء کا سلوک کیا گیا اور ہدف ملامت بنایا گیا بلکہ مدینہ میں بھی اس کا سلسلہ جاری رہا اور اس امر کے باوجود جاری رہا کہ وہاں آپؐ استہزاء و اہانت کرنے والوں کو سزا دینے کی پوری

---
[1] منیر کمیشن رپورٹ اردو صفحہ ۲۷۶

مقدرت رکھتے تھے۔ مدینہ کے یہودی تو تھے بھی بہت زبان دراز اور تیز وطرار اور ان کا استہزاء کا انداز بھی بہت مبتذل نوعیت کا ہوتا تھا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اُڑانے اور آپؐ کو استہزاء کا نشانہ بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رَحۡمَةٌ لِّلۡعٰلَمِیۡن صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ یہود کو اور نہ دوسرے استہزاء کرنے والوں کو اس جرم کی کبھی کوئی سزا دی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے جانے کے بعد قریش مکہ نے اسلام کی اشاعت اور روز افزوں ترقی کو روکنے کے لئے یہودِ مدینہ کے ساتھ ساز باز کا سلسلہ شروع کیا اور جلد ہی دونوں کے درمیان باقاعدہ گٹھ جوڑ قائم ہو گیا۔ منافقین بھی ''پانچویں کالم'' (یعنی جاسوسوں) کے روپ میں وہاں موجود تھے جنہوں نے مخبریاں کر کر کے اندر ہی اندر جڑیں کاٹنے کی مساعی جاری رکھی ہوئی تھیں۔ خفیہ ریشہ دوانیوں کے ذریعہ جنگ کی آگ بھڑکانے کے علاوہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف جھوٹا پراپیگنڈا کرنے کی غرض سے پیغام رسانی اور دیگر خفیہ رابطوں کا ایک جال بچھایا ہوا تھا۔ باتوں کو پَر لگا کر افواہیں پھیلانے والے شاعر اپنی جگہ مصروفِ کار تھے۔ میکسم روڈنسن MAXIME RODINSON نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ ان شاعروں کی حیثیت اپنے دور کے صحافیوں کی سی تھی اور کارمیخائل CARMICHAEL نے انہیں جلتی پر تیل ڈالنے والے یعنی جنگ کی آگ بھڑکانے والے قرار دیا ہے[۱]۔

بہرحال اس وقت اسی قسم کے شاعر تھے جنہوں نے اپنے اشعار کے ذریعہ مدینہ کے مسلمانوں کو یہ جتلا جتلا کر مطعون کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا کہ انہوں نے باہر سے آوارِد ہونے والے ایک اجنبی کی اطاعت قبول کر کے اپنی عزت خاک میں ملا دی ہے۔ ابوعفک نامی ایک شاعر

۱ے حوالہ کے لئے دیکھیں میکسم روڈنسن کی کتاب ''محمد'' صفحہ ۱۷۴ مترجم رینے کارٹر (نیویارک ۱۹۷۱ء)

(ب) جوئیل کارمیخائل JOEL CARMICHAEL نے لکھا ہے بدوؤں میں ایک قبائلی شاعر محض شعر گوئی نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی حیثیت جنگ کی آگ بھڑکانے والے کی ہوتی تھی۔ اس کی نظموں کو باقاعدہ جنگ کا آغاز تصور کیا جاتا تھا۔ حوالہ کے لئے دیکھیں کتاب SHAPING OF ARAB A STUDY IN ETHNIC IDENTITY (- NEWYORK 1967 P.38

نے قَیلہ کے فرزندوں (یعنی اوسؔ اور خزرجؔ) کو اپنی ایک نظم میں طعنہ دیتے ہوئے کہا:-

''میں اس دنیا میں ایک طویل زندگی گزار چکا ہوں لیکن میں نے کوئی گھرانہ یا لوگوں کا کوئی قبیلہ ایسا نہیں دیکھا جو اپنے اتحادیوں کے ساتھ (جب وہ مدد کے لئے پکاریں) یکجا ہو کر فرزندانِ قیلہ سے بڑھ کر وفاداری کا ثبوت دے سکے۔ پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہو جانا تو ممکن ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اوسؔ و خزرجؔ ہتھیار ڈال کر کسی اور کی اطاعت قبول کر لیں۔ پر اب (میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں) ان کے درمیان باہر سے ایک شتر سوار آیا اور اس نے ان میں ایک عجیب وغریب قسم کا فرق پیدا کر دکھایا۔ وہ کہتا ہے تمہیں یہ کرنے کی اجازت ہے اور یہ کرنے کی اجازت نہیں۔ ہر چیز اور ہر بات میں وہ اپنا حکم چلاتا ہے۔ اے فرزندانِ قیلہ تم تو اقتدار اور قوت کو اہمیت دینے اور ماننے والے تھے تم نے ماضی میں تُبّع کی اطاعت کیوں نہ قبول کی[1]۔''

اس اقتباس کے آخری الفاظ سے شاعر کا مطلب یہ تھا کہ تُبّع تو جنوبی عرب کا ایک طاقتور بادشاہ تھا جس کا شُہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ تمہارے آباء واجداد نے اس کے آگے تو سرِ تسلیم خم نہ کیا لیکن اب تمہیں ہو کیا گیا ہے کہ تم نے مکہ سے آنے والے ایک مہاجر کے تمام دعاوی کو قبول کر کے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔

اس دوران مالک بن الضیف[2] کی جگہ کعبؔ یہودیوں کا سردار منتخب ہو گیا اُس نے بھی جنگ بدر[3] میں قریش کی تباہی پر اپنے دلی ملال اور اذیّت کا اظہار کیا۔ اس نے ایک مرثیہ لکھا جس میں نوحہ کرتے ہوئے کہا:-

''اے اوس و خزرج! تم اپنے درمیان سے اس بے عقل شخص کو نکال باہر کرو تا کہ اس کی لایعنی باتوں سے محفوظ رہ سکو۔ تم مجھے اس بات پر مطعون کرتے ہو کہ میں ان

---

[1] سیرۃ رسول اللہ ابن ہشام صفحہ ۹۹۵

[2] انسان العیون مصنفہ علی بن برہان الدین الحلبی صفحہ ۱۱۶

[3] سیرۃ رسول اللہ ابن ہشام صفحہ ۴۵۹

لوگوں کی ہلاکت پر آنسو بہاتا ہوں جو مجھ سے محبت اور اخلاص کا تعلق رکھتے تھے۔ (تمہارے اس طعنہ کی مجھے کوئی پرواہ نہیں) میں جب تک زندہ ہوں میں ان لوگوں کے اوصاف کو یاد کرکر کے آنسو بہاتا اور ان کی ہلاکت پر نوحہ کرتا رہوں گا جو مکہ کے عالی نسب گھرانوں کی آن بان اور عزت و آبرو کے مظہر تھے[1]۔''

ظاہر ہے اس قسم کے سوقیانہ اور بازاری اندازِ کلام اور بے لگام دشنام طرازی کی آئینہ دار مہم کا اصل مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو انصار اور مہاجرین کے درمیان اور دوسری طرف خود انصار میں سے اوس وخزرج کے درمیان افتراق کا بیج بو کر ان میں پھوٹ ڈالی جائے اور انہیں باہم ایک دوسرے کے خلاف لڑنے پر اکسایا جائے۔ جب یہودِ مدینہ کو یہ مہم کامیابی سے ہمکنار ہوتی نظر آئی تو قبیلہ بنو قینقاع کے شاس بن قیس نامی ایک معمر یہودی نے ایک یہودی نوجوان کو حکم دیا کہ وہ صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اوس اور خزرج کے مابین ماضی میں لڑی گئی جنگِ بُعاث کے واقعات ان کے درمیان جا کر بیان کرے اور اس جنگ کے دوران دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف جو نظمیں کہی تھیں وہ انہیں گا گا کر سنائے تا کہ پرانی دشمنی پھر عود کر آئے اور اس طرح ان کے جذبات ایک دوسرے کے خلاف پھر بھڑک اٹھیں۔ جب اس نوجوان نے شر انگیزی کی نیت سے وہ نظمیں باری باری اوس اور خزرج کو سنانے اور ان کے جذبات بھڑکانے کا سلسلہ شروع کیا تو رفتہ رفتہ اوس اور خزرج کے درمیان پرانی دشمنی پھر ابھرنے لگی اور ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ بالآخر دونوں قبیلوں کے لوگ ایک دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور لگے ایک دوسرے کو مقابلہ اور مبارزت کی دعوت دینے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کہنا شروع کر دیا ''اگر تم یہی چاہتے ہو تو بے شک جنگ کر کے دیکھ لو، تم جنگ کے لئے تیار ہو تو ہمیں بھی تیار پاؤ گے''۔ جب بات اور آگے بڑھی تو دونوں گروہ غصّہ سے بھر گئے اور لگے ایک دوسرے کو للکارنے کہ کچھ فاصلہ پر واقع سیاہ پتھریلے مقام (الحرّہ) کو ہم میدان جنگ مقرر کرتے ہیں۔ دونوں طرف ''ہتھیار سنبھالو'' ''ہتھیار سنبھالو'' کا شور پڑ گیا اور سب اس میدان کی جانب نکل کھڑے ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی تو

---

[1] ابن ہشام

آپؐ بعض صحابہؓ کو اپنے ہمراہ لے کر بعجلت وہاں تشریف لائے۔آپ نے اوس وخزرج کے آمادۂ پیکار لوگوں کومخاطب کرتے ہوئے فرمایا:-

يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ! اللّٰهَ ،اللّٰهَ ۔أَبِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ بَعْدَ أَنْ هَدَاكُمُ اللّٰهُ لِلْإِسْلَامِ، وَأَكْرَمَكُمْ بِهِ، وَقَطَعَ بِهِ عَنْكُمْ أَمْرَ الْجَاهِلِيَّةِ، وَاسْتَنْقَذَكُمْ بِهِ مِنَ الْكُفْرِ، وَأَلَّفَ بِهِ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ[1] یعنی اے مسلمانو! خدا کو یاد کرو اور اس سے ڈرو۔کیا تم جاہلیّت کے دعووں کی بناء پر ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اُٹھانے پر تل گئے ہو حالانکہ میں تم میں موجود ہوں؟ یاد کرو اللہ نے تمہیں اسلام ایسی راہِ ہدایت عطا کی اور اس کے ذریعہ تمہیں عزت بخشی اور اس کے ذریعہ سے تمہیں کفر سے نجات دلائی اور تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے الفت پیدا کر دکھائی (یعنی کیا اس کے بعد بھی تم ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی جرأت کرو گے؟)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سن کر اوس وخزرج کے لوگ رو پڑے۔انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔انہوں نے جان لیا کہ یہ دشمن کی ایک چال تھی۔وہ ہمیں ایک دوسرے سے لڑوا کر تباہ کرنا چاہتا تھا۔وہ آپس میں گلے مل مل کر ایک دوسرے سے معذرت کرتے رہے اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہے کہ اس نے اپنے فضل سے انہیں تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا۔پھر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں وہاں سے واپس چلے آئے۔اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں:-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ۔وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ

[1] سیرۃ رسول اللہ از ابن ہشام

فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ (آلِ عمران: ۱۰۱ تا ۱۰۴)

ترجمہ:- اے مومنو! اگر تم ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی تھی کسی فریق کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہارے ایمان لے آنے کے بعد پھر تمہیں کافر بنا دیں گے اور تم کس طرح کفر کرو گے جبکہ تم وہ لوگ ہو جنہیں اللہ کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول (موجود) ہے۔ اور جو شخص اللہ کی پناہ لے تو (سمجھو کہ) اسے سیدھی راہ پر چلا دیا گیا۔ اے ایماندارو! اللہ کا تقویٰ اس کی تمام شرائط کے ساتھ اختیار کرو اور تم پر صرف ایسی حالت میں موت آئے کہ تم پورے فرمانبردار ہو اور تم سب (کے سب) اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور پراگندہ مت ہو اور اللہ کا احسان جو (اس نے) تم پر کیا ہے یاد کرو کہ جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے، اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی جس کے نتیجہ میں تم اس کے احسان سے بھائی بھائی بن گئے۔

یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ یہ تھی مدینہ میں یہود کی طرف سے پھیلائی ہوئی شرانگیزی اور مفسدہ پردازی کی وہ فضا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعروں کے پراپیگنڈے کے سلسلہ کو بند کرنے کا فیصلہ فرمایا اور انہیں قتل کرنے کے لئے بعض رضا کار طلب فرمائے۔ وہ امن و امان کے لئے بہت بڑا خطرہ بنے ہوئے تھے۔ یہ کہنا کہ انہیں اس لئے قتل کیا گیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے اور آپؐ کی توہین کرتے تھے تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کرنے والوں کو موت کی سزا کا مستوجب ٹھہرانے کے لئے ان فتنہ پرداز شاعروں کے قتل کو بطور مثال استعمال کرنا کھلی بددیانتی ہے یا پھر اسے تاریخی حقائق سے لاعلمی اور عدم واقفیت پر محمول کرنا ناگزیر ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا ارتکاب (جس کے لئے سبّ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے) نہ قرآن کی رو سے ایسا جرم ہے کہ جس پر حد جاری ہو سکتی ہو اور نہ سنت کی رو سے ایسا جرم قرار پا سکتا ہے جس کی سزا موت ہو۔ محض توہین رسالت تاوقتیکہ اضافی مجرمانہ عوامل و حالات موجود نہ ہوں قابل سزا جرم ہے ہی نہیں۔ ارتداد کی طرح اس کی سزا دینا بھی صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اللہ اور اس کے رسولوں کی عزت و ناموس کے قیام کے سلسلہ میں

قرآن مجید نے مختلف مذاہب ومسالک کے ماننے والوں کے درمیان باہمی خیر سگالی پر زور دیا ہے۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ جملہ اہلِ مذاہب ایک دوسرے کے معبودوں اور بزرگوں کو برا بھلا نہ کہیں اور ازروئے اخلاق ایک دوسرے کی دل آزاری سے بچیں۔ چنانچہ قرآنِ مجید فرماتا ہے:-

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الانعام:۱۰۹)

ترجمہ:-اور تم انہیں جنہیں وہ اللہ کے سوا (دعاؤں میں) پکارتے ہیں گالیاں نہ دو۔ وہ دشمن ہو کر جہالت کی وجہ سے اللہ کو گالیاں دیں گے۔ اس طرح ہم نے ہر ایک قوم کے لئے اس کے عمل خوبصورت کر کے دکھائے ہیں۔ پھر انہیں اپنے ربّ کی طرف لوٹ کر جانا ہے جس پر وہ انہیں اس کی خبر دے گا جو وہ کرتے تھے۔

کسی کے لئے احترام، عزت وتوقیر اور محبّت کے جذبات کا تعلق براہِ راست دل سے ہوتا ہے۔ رہا جبر، سو اس سے دوسروں کے منہ تو بند کئے جاسکتے ہیں اور دہشت بھی پھیلائی جاسکتی ہے لیکن اس کے نتیجہ میں محبت کی بجائے گستاخی اور بے ادبی کے جذبات ہی جنم لیتے اور پنپتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دل سے تعلق رکھنے والے معاملات میں قرآن مجید نے مثبت پہلو پر زور دیا ہے۔ جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزّت وناموس کا تعلق ہے قرآن فرماتا ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔ وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب:۵۷تا۵۹)

ترجمہ:- اللہ یقیناً اس نبی پر اپنی رحمت نازل کر رہا ہے اور اس کے فرشتے بھی (یقیناً اس کے لئے دعائیں کر رہے ہیں پس) اے مومنو! تم بھی اس نبی پر درود بھیجتے اور ان کے لئے دعائیں کرتے رہا کرو اور (خوب جوش وخروش سے) ان کے لئے سلامتی مانگتے رہا کرو۔ وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف دیتے ہیں اللہ ان کو اس دنیا میں اور

آخرت میں اپنے قرب سے محروم کر دیتا ہے اور اس نے ان کے لئے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر چھوڑا ہے۔ وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی قصور کیا ہو تکلیف دیتے ہیں ان لوگوں نے خطرناک جھوٹ اور کھلے کھلے گناہ کا بوجھ اپنے اوپر اٹھالیا ہے۔

سبّ سے متعلق قرآن مجید کی تعلیم بالکل واضح ہے۔ قرآن مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ کافروں کے جھوٹے خداؤں (بتوں وغیرہ) کو بھی برا بھلا نہ کہیں۔ اور پھر اس نے ایسے لوگوں کے لئے کوئی سزا مقرر نہیں کی جو رسول کی گستاخی اور توہین کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کے لئے اللہ نے اپنے قرب سے محرومی کا عذاب مقدر کر چھوڑا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جو آپؐ کی گستاخی اور اہانت کے مرتکب ہوئے اور جنہوں نے آپؐ کو اذیتوں پر اذیتیں پہنچائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو رَحۡمَۃٌ لِّلۡعٰلَمِیۡن کے انتہائی بلند مرتبہ پر فائز فرمایا تھا اور آپؐ کو پوری نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا تھا۔ ایسے لوگوں کے ساتھ آپؐ کا سلوک آپؐ کے اس رفیع الشان مقام کے عین مطابق تھا۔ اس ضروری وضاحت کے بعد آیئے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپؐ نے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا۔ اس شخص نے آپؐ کی اہانت کرنے اور اپنے انتہائی قابلِ اعتراض طرزِ عمل سے آپؐ کو اذیّت پہنچانے میں انتہا کر دی تھی۔ غزوہ بنی المصطلق (٦ ہجری مطابق ۶۲۷ء) سے فارغ ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہیوں کے ساتھ چشمہ مریسیع کے قریب ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں مہاجرین اور انصار میں ایک ناخوشگوار جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ ہوا یوں کہ حضرت عمرؓ کا ایک ملازم جس کا نام جہجاہ بن مسعود تھا انصار کے ایک حلیف شخص سنان وَبرا الجُہنی ایک بات پر باہم الجھ پڑے۔ بقول ابنِ اسحٰق جھگڑے نے جب طول پکڑا تو الجُہنی نے آواز دی یَا مَعۡشَرَ الۡاَنۡصَارِ (یعنی اے گروہِ انصار میری مدد کو پہنچو)۔ جہجاہ بھی بلند آواز میں پکارا یَا مَعۡشَرَ الۡمُھَاجِرِیۡنَ (یعنی اے مہاجرین کے گروہ میری مدد کرو)۔ اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول بلاوجہ طیش میں آ گیا۔ اس وقت ایک نوجوان زید بن ارقم کے علاوہ کچھ اور

لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ معاملہ کو سلجھانے اور باہم صلح کرانے کی بجائے اُس نے کہا اچھا اب ان لوگوں (یعنی مہاجرین) کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے ہیں! انہوں نے ہمارے وطن میں ہماری فوقیت کو متنازعہ بنایا اور ہمارے شہروں میں ہم پر ہی اکثریت اور طاقت حاصل کرنا چاہی۔ ہم اہلِ مدینہ اور جلابیبِ قریش (قلاّش قریشیوں) پر تو یہ مثل صادق آتی ہے کہ سَمِّنْ كَلْبَكَ يَأْكُلَكَ (یعنی اپنے کتے کو کھلا کھلا کر موٹا کرتا کہ وہ تجھے ہی پھاڑ کھائے)۔ خدا کی قسم جب ہم یہاں سے مدینہ واپس پہنچیں گے تو جو سب سے زیادہ معزز ہے وہ ذلیل ترین شخص کو مدینہ سے نکال کر رہے گا۔ پھر وہ اپنے لوگوں کے پاس گیا اور ان سے کہا یہ سب تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔ تم نے انہیں (یعنی مہاجرین کو) اپنے علاقوں پر قابض ہونے دیا۔ تم نے انہیں اپنے مکانوں، جائیدادوں اور مال ومنال میں حصّہ دار بنایا۔ اگر تم اپنا ہاتھ کھینچ لو یعنی تم ان سے اپنی جائیدادیں اور اپنا مال واپس لے لو تو تم انہیں کسی اور جگہ کا رخ کرنے اور وہاں پناہ لینے پر مجبور کر سکتے ہو۔ زید بن ارقم جو اس وقت اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا اس کی یہ باتیں سن رہا تھا۔ اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر الفؔ سے یؔ تک سارا واقعہ آپؐ کو کہہ سنایا۔ اس وقت حضرت عمرؓ بھی وہاں موجود تھے انہوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا آپؐ عباد بن بشر کو حکم دیں کہ وہ جا کر عبداللہ بن اُبی کو قتل کر دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر! یہ کیسے ہوسکتا ہے! لوگ کیا کہیں گے؟ وہ یہی کہیں گے کہ محمدؐ خود اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتا اور موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔ نہیں نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ آپؐ اس وقت تک دشمنوں سے تو فارغ ہو ہی چکے تھے آپؐ نے فرمایا لوگوں کو کوچ کا حکم دو۔[1]

اس صورتِ حال پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت فکرمند تھے۔ قبائلی عصبیت کی بناء پر الجہنی کا انصار کو اپنی مدد کے لئے پکارنا اور جہجاہ کا اسی انداز میں بآوازِ بلند مہاجرین کو اپنی مدد کے لئے بلانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس واقعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن کو یومِ بُعاث اور جنگ بَسوس BASUS کی طرف پھیر دیا۔ یہ جنگ چالیس سال تک جاری رہی تھی۔ آپؐ کو فکر یہ لاحق ہوئی کہ اگر عبداللہ بن اُبی اپنے منصوبہ میں کامیاب ہو جاتا تو انصار اور مہاجرین قدیم قبائلی جنگوں

---

[1] ابن ہشام غزوہ بنی مصطلق

کی طرف لوٹ کر ایک دوسرے کے ساتھ جنگوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ میں پھر الجھ سکتے تھے اور اسلامی اتحاد کا وہ پیغام جس نے ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے متحارب قبائل کو ایک متحد اور طاقتور عرب قوم میں تبدیل کر دکھایا تھا غت ربود ہو کر رہ جاتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اس درجہ فکر مند تھے کہ آپؐ نے صورتِ حال کو سنبھالنے کے لئے وہاں سے فوری طور پر کوچ کر جانے کا حکم دے دیا۔ ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ جس وقت آپؐ نے کوچ کا حکم دیا وہ ایسا وقت تھا جس میں آپؐ بالعموم سفر پر روانہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ عبداللہ بن اُبی نے اس وقت جو فتنہ کھڑا کرنا چاہا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:-

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ط وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (المنافقون: ۹)

ترجمہ:- وہ (یعنی منافقین) کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ کی طرف لوٹ کر گئے تو جو مدینہ کا سب سے معزز آدمی ہے وہ مدینہ کے سب سے ذلیل آدمی کو اُس سے نکال دے گا۔ اور عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کو ہی حاصل ہے لیکن منافق جانتے نہیں۔

جب عبداللہ بن اُبی کے بیٹے (جس کا نام بھی عبداللہ ہی تھا) کو اس سارے واقعہ کا علم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:-

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپؐ نے میرے والد عبداللہ بن اُبی کی کرتوت کے بارہ میں جو سنا ہے اس کی وجہ سے آپؐ انہیں قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو آپؐ حکم فرمایئے اور مجھے اجازت دیجئے میں خود اس کا سر قلم کر کے آپؐ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ قبیلہ خزرج کو اچھی طرح پتہ ہے کہ اس قبیلہ کا کوئی آدمی اپنے باپ کا اتنا فرمانبردار نہیں ہے جتنا میں اپنے والد کا فرمانبردار ہوں۔ میں ڈرتا ہوں اس بات سے کہ اگر آپؐ نے میرے سوا کسی دوسرے شخص کو انہیں قتل کرنے کا حکم دیا اور اس نے انہیں قتل کر دیا تو شاید میں اپنے نفس پر قابو نہ پا سکوں اور کسی وقت کوئی جذبہ ایسا ابھرے کہ میں اپنے باپ کے قاتل کا لوگوں میں چلنا پھرنا برداشت نہ کر سکوں اور

اس طرح ایک کافر کا بدلہ لینے کی خاطر ایک مومن کو قتل کر بیٹھوں اور دوزخ کا مستحق بن جاؤں'' ـــــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نہیں، میں تو ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنا چاہتا ہوں اور جب تک وہ ہمارے ساتھ ہیں میں ان کی مصاحبیّت کو برقرار رکھنے کے حق میں ہوں۔''

یہی وجہ ہے اگرچہ بعد کے زمانوں میں بعض اسلامی ملکوں میں اہانت رسول کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے موت کی سزا کا نفاذ بھی عمل میں آیا تاہم مسلمان حکمران اس جرم کے ارتکاب میں موت کی سزا دینے سے گریزاں رہتے تھے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب بعض اہانت کرنے والے اس امر کے خواہشمند ہوتے تھے کہ انہیں موت کی سزا دی جائے تا کہ وہ اپنے ہم مذہبوں میں شہید شمار ہوسکیں، وہ موت کی سزا قطعاً نہیں دیتے تھے۔ مسلمان حکمران اچھی طرح جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن اُبی، دیگر منافقین اور یہودیوں کے ساتھ اس معاملہ میں بالعموم نرم سلوک ہی روا رکھا اس لئے مسلمان حکمران بھی اس بارہ میں سختی سے پہلوتہی کرنے کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ اسپین کے شہر قرطبہ میں ۸۵۰ اور ۸۵۹ عیسوی کے درمیانی عرصہ میں بعض جنونی قسم کے جوشیلے اور کٹر عیسائیوں نے ایولوجیئس EULOGIUS نامی ایک شخص کی سربراہی میں اپنے آپ کو ایک گروپ کی شکل میں منظم کرلیا تھا۔ اس گروپ کے اراکین نے عمداً یہ وطیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ وہ جان بوجھ کر علی الاعلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہتے اور بڑی دیدہ دلیری سے آپؐ کی توہین کے مرتکب ہوتے۔ اس طرزِ عمل سے غرض ان کی یہ ہوتی تھی کہ وہ موت کو گلے لگا کر اور اس طرح شہادت کا رتبہ پا کر عیسائیوں میں احترام کی نظر سے دیکھے جائیں۔ قرطبہ کے مسلمان قاضی ان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دیتے۔ وہ انہیں اس جرم میں قید کی سزا دے دیا کرتے تھے۔ مشہور امریکی مورخ ول ڈیورینٹ WILLDURENT نے ایسے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:-

''قرطبہ کا آئزک ISSAC نامی ایک عیسائی راہب ایک قاضی کے پاس گیا اور

---

۱ ابن ہشام واقعات غزوہ بنی المصطلق

اس کے سامنے اسلام قبول کرنے اور مسلمان ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن جب قاضی نے بخوشی اس تک اسلام کا پیغام پہنچایا اور اسلامی تعلیم کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہا تو اس عیسائی راہب نے قاضی کی بات کو کاٹتے ہوئے یک دم کہنا شروع کر دیا کہ تمہارے نبی نے جھوٹا دعویٰ پیش کر کے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ خدا کی ناراضگی کا مورد بنے وہ شخص جو بہت سے بدنصیبوں کو اپنے ساتھ لے کر واصل جہنم ہوا۔ قاضی نے اسے سرزنش کی اور ڈانٹتے ہوئے اس سے پوچھا کیا تو نشہ میں ہے؟ راہب نے جواب دیا ''میرے ہوش وحواس بالکل ٹھیک ہیں میں فاتر العقل نہیں ہوں مجھے موت کی سزا دی جائے۔'' قاضی نے اسے موت کی سزا نہیں دی بلکہ جیل بجھوا دیا۔ ساتھ ہی اندلس کے حکمران عبدالرحمٰن الثانی سے اجازت طلب کی کہ اسے مخبوط الحواس قرار دے کر رہا کر دیا جائے۔''۔

سلطنت عثمانیہ کے مفتی اعظم شیخ الاسلام ابوالسعود آفندی نے سلطان سلیمان ذی شان کے عہدِ حکومت میں سزائے موت کی اجازت ضرور دی تھی لیکن انہوں نے اس سزا کو اس امر کے ساتھ مشروط کیا تھا کہ اس سزا کا مستوجب صرف وہ شخص ہوگا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں علی الاعلان بار بار گستاخی کرنے کا عادی ہو۔ شیخ الاسلام نے اس امر پر باصرار زور دینے کے لئے کہ کسی کے خلاف موت کی سزا کا حکم لگانا معمولی بات یا ہنسی کھیل نہیں ہے عام مروّجہ طریق سے ہٹ کر اسے کڑی شرط کے ساتھ مشروط کرنا ضروری خیال کیا۔ وہ صاف اور واضح طور پر چاہتے یہ تھے کہ بات بات پر بغض وعناد پر مبنی قانونی چارہ جوئی کو روزمرّہ کا معمول بنانے والے غیر سنجیدہ طریقِ عمل سے بہرطور اجتناب کیا جائے۔ اسی لئے انہوں نے یہ قطعی حکم ساتھ لگایا کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کسی ملزم کو محض ایک یا دو آدمیوں کے کہنے پر عادی مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کسی کا عادی

---

[۱] ''دی سٹوری آف سویلیزیشن'' مصنفہ ول ڈیورنٹ پبلشر سائمن اینڈ شسٹر مطبوعہ ۱۹۵۰ء جلد چہارم صفحہ ۳۰۱
THE STORY OF CIVILISATION VOL. 4 P. 301 SIMON AND SHUSTER - NEWYORK 1950

مجرم ہونا صرف اس وقت ہی پایۂ ثبوت کو پہنچے گا جب ذاتی اغراض سے پاک اور مبرا قابلِ اعتماد مسلمان ایک غیر جانبدار کی حیثیت سے حکّامِ مجاز کے سامنے اس کے عادی مجرم ہونے کا نا قابلِ تردید ثبوت پیش کریں۔اس کی خاطر فتویٰ میں ایک اہم تاکیدی وانضباطی شق کا اضافہ کیا گیا تھا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوالسعود نے سزائے موت کا ایسا مشروط فتویٰ قرآن اور حدیث کی سند موجود نہ ہونے کے شدید احساس کے تحت دیا تھا۔وہ جانتے تھے کہ سبّ (یعنی اہانت رسول) کی سزا دینا صرف اور صرف خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔فتویٰ اغلباً سیاسی دباؤ کے تحت دیا گیا تھا کیونکہ مفتیٔ اعظم نے فتویٰ میں ایک امر کی وضاحت کر کے اس کے مؤثر ہونے کی خود ہی نفی کر دی۔انہوں نے لکھا کہ جو لوگ سرے سے ایمان ہی نہیں لائے وہ اپنے اس عدمِ ایمان یعنی کفر کو اپنے عقیدے کی رو سے درست سمجھتے ہیں اس لئے اس بارہ میں اپنے عدم ایمان کا اظہار انہیں مجرم نہیں بنا سکتا۔یعنی کافروں کی طرف سے حضرت اقدس محمد رسول اللہؐ کے پیغمبرانہ مشن کا انکار گستاخی نہیں ہے اس لئے ایسے انکار کو ارتکابِ جرم پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

کسی مسلمان کے ایمان کی کیفیت (یعنی مرتبہ و مقام) اور رسول اللہ کے لئے اس کے جذبۂ احترام کی کیفیت کو قانونی تعریف کے دائرے میں محصور نہیں کیا جا سکتا یعنی ایمان کی کیفیت اور جذبۂ احترام کی کیفیت کی کوئی قانونی تعریف ممکن نہیں ہے۔مزید برآں کسی کافر پر بندوق تان کے نہ تو اسے اسلام لانے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے حضرت اقدس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زبردستی احترام کروایا جا سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ارتداد اور سبّ کی اس دنیا میں کوئی سزا مقرر نہیں کی۔اسی لئے اس امر کے باوجود کہ عبداللہ بن اُبی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں تحقیر آمیز الفاظ استعمال کئے آپؐ نے اسے اس گستاخی اور اہانت کی کوئی سزا نہیں دی۔

اس ضمن میں یہ امر بھی خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ مذہب کا رُخ سیاست کی طرف موڑنے والے علماء ان دو جرائم (ارتداد اور سبّ) کی مزعومہ سزا کو بڑی آسانی سے سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔وہ مذہبی مفادات کو مادی مقاصد کے لئے استعمال کر کے ان کی حرمت کو نقصان پہنچانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔اپنی سیاسی اور مادی اغراض کو پورا کرنے کے لئے مذہبی عقائد

کو سراسر غلط اور ناروا رنگ میں استعمال کرنا ان کا عام وطیرہ ہوتا ہے۔[1]

آج تو علمائے دیوبند اور علمائے اہل حدیث احمدیوں پر یہ الزام عائد کرنے میں بہت پیش پیش ہیں کہ احمدی (نعوذ باللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرتے ہیں لیکن وہ اس احساس سے عاری ہیں کہ وہ احمدیوں پر یہ سراسر جھوٹا الزام لگا کر خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں اور خود اپنی تباہی کا اپنے ہاتھوں سامان کر رہے ہیں۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ دیوبندی، اہل حدیث اور امام عبدالوہاب نجدی کے پیرو نجد کے سوا باقی دنیا میں سنّیوں کے بالمقابل (جو اپنے آپ کو سوادِ اعظم کہتے ہیں) اقلیت میں ہیں۔ برصغیر پاک و ہند سمیت پورے عالم اسلام میں اکثریت سنیوں ہی کی ہے۔ سنیوں کی طرف سے دیوبندیوں اور اہل حدیث پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو گرا کر آپؐ کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اُدھر دیوبندی اور وہابی علماء سواد اعظم یعنی سنیوں کو (جو غالب اکثریت میں ہیں) کافر سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ سنّی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی صفات منسوب کرتے ہیں جن سے شرک لازم آتا ہے اور وہ ایسا کرنے کے باعث اور کچھ نہ سہی مشرک بنے بغیر نہیں رہتے۔ مثال کے طور پر سنّی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر کا زمین پر سایہ نہ پڑتا تھا، وجہ اس کی وہ یہ بتاتے ہیں کہ آنحضورؐ تو تھے ہی مجسّم نور۔ اسی طرح جب ترکی کے شاعر سلیمان چلیبی آف بصرہ (۱۴۱۰ء) نے میلاد شریف کی محفلیں منعقد کرنا شروع کیں اور ان کے انعقاد کا رواج چل نکلا تو حسب رواج ہر محفل درود و سلام پر ختم ہوتی تھی اور سب حاضرین ''یَا نَبِیُّ سَلَامٌ عَلَیْکَ'' کا ورد کرتے تھے رفتہ رفتہ اس خیال نے باقاعدہ عقیدے کی شکل اختیار کر لی کہ اس وقت چونکہ محفل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح آموجود ہوتی ہے اس لئے لازمی ہے کہ جملہ حاضرین احتراماً کھڑے ہو جایا کریں اور پھر ''یَا نَبِیُّ سَلَامٌ عَلَیْکَ'' کا ورد کر کے آپؐ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل کیا کریں۔ اسی طرح بریلوی حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک پر حاضری دے کر وہاں آنحضورؐ سے دعائیں مانگنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ وہاں احتراماً جھکتے اور روضۂ مبارک کی جالیوں کو چومتے

---

[1] مثال کے لئے دیکھیں منیر انکوائری کمیشن رپورٹ (اردو ترجمہ) صفحہ ۲۷۷، ۲۷۸

ہیں۔ دیوبندیوں اور اہلِ حدیث کے نزدیک سنّیوں (بریلویوں وغیرہ) کے یہ اور اس جیسے دوسرے عقائد اور مذہبی رسوم و رواج شرک کی ذیل میں آتے ہیں۔ ادھر سنّیوں کا کہنا یہ ہے کہ وہابی تاریخی قبرستان ''جنّت البقیع'' کو مسمار کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے گنبد کو بھی مسمار کرنا چاہتے تھے لیکن دنیائے اسلام میں رونما ہونے والے شدید ردّعمل کے پیشِ نظر وہ ایسا کرنے سے باز رہے۔ الغرض صحابہؓ کی قبروں، مقابر اور قبوں وغیرہ کو مسمار کر کے انہیں پیوندِ زمیں کرنے کی بناء پر دنیا بھر کے سنّی افراد وہابیوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تخفیف کا الزام عائد کرتے ہیں۔ بریلوی تو یہ بھی سمجھتے اور علی الاعلان اس کا اظہار کرتے ہیں کہ دیوبندی علماء مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا اشرف علی تھانوی ختم نبوت کے منکر تھے۔ چنانچہ مولانا عبدالمصطفیٰ ابویحیٰ محمد معین الدین شافعی، قادری، رضوی، تھانوی اپنے ایک کتابچہ بعنوان ''دیوبندی مولویوں کا ایمان'' میں ان کے ایک مستند قول کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

> ''مسلمانو! دیکھو اس ملعون، ناپاک، شیطانی قول نے ختم نبوت کی کیسی جڑ کاٹ دی ہے...... اب یہ ملاحظہ فرمائیے کہ مولوی قاسم نانوتوی منکر ختم نبوت ہے اور منکرین ختم نبوت کے حق میں مولوی رشید احمد و مولوی خلیل احمد وغیرہم وہابیہ نے کفر کے فتوے دیئے......[۱]''

تحفظ ناموس رسالت کے نام پر بریلویوں اور دیوبندیوں کے درمیان ہونے والے مناظروں اور بحثوں میں شرم و حیا اور شرافت کی وہ مٹی پلید ہوئی ہے اور دونوں طرف سے ایسی غیر شائستہ، سوقیانہ اور بازاری زبان استعمال ہوتی رہی ہے کہ اس کا ہلکے سے ہلکا نمونہ پیش کرنا بھی طبائع پر گراں گزرے بغیر نہیں رہتا۔ شورش کاشمیری نے جو دیوبندی مکتب فکر کے زبردست حامی تھے ''کافر ساز ملاں'' کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا۔ اس میں شورش نے لکھا کہ جو کوئی دیوبند کے عظیم لیڈر کو کافر قرار دیتا ہے وہ کذاب ہے۔ اس کتابچہ میں اس کے علاوہ اور بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بریلوی علماء کو بے نقط سنائی گئی ہیں۔ انہیں دین فروش قرار دے کر لکھا ہے کہ دین فروشی ہی ان کا اصل ذریعہ معاش

[۱] کتابچہ ''دیوبندی مولویوں کا ایمان'' مطبوعہ لائلپور۔ جامع مسجد

ہے اور یہ کہ وہ لارڈ کلائیو کے خانہ زاد غلام ہیں نیز مسلم لیگ اور قائد اعظم کے بھی دشمن ہیں ۔ اپنے ایک اور کتابچہ میں شورش کاشمیری نے بریلویوں کے متعلق لکھا یہ مولانا حسین احمد مدنی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بیت الخلاء کی اینٹ سے بھی کم تر درجہ کے لوگ ہیں[۱]۔ اس قسم کے سوقیانہ حملوں کا بریلویوں نے جو جواب دیا وہ سوقیانہ پن میں اپنی جگہ کچھ کم نہیں[۲]۔

اہل سنت و الجماعت یعنی بریلویوں کے علماء دیوبندی علماء پر اور دیوبندی علماء بریلوی علماء پر ہتک رسول کا الزام لگاتے ہیں ۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے نزدیک گستاخ رسول ہیں ۔ اب رہے اہل قرآن وہ جماعتِ اسلامی کے نزدیک احمدیوں سے بھی بدتر ہیں ۔ بخشا شیعوں کو بھی نہیں گیا۔ ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ و مقام کو گرانے اور کم کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے ۔ ان کی طرف یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ ان کے عقیدہ کی رو سے حضرت علیؓ رسول اللہؐ کی نبوت میں شریک تھے۔

یہاں کینیڈا کے سکالر ولفریڈ کینٹویل سمتھ WILFRED CANTWELL SMITH کی رائے کا ذکر بھی بہت ضروری ہے ۔ وہ برِّ صغیر آئے ، ہندوستان اور پاکستان کے مسلم معاشرہ کا بہت قریب سے بنظرِ غائر مطالعہ کیا۔ واپس جا کر ''جدید ہندوستان میں اسلام'' ISLAM IN MODERN INDIA کے نام سے کتاب لکھی ۔ اس میں وہ مسلمانوں کے مذہبی مزاج کے ایک پہلو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

''مسلمان اللہ کی ذات پر حملہ برداشت کرلیں گے لیکن رسول کی ذات پر حملہ ان کے نزدیک ناقابلِ برداشت ہے ۔ دہریے ان کے درمیان موجود ہیں ۔ دہریت پر مبنی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں ۔ اسی طرح آزاد خیال سوسائٹیوں کی بھی ان میں کمی نہیں ہے ، یہ سب ان کے نزدیک گوارا ہے لیکن محمدؐ کی شان میں گستاخی پر معاشرے کے آزاد خیال طبقے بھی بھڑک اٹھیں گے ۔

---

[۱] کتابچہ ''رضا خوانی فتنہ پردازوں کا سیاہ جھوٹ''
[۲] تفصیل کے لئے دیکھیں اسی کتاب کا صفحہ

جنون کی حد تک پہنچی ہوئی شعلہ باز عصبیّت فوراً ابھر کر سامنے آجائے گی[۱]۔''

مسلمانوں کے تشخص اور مزاج کے بارہ میں پروفیسر کینٹ ول سمتھ کا یہ اندازہ درست نہیں ہے۔ انہوں نے بعض مخصوص واقعات سے عمومی نتائج اخذ کر کے اور انہیں قاعدہ کلیہ کی شکل دے کر سارے ہی مسلمانوں کو اس کی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ دراصل پروفیسر کینٹ ول سمتھ نے بعض ملّاؤں اور مخصوص اغراض کی حامل سیاسی لیڈر شپ کی کارستانی اور اس کے شاخسانے کو عمومی رنگ دے دیا ہے۔ یہ دونوں طبقے (مذہبی ملّاں اور مخصوص اغراض کے حامل سیاسی لیڈر) ''اپنی عیاری کی وجہ سے خوب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے جذبات کسی موضوع پر اس قدر آسانی اور تیزی وتندی سے برانگیختہ نہیں کئے جاسکتے اور ان کے غیظ وغضب کو بیدار نہیں کیا جاسکتا جس قدر رسول پاک صلعم کی حقیقی یا خیالی توہین پر کئے جاسکتے ہیں[۲]۔'' یہ دونوں طبقے اس بات سے فائدہ اٹھا کر جذبات کو بھڑکانے کے اصل ذمّہ دار ہوتے ہیں۔

بلاشبہ امیر اور غریب، پڑھے لکھے اور ان پڑھ، نیک اور بد سارے ہی مسلمان محبت رسول کے بارہ میں یکساں جذبات رکھتے ہیں۔ یہ امر ایسا ہے کہ اس کے متعلق ان کے درمیان کسی اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب ہی کے نزدیک فنا فی الرّسولؐ کے مقام کو روحانی مجاہدہ میں نقطۂ عروج کی حیثیت حاصل ہے اور کوئی مسلمان بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بلند ترین روحانی تجربہ معراج کے نام سے موسوم ہے جس میں آپؐ گروہ در گروہ فرشتوں کے جلو میں روحانی ارتفاع کی منزلیں طے کرتے ہوئے حضرت احدیت میں اس مقام رفیع تک جا پہنچے کہ جہاں جبرائیل علیہ السلام کو بھی رسائی کی اجازت نہ تھی لیکن اقتدار کی بھوکی مسلم قیادت (لیڈر شپ) مسلمانوں کے اس متفقہ عقیدہ سے فائدہ اٹھاتے اور ان کے جذبات کو برانگیختہ کرتے وقت اس امر کو عمداً فراموش کر دیتی ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (یعنی محمدؐ اللہ کے رسول ہیں) مسلمان کے ایمان کا دوسرا جزو ہے پہلا اور سب سے مقدم جزو بہرحال لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے جس کے معنی ہیں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

۱۔ ''اسلام ان ماڈرن انڈیا'' مصنّفہ پروفیسر کینٹ ول سمتھ لاہور، سیکنڈ ایڈیشن ۱۹۴۷ء

۲۔ منیر انکوائری کمیشن رپورٹ اردو ترجمہ صفحہ ۲۷۶

حفظِ مراتب کوملحوظ رکھتے ہوئے جہاں تک محبتِ الٰہی اور محبتِ رسولؐ کا تعلق ہے ایک امر کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ کوئی پیمانہ ایسا موجودنہیں ہے کہ جس سے کسی کے دل میں پائی جانے والی محبت اور احترام کو ماپا جاسکے۔ محبت الٰہی اور محبت رسولؐ میں سرشار رہنے والے ایک عارف کے جذباتِ محبت کی صحیح عکاسی دنیا کی کسی بھی زبان کے الفاظ میں نہیں ہوسکتی۔ صوفیائے کرام نے جو اللہ اور رسولؐ کی محبت میں سرشار تھے اپنے جذباتِ محبت کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں دیوان کے دیوان بھر دیئے اور اس کام میں اپنی زندگیاں لگا دیں لیکن ان کی محبت کی اصل گہرائی اور گیرائی کو ان کا خدا جانتا تھا یا وہ خود۔ ملّاں جذباتِ محبت میں ڈوبی ہوئی منظوم حمد یا نعت کو پڑھ تو سکتا ہے لیکن بغور پڑھنے کے باوجود ان جذبات کی گہرائی میں اتر نہیں سکتا اسی لئے وہ اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا نام غلام احمد تھا۔ فی الحقیقت آپؑ تھے ہی احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام۔ سبحان اللہ کیا ہی بڑا اعزاز اور کیا ہی بڑا مرتبہ تھا اور کیا ہی بلند شان تھی احمدؐ کی اس غلامی کی جو منجانب اللہ حضرت بانیٔ سلسلہ کو عطا ہوئی۔ اس کا کچھ اندازہ آپؑ کے تین اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔ آپؑ نے اپنے ان تین اشعار میں دو قسم کے معترضین کو بہت ہی شاندار جواب دیا ہے۔ ان میں سے ایک تو وہ معترضین ہیں جو آپؑ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک کا الزام لگاتے ہیں اور دوسرے وہ معترضین ہیں جو پروفیسر کینٹ ول سمتھ کی طرح مسلمانوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ محبت الٰہی کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ آپؑ ان ہر دو قسم کے معترضین کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

بعد از خدا بعشق محمد مخمرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم [1]

خدا تعالیٰ کے بعد میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں مخمور ہوں اور اگر یہی کفر ہے تو خدا کی قسم میں سخت کافر ہوں۔

قربانِ تست جانِ من اے یارِ محسنم
با من کدام فرق تو کردی کہ من کنم [2]

---

[1] حضرت مرزا غلام احمدؑ کی تصنیف ''ازالہ اوہام'' جلد اوّل صفحہ ۱۷۶۔ امرتسر ۱۸۹۱ء

[2] آئینہ کمالاتِ اسلام تصنیف حضرت مرزا غلام احمد قادیانی ۱۸۹۳ء آخری صفحہ

اے میرے یارِ محسن اور اے میرے محبوب! تجھ پر میری جان قربان ہو، تو نے لطف واحسان میں کب مجھ سے کوئی فرق کیا ہے جو میں کروں۔

در کوئے تو اگر سرِ عشاق را زنند
اوّل کسے کہ لافِ تعشّق زند منم [۱]

ہاں اے میرے پیارے رسول! اگر تیرے کوچہ میں عشاق کا سر قلم کرنے کا ہی دستور ہو تو وہ پہلا شخص جو نعرۂ عشق بلند کرے گا میں ہوں گا۔ میں ہوں گا۔

دائرہ اسلام میں سلسلہ عالیہ احمدیہ کے بانی حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام اپنے آقا و مطاع حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کی حیثیت میں افضل الرسل اور مختارِ کل ہونے پر اپنے کامل یقین و ایمان کا اعلان کرتے ہوئے اخلاص سے مملو نہایت درجہ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:-

''ہمارے مذہب کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہمارا اعتقاد جو ہم اس دنیوی زندگی میں رکھتے ہیں جس کے ساتھ ہم بفضل وتوفیق باری تعالیٰ اس عالم گذران سے کوچ کریں گے یہ ہے کہ حضرت سیدنا ومولانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیّین وخیر المرسلین ہیں جن کے ہاتھ سے اکمال دین ہو چکا اور وہ نعمت بمرتبہ اتمام پہنچ چکی جس کے ذریعہ سے انسان راہ راست کو اختیار کر کے خدا تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے [۲]۔''

نیز حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ مزید فرماتے ہیں:-

''سیّدنا ومولانا سیّد الکل وافضل الرسل حضرت خاتم النبیّین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کون سا درجہ باقی ہے۔ سو واضح ہو کہ وہ ایک اعلیٰ مقام اور برتر مرتبہ ہے جو اُسی ذات کامل الصفات پر ختم ہو گیا ہے جس کی کیفیت کو پہنچنا بھی کسی دوسرے کا کام

۱۔ آئینہ کمالاتِ اسلام تصنیف حضرت مرزا غلام احمد قادیانی ۱۸۹۳ء آخری صفحہ

۲۔ ''ازالۂ اوہام'' ۔ تصنیف حضرت مرزا غلام احمد قادیانی (امرتسر ۱۸۹۱ء) صفحہ ۱۶۹

نہیں چہ جائیکہ وہ کسی اور کو حاصل ہو سکے[1]"

مندرجہ بالا تحریرات کے مصنف حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام اور آپؑ کے پیروؤں کو اس زمانہ کے مسلمانوں نے غیر مسلم قرار دے دیا ہے۔ اور بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ اور آپؑ کے پیروؤں کو غیر مسلم قرار دینے والے خود کیا ہیں؟ اس کا حال اور ان کی ایمانی اور عملی حالت کا نقشہ شاعرِ مشرق علامہ سر محمد اقبال (۱۹۳۸-۱۸۷۵ء) نے اپنی مشہور نظم "جوابِ شکوہ" میں کھینچا ہے[2]۔

ڈاکٹر اقبال نے شاعر، فلسفی، سیاسی مدبّر اور مجموعی لحاظ سے بیسویں صدی عیسوی کے ہندوستانی اسلام کی بہت ہی نمایاں شخصیت ہونے کے باوجود **ایک طرف** تو اس امر کا اقرار کیا کہ اس زمانہ کے مسلمان عملاً اسلام سے اس درجہ دور ہو چکے ہیں کہ بداعمالیوں میں یہود پر بھی سبقت لے گئے ہیں، ان کی اس درجہ بڑھی ہوئی بداعمالیاں دیکھ کر یہود بھی شرما جاتے ہیں اور یہ کہ مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت تو اس درجہ ابتر ہو چکی ہے کہ انہیں اپنے اسلاف کے مدفن تک بیچ کھانے میں کوئی عار نہیں ہے اور **دوسری طرف** انہوں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ مسلمانوں اور احمدیوں میں تفریق کو روا رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے انڈین نیشنل کانگرس (جس پر ہندو چھائے ہوئے تھے) کے معروف لیڈر پنڈت جواہر لعل نہرو کے نام (جو بعد میں آزاد بھارت کے پہلے وزیرِ اعظم بنے) ایک کھلا خط لکھا اور اس میں مطالبہ کیا کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے۔ سیکولر انڈیا کے دستور میں ایسے کسی مطالبہ کی گنجائش کہاں تھی لہٰذا اس مطالبہ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن دیوبندی علماء نے اسے اپنے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ ادھر بھارت میں ہندوؤں نے رام راج کے نام پر آفت ڈھائی ہوئی ہے۔ انہوں نے ایودھیا میں پولیس کی حفاظت میں بابری مسجد پر قبضہ کرنے اور اسے شہید کرنے کے بعد رام جنم بھومی مندر میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہندوؤں کا ایک طبقہ یہ مطالبہ بھی کر رہا ہے کہ بنارس اور کاشی کی مسجدوں کو بھی مندروں میں تبدیل کیا جائے۔ ہندوؤں کا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ بھارت میں مسلم پرسنل لاء (فقہی قوانین) کو کالعدم قرار دیا جائے۔

---

[1] "توضیح مرام" تصنیف حضرت مرزا غلام احمد قادیانی صفحہ ۲۴

[2] تفصیل کے لئے دیکھیں اسی کتاب کا صفحہ ۱۶۰،۱۵۹

جولوگ خدا تعالیٰ کے ماموروں اورامن وآشتی کے شہزادوں کاانکار کر کےان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں اوراپنی اس روش سے باز نہیں آتے انہیں بالآخر ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ناا تفاقی ان میں گھر کر لیتی ہے۔ چونکہ وہ امن میں خلل انداز ہور ہے ہوتے ہیں اس لئے وہ خود امن کی برکات سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ تشدد اور دہشت گردی پھیلانا ان کا شیوہ بن کر رہ جاتا ہے۔

اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح

میرے نزدیک ''اسلامی دہشت گردی'' کی اصطلاح ایک عجیب وغریب اصطلاح ہے۔ نہ معلوم یہ اصطلاح ہے کیا اور یہ کیوں وضع کی گئی ہے۔ اس بارہ میں حیرت کا اظہار بے سبب نہیں ہے اس لئے کہ اسلام اور دہشت گردی میں باہم کوئی جوڑ بنتا ہی نہیں۔ اگر اسلام اور دہشت گردی میں کوئی تعلق ہوسکتا ہے تو اسی نوعیت کا ہوسکتا ہے جس نوعیت کا تعلق روشنی اور تاریکی کے درمیان ہے یا زندگی اور موت کے درمیان ہے یا پھر امن اور جنگ کے درمیان ہے۔ دو متضاد چیزیں یکسر مختلف بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ان معنوں میں ایک دوسرے سے متعلق ہوتی ہیں کہ ایک کا ذکر دوسری کا احساس دلانے کا موجب بنتا ہے۔ اسی طرح اسلام اور دہشت گردی میں بعد المشرقین کے باوجود باہم ایک گونہ تعلق تو ہے لیکن اس تعلق کو قربت یا یکسانیت سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام اور دہشت گردی کا ایک دوسرے سے واسطہ تو پڑتا ہے لیکن یہ اس نوعیت کا ہی واسطہ ہوتا ہے جس نوعیت کا واسطہ دو مخالف اطراف میں موجود ایسے لوگوں کے مابین ہوتا ہے جو ایک دوسرے کے مدّمقابل صف آراء ہوں۔ اسی لئے اسلام اور دہشت گردی باہم متصادم تو ہوسکتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنسی خوشی باہم قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلتے نظر آئیں۔

تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ بہت سے مواقع پر بعض مسلمان ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو دہشت پسند سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کبھی تو افراد کے کسی گروہ کی طرف سے یا مسلمانوں کی اکثریت والے کسی ملک کی طرف سے دہشت گردی کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایسے مسلمانوں کے علاوہ بھی دنیا میں کچھ ایسے گروہ پائے جاتے ہیں جنہوں نے دہشت گردی اور

اسی قسم کی دوسری تخریبی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہیں۔ اب کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اسی اصول کو بروئے کار لاتے ہوئے جس کی بناء پر ''اسلامی دہشت گردی'' کی اصطلاح وضع کی گئی ہے ہر دیگر دہشت گردی کے لئے اسی طرح کی اصطلاح استعمال کی جائے اور اس طرح سکھ دہشت گردی، ہندو دہشت گردی، بدھسٹ دہشت گردی، ارواح پرستانہ دہشت گردی اور لا مذہبیت پر مبنی دہشت گردی کی ایک طویل فہرست معرضِ وجود میں آجائے۔

بدقسمتی سے فی زمانہ دنیا بھر میں قِسم ہا قِسم کی جو دہشت گردی پھیلی ہوئی ہے اور روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے اس سے چشم پوشی آسان نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بزعمِ خود کسی برتر نظریہ یا کسی مقدس مقصد کے نام پر دنیا میں کئے جانے والے ظلم وتشدد، قتل وغارت اور خون خرابے سے بے خبر رہنا کسی بھی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اس زمانہ میں کون ایسا ذی ہوش ہے جس کی حالات پر نظر نہیں۔ بہت ہی دل دوز اور خونیں واقعات ہر روز ہر کسی کے علم میں آتے ہیں اور وہ اگر چاہے بھی تو ان سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ دہشت گردی ایک عالمی مسئلہ کی صورت اختیار کر چکی ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کا وسیع تناظر میں گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے۔

جب تک ہم تشدد اور مار دھاڑ کے پس پردہ کارفرما قوتوں سے پوری طرح آگاہ نہیں ہونگے اس وقت تک ہم اس بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکیں گے کہ بعض مسلم جماعتیں اور مسلم ممالک بھی دوسروں کے دیکھا دیکھی بعض مقاصد کے حصول کی خاطر دہشت گردی کا سہارا کیوں لے رہے ہیں۔ میں پورے غور وفکر کے بعد اس حتمی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آج قریباً ہر قسم کا فرقہ وارانہ تشدد جو دنیا میں کہیں اور کسی بھی شکل میں پایا جاتا ہے اس کی نوعیت لازمی طور پر سیاسی ہے۔ مذہب فی ذاتہٖ کہیں بھی مفاد پرستی کا کردار ادا نہیں کر رہا برعکس اس کے دنیا میں داخلی یا خارجی سیاسی مقاصد کی خاطر خود مذہب کو مفاد پرستی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

مثال کے طور پر نسلی بنیادوں پر پھیلائی جانے والی دہشت گردی ہی کو لے لیں۔ اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس تجزیہ کا آخری نتیجہ یہی نکلے گا کہ اس کی نوعیت بھی لازمی طور پر سیاسی ہی ہے۔ اسی طرح نسبتاً چھوٹے پیمانے پر کی جانے والی دہشت گردی کی مثالیں بھی ملتی ہیں جو مروّجہ سماجی نظاموں

اور ثقافتوں کے خلاف نفرت کی آئینہ دار اور کھلی کھلی بغاوت کی پیداوار ہیں۔ انہیں بالعموم فاترالعقل لوگوں اور لاقانونیت کے علمبرداروں کی کارستانیوں سے تاویل کیا جاتا ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی مثالوں کے علاوہ دہشت گردی کی ایک خاص قسم بھی ہے جس کا تعلق مافیا کی اس پُرتشدد جدّوجہد سے ہے جو اس نے اقتدار پر قبضہ جمانے اور غلبہ حاصل کرنے کے لئے جاری کی ہوئی ہے۔ یہ وہ دہشت گردی ہے جسے مافیا کے مختلف طبقوں نے ایک دوسرے کے خلاف بھی جاری رکھا ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دہشت گردی دراصل حصولِ اقتدار کی جدّوجہد کا ہی حصہ ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً سیاسی ہی ہے۔

جب ہم نام نہاد ''اسلامی دہشت گردی'' پر غور کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس دہشت گردی کے تعلق میں اگرچہ ظاہری طور پر تو نام اسلام کا ہی لیا جارہا ہے لیکن اس کے پس پردہ بعض سیاسی قوتیں اپنی مطلب براری کے لئے مصروف کار ہیں۔ ان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مذہب کی آڑ میں سیاسی فوائد حاصل کریں اور لوگوں کے مذہبی جذبات سے کھیل کر اقتدار پر قبضہ جمائیں اور اسی بہانے اسے مستحکم تر کرتے چلے جائیں۔ پھر نام نہاد اسلامی دہشت گردی کے تعلق میں ایک غور طلب بات یہ ہے کہ اکثر و بیشتر حالتوں میں پسِ پردہ تار ہلانے اور سیاسی فائدے اٹھانے والے خود مسلمان بھی نہیں ہوتے۔ ان کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ خود آگے آئے اور نمایاں ہوئے بغیر مسلمانوں کو دہشت گردی پر اکسائیں اور اس طرح اپنا اُلّو سیدھا کریں۔

اب ہم نام نہاد اسلامی دہشت گردی کی بعض مخصوص مثالوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تاکہ باقاعدہ تشخیص کے ذریعہ اندرونی مرض کا پتہ لگایا جاسکے۔ سب سے پہلے ہم ایران کی مثال لے کر یہ دیکھتے ہیں کہ خمینی ازم کیسے معرضِ وجود میں آیا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ شاہ کے زمانہ اقتدار میں وہاں اقتصادی سرگرمی اور گہما گہمی کا دور دورہ تھا۔ صنعتی اور اقتصادی ترقی کے انتہائی ٹھوس اور کارآمد منصوبوں پر عمل درآمد کے نہایت محتاط اقدامات ملک کے خوش آئند اور درخشندہ مستقبل کی ضمانت دے رہے تھے اور محسوس یوں ہو رہا تھا کہ عنقریب خوشحالی اور فارغ البالی کے ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ لیکن کیا انسان محض روٹی کے سہارے، جو سیری اور سیرابی کی ضامن ہو ہر لحاظ سے ایک مطمئن

زندگی بسر کرسکتا ہے؟ جہاں تک شاہ کے آمرانہ دورِاقتدار میں زندگی بسر کرنے والے ایرانیوں کا تعلق ہے ان کی طرف سے اس سوال کا ایک ہی جواب تھا کہ ''نہیں''۔ وہ ملکی معاملات کو چلانے میں پوری ذمہ داری کے ساتھ حصہ لینے کے متمنّی تھے۔ وہ محض اس بات پر اکتفا کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ انہیں پیٹ بھر کر روٹی ملتی رہے اور ان کی دیگر ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ عزّتِ نفس اور شخصی وقار کی خواہش اور ظلم وتشدد کے ایک انتہائی مربوط نظام سے چھٹکارے کی تمنا نے انہیں مضطرب کر چھوڑا اور وہ حالات میں تبدیلی کی خاطر سب کچھ کر گزرنے پر تُل گئے۔ یہ صورتِ حال اس امر کی آئینہ دار تھی کہ ایک پُرتشدد خونی انقلاب کے لئے زمین پوری طرح ہموار ہوچکی ہے۔

جنونی کیفیت کی حامل جس افراتفری نے ایران کو ہر چہار اطراف میں ایک سرے سے لے کر دوسرے تک ہلا کر رکھ دیا وہ ناگزیر نتیجہ تھی اوّلاً طویل سیاسی گھٹن کا نیز بنیادی انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کی پامالی کا اور ثانیاً وہ نتیجہ تھی ایران کے اندرونی معاملات میں ایک عظیم مغربی طاقت کی مفاد پرستی پر مبنی ناجائز مداخلت کا۔ پورا ملک اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھا کہ شاہ کے آمرانہ دورِاقتدار کو ریاستہائے متّحدہ امریکہ کی پوری پوری تائید وحمایت اور امداد واعانت حاصل ہے۔ اس کے خلاف عوام کا جذبہ حقارت وانتقام کچھ ایسا بھڑکا کہ شاہ کی حکومت اور اقتدار کا تختہ اُلٹنے اور ان اندرونی طاقتوں کو جو کسی نہ کسی رنگ میں بادشاہت کے قیام ودوام کی ذمّہ دار تھیں، ملیامیٹ اور تہس نہس کرنے پر بھی سرد نہ پڑا۔

امریکی حمایت وامداد کا احساس شاہ میں بدترین قسم کے آمرانہ رُجحانات کو ابھارنے کا باعث ہوا تھا۔ شروع شروع میں تو شاہ کے رعب اور دبدبہ نے اپنا اثر جمایا اور لوگ مرعوب ہوئے بغیر نہ رہے لیکن رفتہ رفتہ رعب اور دبدبہ کا منفی اثر ظاہر ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ رُعب نے خوف اور دہشت کی شکل اختیار کرلی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بغاوت کا خدشہ بڑھتا اور نتیجۃً شاہ کا رویہ درشت سے درشت تر ہوتا چلا گیا۔ یہ درشت رویہ رفتہ رفتہ ایران کو ایک پولیس سٹیٹ میں تبدیل کرنے کا موجب بنا۔ یہ بات ایرانیوں کے ذہن نشین ہوتی چلی گئی کہ اس پولیس سٹیٹ کو حکومتِ امریکہ کی بھرپور تائید وحمایت اور امداد واعانت حاصل ہے اور یہ کہ شاہ کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی سی ہے جس کے

تار امریکہ کی پُرکار اور بلا کی متحرّک انگلیوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ یہ چیز ایک دھما کہ خیز صورتِ حال کو جنم دینے کا موجب بنی۔ یہ صورتِ حال ایک ایسے انقلاب کے لئے سازگار تھی جو نفرت وحقارت کی بھسم کر دینے والی آگ کے نتیجہ میں برپا ہوتا ہے۔

اس صورتِ حال کا آیت اللہ خمینی نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اپنے لائے ہوئے انقلاب کو ایک مخصوص رنگ دینے کی غرض سے انہوں نے جو نظریہ پیش کیا وہ شیعہ اسلام سے ماخوذ تھا۔ بعض باتیں اس تعلق میں غور طلب ہیں۔ اوّل یہ کہ کیا یہ شیعہ اسلام کی محبت تھی جو امریکہ کے خلاف نفرت کو بھڑکانے کا موجب بنی یا دیگر وجوہ کی بنا پر امریکہ کے خلاف جو نفرت بھڑک اٹھی تھی اس سے فائدہ اٹھانے کے اصل مقصد کو چھپانے کی غرض سے اسلام کے نام کو ایک ظاہری آڑ اور پردے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا؟ اگر خمینی صاحب نے اسلام کا علم بلند نہ کیا ہوتا تو کیا کسی اور نام پر بھی انقلاب کا برپا ہونا ممکن ہوتا؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اگر خمینی صاحب نے صورتِ حال سے فائدہ نہ اٹھایا ہوتا اور اپنے انقلاب کو اسلامی رنگ نہ دیا ہوتا تو شدید نفرت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اس صورتِ حال سے کسی غیر مذہبی نظریے یعنی نیشنل ازم اور سائنٹیفک سوشل ازم کے بَل پر بھی اسی طرح کامیابی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا اور ان غیر مذہبی نظریات پر مبنی انقلاب برپا کیا جاسکتا تھا؟

اصل بات یہ ہے کہ اُس وقت ایران میں جو قوتیں عوام پر اثر انداز ہورہی تھیں خمینی پہل کرنے میں ان پر سبقت لے گئے۔ اگر دیگر قوّتیں پہل کرنے سے نہ چوکتیں تو خمینی کو مات دے کر اپنا ڈنکا بجانے میں کامیاب ہوجاتیں۔ اسی لئے تو ایران میں صورتِ حال انتہائی پیچیدہ اور گُنجلک نوعیت کی تھی۔ اشتراکیت یا بائیں بازو کے کسی اور فلسفیانہ نظریہ کی مخالفت کو انقلاب برپا کرنے والی قوّتِ محرکہ کا درجہ حاصل نہ تھا۔ یہ درجہ تو شاہ اور اس کے خوشامدیوں کی مخالفت کے جذبۂ بے پناہ کو حاصل تھا اور یہ جذبہ برسرِ کار جملہ قوتوں میں یکساں طور پر موجزن تھا۔ اسی لئے باہم مخالف ومتضاد نظریات کی حامل قوتوں کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ شاہ کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر اس کے اقتدار کی ہر نشانی کو مٹا دیا جائے۔ چونکہ اس امر کا امکان موجود تھا کہ انقلاب کی باگ ڈور خمینی کے ہاتھوں سے نکل کر کہیں بائیں بازو کی قیادت کے ہاتھوں میں نہ چلی جائے اس لئے خمینی صاحب کو پہل کرنے کے

بعد بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنا پڑا۔شاہ کا تختہ اُلٹنے کے بعد انہوں نے نہ صرف سابق شاہ کے تمام حامیوں کو ملیا میٹ کرنے کا بیڑا اٹھایا بلکہ امریکی اثر جہاں جہاں بھی سرایت کر چکا تھا وہ اسے وہاں سے جڑوں سے اکھاڑ پھینکنے پر تُل گئے۔ یہ ایک ایسی مہم تھی جو بائیں بازو کے نظریۂ حیات کے لئے تقویت کا موجب ہوسکتی تھی۔اگر اس نظریۂ حیات کو پنپنے اور پاؤں جمانے کی مہلت مل جاتی تو اس نظریۂ حیات کے حامیوں کے لئے خمینی کے ہاتھوں سے اقتدار کی باگ ڈور چھیننا اور اسلامی نظریہ کی بجائے مارکسزم اور لینن ازم کے جھنڈے گاڑنا چنداں مشکل نہ رہتا۔خوش قسمتی سے خمینی بہت طاقتور اور سمجھدار واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے اسلامی نظریہ کی دو دھاری تلوار کو دائیں بازو کے امریکی نظریہ سیاست کے خلاف ہی نہیں بلکہ بائیں بازو کے روسی نظریۂ سیاست کے خلاف بھی بہت مؤثر طور پر استعمال کیا اور بڑی حد تک کامیاب رہے۔

یوں تو بہت کچھ کہا اور کیا گیا ہے لیکن یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ ایران میں برپا ہونے والے انقلاب میں جس چیز نے رہنمائی کا کام دیا وہ جو کچھ بھی ہو اسے بہر حال اسلام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آپ اگر چاہیں تو زیادہ سے زیادہ اسے خمینی ازم کا نام دے سکتے ہیں۔ وہ قوّتیں جو ایرانی انقلاب میں پسِ پردہ کارفرما ہیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہرگز بھی مذہبی نہیں ہیں۔ یہ سب سیاسی قوتوں کا کیا دھرا ہے جنہوں نے کمال ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے سیاسی مقاصد کے حصول کی غرض سے شاہ کے خلاف ایرانیوں کے ردّعمل سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا ہے اور خوب خوب ہاتھ رنگے ہیں۔

بیرونی طاقتوں کے ہاتھوں زک اٹھانے اور غلامی کے جال میں پھنسنے کے خلاف ایرانیوں میں جو شعوری جذبہ پیدا ہوتا رہا ہے اس کی تاریخ بہت طویل زمانہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ ایرانیوں کی بہت غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ صدیوں پہلے اپنی ارض وطن کے عربوں کے قبضہ میں جانے کے دکھ کو فراموش نہیں کر سکے ہیں اسی لئے اس بارہ میں درگزر سے کام لینے کی طرف وہ مائل نہیں ہیں۔ بظاہر تو شکست اور مغلوبیت کے زخم بہت زمانہ پہلے مندمل ہو گئے تھے اور نظر یہی آتا تھا کہ مذہب کے اشتراک اور دوسرے ممالک کے خلاف دشمنی کے مشترکہ جذبہ نے عربوں اور ایرانیوں کے باہم

شیر و شکر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چند صدیوں تک ایران پر عربوں کے تسلّط کے خلاف ایرانیوں میں بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت اندر ہی اندر اپنا اثر دکھاتی رہی ہے اور ہنوز دکھاتی چلی آ رہی ہے۔ پھر اس امر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ ظہور اسلام سے قبل ایران کو تہذیب و تمدن کے ایک عظیم گہوارے کی حیثیت حاصل تھی اور اس کی یہ برتر و اعلیٰ حیثیت اُس کے لئے بجا طور پر باعث فخر تھی۔ ایرانی تہذیب ان تہذیبوں میں سے ایک عظیم تہذیب تھی جنہوں نے کرّۂ ارض کے مختلف حصوں میں آباد نوعِ انسانی پر اپنے اثرات کے بہت گہرے نقوش ثبت کئے۔ ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کے نزدیک دنیا دو عظیم خطوں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے مغربی خطہ سلطنتِ روما کے زیرِ تسلط تھا اور مشرقی خطہ پر ایران کے کسریٰ حکمران تھے اور دور دور تک ان کی حکمرانی کا سکّہ بیٹھا ہوا تھا۔ اہل ایران کے لئے اپنے اس درجہ شاندار ماضی کی یادیں اگرچہ اسلامی اخوت کے زبردست اثر کی وجہ سے خاصی حد تک دھندلا گئی تھیں لیکن کلی طور پر وہ محو نہیں ہو سکیں۔ ان کا مخفی اثر ہمیشہ جاری رہا ہے بالخصوص ایرانی دانشوروں کے قلوب و اذہان پر ماضی کی عظیم ایرانی تہذیب کے سائے ہمیشہ پڑتے اور اپنا اثر دکھاتے رہے ہیں۔

ایرانیوں اور عربوں کی باہمی لڑائیوں اور بالخصوص عرب علاقوں میں ایرانیوں کی انتقامی یلغاروں نے عربوں کی آئندہ نسلوں کے ذہنوں پر بہت برے اور تکلیف دِہ اثرات مرتّب کئے اور دلوں پر ایسے گہرے زخم لگائے کہ وقت اور زمانہ اپنی تمام تر اندمالی خاصیتوں کے باوجود انہیں پورے طور پر مندمل نہیں کر سکا۔ فطرتِ انسانی کی رو سے ایسا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ بسا اوقات دنیا میں انسانوں کے لئے ماضی سے اپنا تعلق منقطع کرنا اور خاص طور پر عزت نفس کو مجروح کرنے والے بیتے ہوئے واقعات کو فراموش کرنا بہت مشکل ہو جایا کرتا ہے۔ تاریخ کے ایسے تکلیف دِہ ابواب کبھی مستقلاً بند نہیں ہوا کرتے بلکہ مختلف اوقات میں بار بار کھلتے رہتے ہیں۔

عربوں اور ایرانیوں کے مابین ماضی بعید میں ہونے والے جھگڑوں اور ان کے اثرات کے ذکر کے بعد اب ہم دورِ جدید یعنی ماضی قریب اور زمانۂ حال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ باہمی تعلقات میں اتار چڑھاؤ اور ناہمواری کی کیفیت ایرانیوں کے عربوں کے ساتھ تعلقات تک ہی محدود

نہ تھی بلکہ بعد ازاں ان کے انگریزوں کے ساتھ تعلقات اس سے بھی زیادہ ناہمواری اور اس کے برے اثرات سے دوچار رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران برطانوی فوجوں کے ہاتھوں ایرانیوں کو انتہائی بھیانک قسم کے جبر وتشدد سے دوچار ہونا پڑا۔ جہاں تک عربوں کے ساتھ مخاصمت کا تعلق ہے اس میں مشترکہ ثقافت اور مشترکہ مذہبی رشتہ مسلسل صحت مندانہ اثر ڈال کر تلافی اور اندمال کی راہیں استوار کر دیا کرتا تھا۔ برخلاف اس کے برطانوی تسلط کے زمانہ میں انگریز حاکموں اور ایرانی محکوموں کے درمیان اختلاف اور بغض وعناد کی خلیج تنگ ہونے کی بجائے وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ دونوں کے درمیان کوئی ایسی معاشرتی، ثقافتی یا مذہبی یکسانیت بھی نہ تھی جو دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں پُل کا کام دے سکتی۔

برطانوی تسلط کے زوال پذیر ہونے کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوا جس میں بڑی طاقتوں نے اپنے پٹھوؤں اور کٹھ پتلی حکومتوں کے ذریعہ تیسری دنیا کے ملکوں پر بالواسطہ اپنا تسلّط جمانے اور انہیں اپنے قابو میں رکھنے کی طرح ڈالی۔ اس طرح ایک نئے رنگ کی سامراجیت معرض وجود میں آئی۔ نئی سامراجیت کے اس دور میں ایران، برطانیہ کی سرپرستی اور تسلط میں تو نہ رہا لیکن چارو ناچار وہ چلا گیا امریکہ کی سرپرستی اور تسلط میں۔ اس کے نتیجہ میں جس نئے دور کا آغاز ہوا اس میں شاہِ ایران امریکی سامراج کے ایک مہرے اور نشان کے طور پر منظرِ عام پر آیا۔ اس نئی سامراجیت کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ بیک وقت باہم متضاد نظریات کی حمایت کر کے اوران میں عمداً ٹکراؤ کی کیفیت پیدا کر کے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے میں لگی رہتی تھی۔ آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ چنانچہ پولینڈ، نکاراگوائے، اسرائیل اور جنوبی افریقہ کی مثالیں اس پر شاہد ناطق ہیں۔

نفرت وحقارت کا وہ جذبہ جو خمینی کے لائے ہوئے انقلاب سے یکدم بھڑک اٹھا تھا وہ صرف امریکی ظلم وتشدد ہی کی پیداوار نہ تھا بلکہ وہ تیل اور گیس کے زیرِ زمین پوشیدہ خزائن کی طرح صدیوں سے دلوں کی گہرائیوں میں اکٹھا ہو رہا تھا۔ یہ بات خاص طور پر سمجھنے اور نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یکدم بھڑک اٹھنے والا نفرت وحقارت کا یہ جذبہ اپنی اصل کے لحاظ سے ہرگز بھی مذہبی نہ تھا اور نہ مذہب نفرت وحقارت کو پھیلانے کا موجب ہوا کرتا ہے۔ یہ مفاد پرست لوگ ہی ہوا کرتے ہیں جو کبھی

مذہب کے نام پر اور کبھی کسی اور نام پر اپنی اپنی مطلب براری کے لئے دلوں میں پنپنے والی نفرت سے فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔ اگر خمینی نے اسلام کے نام پر اس نفرت سے اپنی مطلب براری کے لئے فائدہ نہ اٹھایا ہوتا تو یقیناً ایران کا کوئی کمیونسٹ لیڈر آگے آ کر سماجی انصاف کے نام پر اس سے فائدہ اٹھا لیتا اور وہاں کمیونسٹ انقلاب برپا کر دکھاتا۔ الغرض برپا ہونے والے انقلاب کو مذہبی یا غیر مذہبی جو نام بھی دیا جاتا اس کے پسِ پردہ کارفرما عوامل ایک ہی ہوتے ان میں سرِمو کوئی فرق نہ آتا۔ یہ تو ان عوامل کے بروئے کار آنے پر صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے والے پر منحصر ہوتا کہ وہ کس مذہبی یا غیر مذہبی نام پر انقلاب برپا کرتا ہے۔

میں نے ان لوگوں کو جو خمینی کی خود اپنے ہی لوگوں کے خلاف زیادتیوں اور دوسرے ملکوں میں کی جانے والی انتقامی کارروائیوں کو اسلامی قرار دیتے ہیں، بارہا توجہ دلائی ہے کہ اسلام کا بحیثیت مذہب ایرانی بے اطمینانی کے انتقامی مظاہرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اہلِ مغرب کو تو ایک لحاظ سے آیت اللہ خمینی کو اپنا دشمن سمجھنے کی بجائے اپنا محسن سمجھنا چاہیے کیونکہ صورتِ حال ایسی بن چکی تھی کہ اگر آیت اللہ خمینی نے اس صورتِ حال سے مطلب براری کے رنگ میں فائدہ نہ اٹھایا ہوتا اور اپنے حامی ملاؤں کے گروہ کو ملک پر مسلّط کرنے کے لئے اسے اسلامی رنگ نہ دیا ہوتا تو لازماً بائیں بازو کی طرف رجحان رکھنے والے ایرانی لیڈر صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر کمیونسٹ انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ وہی ایران جو آج ہمیں سرخی مائل سبز نظر آتا ہے پھر وہ ہمیں تمام تر سرخ نظر آ رہا ہوتا۔ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ایران کی کمیونسٹ قیادت جسے ڈاکٹر مصدق نے پروان چڑھایا تھا شاہ کی معزولی کے وقت اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ ایرانی تاریخ کے اس موڑ پر کوئی مؤثر اور انقلابی کردار ادا کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیونسٹ لیڈر شپ اس وقت بھی بڑی منظم اور تربیت یافتہ تھی اور وہ موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے پر تول رہی تھی۔ اگر آیت اللہ خمینی موقع سے فائدہ اٹھانے میں سبقت نہ لے جاتے تو انجام کار ایران میں کٹر مارکسسٹ حکومت قائم ہوئے بغیر نہ رہتی۔ ایسی صورتِ حال مشرقِ وسطیٰ پر تباہ کن اثرات مرتّب کرنے کا موجب بنتی کیونکہ یہ پورا خطّہ تیل کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود فوجی لحاظ سے بہت کمزور ہے۔ اس لحاظ سے خمینی انداز کا

اسلام مغرب والوں کو کتنا ہی قابلِ نفرین کیوں نہ نظر آئے انہیں تو اسے اپنے لئے باعثِ رحمت قرار دینا چاہیے۔ جسے وہ اپنے لئے خطرہ سمجھ رہے تھے اس میں ان کے لئے ایک رحمت پوشیدہ تھی۔ انہیں اپنا نقطۂ نظر بدل کر آیت اللہ خمینی کے کردار کو اس تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

ہوسکتا ہے کہ موضوع زیر بحث سے ایران عراق جنگ کا کوئی تعلق نظر نہ آئے لیکن دنیائے اسلام کے بعض حصوں میں جو دھماکہ خیز واقعات رونما ہو رہے ہیں ان کی اصلیت اور نوعیت کو سمجھنے میں اس جنگ سے بہت کچھ روشنی اور رہنمائی حاصل ہوسکتی ہے۔ دونوں ملک اس امر کے دعویدار ہیں کہ وہ مسلمان ہیں اور علی الاعلان اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے، ایک دوسرے کو تباہ کرنے اور ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کی جملہ کارروائیوں میں اسلام کے مقدس نام سے ہی رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور یہ کہ وہ اسی کی عطا کردہ روشنی میں آگے قدم بڑھاتے ہیں۔

میدانِ جنگ میں عراق کے جتنے سپاہی بھی مارے گئے عراقی ذرائع ابلاغ نے انہیں شہید قرار دے کر ان کی عظمت کے ترانے گائے اور جو ایرانی عراقیوں کے ہاتھوں مارے گئے انہیں ڈنکے کی چوٹ کافر قرار دیا گیا اور بقول عراقی ذرائع ابلاغ وہ سب جہنم رسید ہوئے۔ اُدھر سرحد پار ایران میں کھیت رہنے والے ایرانی فوجیوں کے حق میں اور عراقی فوجیوں کے خلاف ایسی ہی کتھا سنائی جاتی رہی۔ جب میدانِ جنگ میں گولی لگنے سے کوئی عراقی سپاہی مارا جاتا تھا تو ایرانی فوجوں کی طرف سے میدانِ جنگ اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھتا تھا اور اگر گولی ایرانی سپاہی کو لگتی اور وہ مارا جاتا تو عراقی فوجی اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان کرتے۔ دنیا حیران تھی کہ طرفین میں سے اسلام کس کے ساتھ ہے اور کس کے ساتھ نہیں ہے؟ کس کے نعرے اصلی ہیں اور کس کے کھوکھلے؟ ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہوکر جو چیز ثابت ہوتی اور ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایرانی اور عراقی سپاہی جنہوں نے اپنی اپنی جگہ ایک مقدّس مشن کی خاطر میدانِ جنگ میں جانیں قربان کیں دونوں ہی اپنی اپنی لیڈر شپ کے فریب میں آئے ہوئے تھے۔ دونوں ہی طرف کے نعرے کھوکھلے تھے۔ اسلام نہ اس طرف تھا نہ اُس طرف۔

قرآن مجید کا فرمان ہے:-

(ا) اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ ۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۔ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ؕ وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۔ (الحج:۳۹تا۴۱)

اللہ یقیناً ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لائے ہیں ان کا دفاع کرتا رہے گا۔ اللہ یقیناً ہر خیانت کرنے والے اور انکار کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ وہ لوگ جن سے بلا وجہ جنگ کی جارہی ہے اُن کو بھی جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے، اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اُن کے گھروں سے صرف ان کے اتنا کہنے پر کہ اللہ ہمارا ربّ ہے بغیر کسی جائز وجہ کے نکالا گیا اور اگر اللہ کفار میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ سے شرارت سے باز نہ رکھتا تو گرجے اور یہودیوں کی عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے برباد کردیئے جاتے اور اللہ یقیناً اس کی مدد کرے گا جو اس کے دین کی مدد کرے گا۔ اللہ یقیناً بہت طاقتور اور غالب ہے۔

(ب) کُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَھَا اللّٰہُ ۙ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ۔ (المائدۃ:۶۵)

جب کبھی بھی انہوں نے لڑائی کے لئے کسی قسم کی آگ بھڑکائی ہے تو اللہ نے اسے بجھا دیا ہے اور وہ ملک میں فساد کے لئے دوڑے پھرتے ہیں اور اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔

(ج) وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ ۚ فَاِنْ

فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَ اَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ۔ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَ اَخَوَیۡکُمۡ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ۔(الحجرات: ۱۰،۱۱)

اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں میں صلح کرا دو۔ پھر اگر صلح ہو جانے کے بعد ان میں سے کوئی ایک، دوسرے پر چڑھائی کرے تو سب مل کر اس چڑھائی کرنے والے کے خلاف جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے تو عدل کے ساتھ ان دونوں لڑنے والوں میں صلح کرا دو اور انصاف کو مدِّ نظر رکھو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومنوں کا رشتہ آپس میں صرف بھائی بھائی کا ہے۔ پس تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان جو آپس میں لڑتے ہوں صلح کرا دیا کرو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

جنگ کے دوران دونوں ہی متحارب قوموں (عراق اور ایران) نے قرآن مجید کی مندرجہ بالا تعلیمات کو نظر انداز کیا اور وہ ان تعلیمات کی صریح خلاف ورزی کی مرتکب ہوئیں۔

مکہ میں سالانہ حج کے موقع پر ایران کی طرف سے حج پر آنے والے مسلمانوں کی وساطت سے خمینی انداز کے انقلاب کا پیغام باقی اسلامی دنیا تک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ بدقسمتی سے یہ کوششیں بعض اوقات بہت ہی ناروا اور ناگوار واقعات پر منتج ہوئیں۔ یہ واقعات دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے بے حد پریشانی اور فکرمندی کا باعث ہوئے۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۷ء کے حج کے موقعہ پر مکہ میں جو کچھ ہوا اور صورتِ حال کے مقابلہ کے لئے سعودی عرب کی حکومت نے دو انتہائی نوعیت کے اقدام کئے مغربی ذرائع ابلاغ نے انہیں خوب اچھالا لیکن برخلاف اس کے قرآنِ مجید تمام مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے:-

وَ لَا تُقٰتِلُوۡهُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوۡکُمۡ فِیۡهِ ۚ فَاِنۡ قٰتَلُوۡکُمۡ فَاقۡتُلُوۡهُمۡ ؕ کَذٰلِکَ جَزَآءُ الۡکٰفِرِیۡنَ۔ (البقرة: ۱۹۲)

اور تم ان سے مسجد حرام کے قرب و جوار میں اس وقت تک جنگ نہ کرو جب تک وہ خود تم سے اس میں جنگ کی ابتداء نہ کریں اور اگر وہ وہاں بھی تم سے جنگ کریں تو تم بھی انہیں قتل کرو۔ ان کافروں کی یہی سزا ہے۔

اُدھر ان تمام بڑی طاقتوں نے جو اسرائیل کی کھلم کھلا یا پوشیدہ طور پر مدد کر رہی ہیں (اور ان میں امریکہ خاص طور پر بہت پیش پیش ہے) خمینی اور خمینی ازم سے کچھ کم فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے خمینی کے لئے کوئی چارہ کار نہ رہنے دیا سوائے اس کے کہ وہ ایران عراق جنگ کو طول دے اور دیتا چلا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جنگ نے مسلم دنیا کی توجہ اس کانٹے (یعنی اسرائیل) کی طرف سے ہٹا کر جو ان کے پہلو میں چبھا ہوا ہے اور جس کی چبھن سے مسلسل ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں یکسر ایک نئے مسئلہ کی طرف پھیر دی۔ ایک بیرونی دشمن کی دشمنی کا احساس تو مٹ کر رہ گیا اُلٹا ہوا یہ کہ خود مسلمانوں میں باہم بدظنّی اور بے اعتمادی کی فضا پنپنے لگی۔ اور ہوتے ہوتے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں ایسا نفاق پڑا کہ وہ ایک دوسرے سے پھٹ کر رہ گئے۔ اسرائیل کا خطرہ ایک معمولی اور بے حیثیت خطرہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کے بالمقابل مسلمانوں کے ایک طبقہ کے لئے دوسرے طبقہ کے خوف نے اس قدر اہمیت اختیار کر لی اور اس میں اس قدر شدت پیدا ہوگئی کہ ہر بیرونی دشمن کا اصلی یا خالی خوف نگاہوں سے اوجھل ہوئے بغیر نہ رہا۔ دو مسلمان ملکوں کے درمیان جنگ کی صورت میں سادہ مزاج سپاہی کو مغالطہ دینے کے لئے اکثر و بیشتر دونوں طرف یہ نعرہ لگتا رہا کہ اسلام خطرے میں ہے۔ دراصل عراق اور ایران کے مابین جنگ کے دوران جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا اس کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ عرب و عجم کا قدیمی بغض و عناد پھر عود کر آیا تھا۔ کفر و اسلام کی باہمی آویزش یا شیعہ سنی مناقشہ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ یہ عرب و عجم کے مابین ہزاروں سال پرانے تنازعات کے اعادہ کا ہی کرشمہ تھا جو زمانۂ دراز سے دَبے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عرب بھی جو پہلے عراق اور سعودی عرب سے نالاں رہتے تھے ایران کے بالمقابل عراق کی حمایت میں پیش پیش نظر آنے لگے۔ اُس وقت ایران کے بڑھتے ہوئے خطرے اور چیلنج کے بالمقابل عربوں کے لئے اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کا سوال اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایک طرح سے

ان کے لئے زندگی اور موت کو مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔

ظہورِ اسلام سے پہلے خود عربوں کے مابین معمولی معمولی باتوں پر جنگیں چھڑ جایا کرتی تھیں اور پھر وہ اس قدر طول پکڑ جایا کرتی تھیں کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھیں۔ اسلام نے آ کر ان جنگوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے انہیں باہمی اخوت کے ایک ایسے رشتہ میں باندھ دیا جو باہمی دشمنیوں، اونچ نیچ اور تفریق کے ہر امکان سے مبرّا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا ترک کر دیا تو وہ جو پہلے بھائی بھائی تھے پھر ایک دوسرے کے دشمن بن گئے اور قبائلی لڑائیاں پھر پوری شدت کے ساتھ عود کر آئیں۔ پس آج دنیائے اسلام میں جن مناقشات نے سر اٹھایا ہوا ہے اور یہ مناقشات جو گُل کھلا رہے ہیں ان کا اسلام سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں اسلام کی طرف منسوب کرنا یا اصل کے اعتبار سے انہیں اسلامی قرار دینا ہرگز بھی درست نہیں ہے۔ یہ تو قرونِ وسطیٰ کی جاگیردارانہ ذہنیت اور رجحانات کے ازسرِ نو احیاء کا معاملہ ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اس بارہ میں اسلام کو درمیان میں لانا حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

بڑی طاقتوں نے کہنے کو تو عراق ایران جنگ کی مذمّت کی اور بار بار مطالبہ کیا کہ فریقین جنگ بند کر دیں اور خون خرابے سے باز آ جائیں لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بڑی طاقتیں خود عراق اور ایران دونوں کو مسلسل ہتھیار مہیا کر رہی تھیں اور جو خون خرابہ ہو رہا تھا اس کی خود ذمّہ دار تھیں۔ جنگی ہوائی جہاز، راکٹس، میزائلز، توپیں، ٹینک، بکتر بند گاڑیاں نیز دیگر تباہ کن ہتھیار دونوں متحارب قومیں بے دریغ استعمال کر رہی تھیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ تباہ کن ہتھیار خود ان متحارب قوموں کے اپنے اپنے ملک میں تو نہیں بن رہے تھے۔ مشرقِ وسطیٰ کے تیل اور مغربی ہتھیاروں کے مابین علی الاعلان یا درپردہ ساز باز ہوئی جس کے نتیجہ میں جنگ کی آگ بھڑکی اور بھڑکتی ہی چلی گئی۔ آخری تجزیہ کی رو سے جنگ کی آگ کو اُس تیل نے ہی بھڑکایا جسے عراق اور ایران پیدا کر رہے تھے اور وہ اس طرح کہ مغرب و مشرق کی غیر مسلم طاقتوں نے ان متحارب قوموں کے تیل کو ہتھیاروں میں تبدیل کر کے جنگ کی آگ کیلئے ایندھن فراہم کیا۔ جہاں تک مغربی طاقتوں کا تعلق ہے ان کے لئے یہ ہرگز بھی خسارہ کا سودا نہ تھا۔ انہوں نے پرانے اور متروک ہتھیاروں کے عوض دھڑا دھڑ تیل خریدا۔ اس سے زیادہ فائدہ مند

تجارتی سودا اور لین دین بھلا اور کیا ہوسکتا تھا۔ ان طاقتوں نے دو مسلمان ملکوں کو باہم لڑا کر ان کا تو کچومر نکال کر رکھ دیا اور خود دونوں ہاتھوں سے ان کی دولت سمیٹ سمیٹ کر اپنی تجوریاں بھر لیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس جنگ کے دوران مسلمان اپنے سب سے بڑے دشمن اسرائیل کو فراموش کر بیٹھے۔ اُلٹا ہوا یہ کہ مسلمان مسلمان کا گلا کاٹتا اور اس کا خون بہاتا رہا۔ اسلامی دنیا کا تیل خود اسلامی دنیا کی اقتصادیات کو نذرِ آتش کرنے اور اسے تباہ و برباد کرنے میں بے محابا استعمال ہوا۔ گزشتہ ایک صدی کے دوران محنتِ شاقہ کے ثمر کے طور پر جو اقتصادی ترقیاں حاصل ہوئی تھیں کالعدم ہو کر رہ گئیں۔ جہاں تک ترقی اور خوشحالی کا تعلق ہے آگے بڑھنے اور پیشقدمی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے ایران اور عراق وقت کی رفتار کے برعکس پیچھے کی طرف دوڑنے لگے اور نتائج و عواقت کی پرواہ کئے بغیر اندھادھند پیچھے کی طرف دوڑتے ہی چلے گئے۔

یہ تو صحیح ہے کہ تمام جنگوں کے اقتصادی ترقی، مادی اور انسانی وسائل، ثقافتی پیش رفت اور صنعت و حرفت پر تباہ کن اثرات مترتب ہوتے ہیں اور ایک طرح سے سب کئے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے، ترقی یافتہ ممالک ہوں یا ترقی پذیر دونوں ہی جنگ کی تباہ کاریوں سے بری طرح متاثر ہوتے ہیں، لیکن ترقی یافتہ ممالک پر جنگ کے تباہ کن اثرات کی نوعیت ترقی پذیر ممالک کے مقابلہ میں قدرے مختلف ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں جنگی صنعت کو خود ملکی وسائل اور اتحادیوں کے وسائل کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے اس لئے تباہی کے باوجود جنگی صنعت کی رفتارِ ترقی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنگ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں، بے پناہ دباؤ اور تنازع للبقا میں پیدا ہونیوالی شدّت ان بڑے ممالک کے وسائل کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اُن کے سائنسی اور ٹیکنیکل علم میں اضافہ کی رفتار پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے اور وہ اس میدان میں دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں ٹیکنیکل علوم اور مہارت میں جو بے پناہ اضافہ ہوتا ہے اس کو جنگ کے فوراً بعد اقتصادیات کو بحال کرنے اور ہر شعبہ زندگی میں قوم کے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس طرح جنگ کے تباہ کُن اثرات کو مٹانے کی راہ بآسانی ہموار کی جاسکتی ہے۔ اسی لئے ترقی یافتہ ملکوں کے لئے تباہ کن

جنگیں سائنسی اور صنعتی ترقی کے میدانوں میں نئے تعمیری نظریات کو جنم دینے اور تعمیر و ترقی کی نئی راہیں کھولنے کا موجب بنتی ہیں۔ لہٰذا طویل جنگوں کے نتیجہ میں ترقی یافتہ قومیں بھی مالی کمزوری کا شکار تو ہوتی ہیں لیکن وہ ساتھ کے ساتھ نئے نئے علوم سے مالا مال ہونے کے باعث ایک بہتر مستقبل تعمیر کرنے کی پوزیشن میں ہوتی ہیں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کے بالمقابل جو قومیں سائنسی اور اقتصادی پسماندگی کا شکار ہونے کے باوجود جنگوں میں کودنے کی عیاشی مول لیتی ہیں انہیں بالکل اور ہی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کے سامنے ایک ہی راستہ ہوتا ہے کہ اپنا سب کچھ بیچ کر داؤ پر لگا دیں۔ پھر اسی پر بس نہیں وہ سائنسی اور صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں سے جنگی ساز و سامان کی مسلسل بہم رسانی کے سمجھوتے کر کے اپنے مستقبل تک کو ان کے پاس رہن رکھ دیتے ہیں۔ اگر پسماندہ قومیں ایک دفعہ جوش میں آنے کے بعد ذرا ہوش سے کام لیں اور اس طرح مکمل تباہی کو خود دعوت نہ دیں تو تیسری دنیا میں لڑی جانے والی کوئی جنگ نہ تو اتنا طول پکڑے جتنا کہ عراق ایران جنگ نے پکڑا اور نہ وہ اتنے تباہ کن اثرات کی حامل ہو جتنی تباہ کن اثرات کی حامل یہ جنگ ثابت ہوئی۔ یہ قومیں جنگ کے دوران ایک دوسرے کے خلاف جس وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرتی ہیں اور جس کی لپیٹ میں کبھی کبھی دوسرے ملک بھی آجاتے ہیں اس کی ذمّہ داری ان قوموں کو بھی قبول کرنی چاہیے جو انہیں ہتھیار اور اسلحہ مہیّا کرتے ہیں اور اس طرح جنگ کی آگ کو بھڑکاتے اور اسے طول دینے کا موجب بنتے ہیں۔

اب جبکہ عراق ایران جنگ کے بارہ میں سب کچھ کہا اور کیا جا چکا ہے یعنی تمام واجب الادا قرضوں کا تصفیہ ہو چکا ہے اور تبادلہ کی جانے والی اشیاء کا شمار بھی کر لیا گیا ہے، اس امر پر بھی غور کرنا مناسب ہوگا کہ آخر کار اس جنگی مخاصمت میں فائدہ کس نے اٹھایا اور نقصان میں کون رہا۔ یہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ اس جنگ کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مغرب میں اسلام کو ایک وحشیانہ مذہب قرار دے کر اس کی مذمّت کی جارہی ہے اور کہا یہ جارہا ہے کہ اسلام نعوذ باللہ دہشت گردی کا علمبردار ہے، عدم رواداری اور نفرت کی تعلیم دیتا ہے اور خود اپنے متبعین کو مخالف و متحارب کیمپوں میں تقسیم کر کے انہیں ایک دوسرے کا دشمن ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیتا ہے۔ خود دو

متحارب مسلمان قوموں (ایران و عراق) کے طرزِ عمل کی روشنی میں اس سرتا پا غلط پراپیگنڈے پر حیرت کا اظہار بے محل ہے۔ اس کے علاوہ بعض اضافی فائدے بھی ہیں جو ان قوموں ہی کو پہنچتے ہیں جو خود جنگ کی منصوبہ بندی کرتی ہیں، اسے عملی جامہ پہناتی ہیں اور مسلم امہ کے متحارب حصوں کو تباہی پھیلانے والے آلات مہیا کرتی ہیں۔

طرفہ تماشہ یہ ہے کہ گزشتہ دہائی میں مغربی ذرائع ابلاغ نے ''اسلامی دہشت گردی'' کی اصطلاح کے علاوہ اسی طرح کی ایک اور عجیب و غریب اصطلاح بھی وضع کی ہے اور وہ ہے ''اسلامی ایٹم بم'' کی اصطلاح۔ پاکستان پر الزام یہ لگایا جا رہا ہے کہ اس کے پاس یہ بم موجود ہے۔ بات یہی ہے کہ جو مغربی ذرائع ابلاغ ''اسلامی دہشت گردی'' کی سراسر غلط اور دور از کار اصطلاح وضع کر سکتے ہیں ان کے ''زرخیز'' دماغوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ ''اسلامی ایٹم بم'' کی اصطلاح بھی وضع کر کے اسے زیادہ سے زیادہ ہوا دیتے اور پھیلاتے۔ اس لحاظ سے تو ہوسکتا ہے کہ جنگ کے دوران ہلاکت پھیلانے والے مختلف ہتھیاروں اور نت نئے طریقوں کے ساتھ ''اسلامی'' کا سابقہ لگا کر اور قتل و غارت گری کے خود اپنے ایجاد کردہ تمام پہلوؤں کو اسلام کی طرف منسوب کر کے مغربی ذرائع ابلاغ کی طرف سے اسے مزید بدنام کرنے کا سلسلہ چل نکلے لیکن سوال یہ ہے کہ اسی انداز پر مسیحی ایٹم بم، ہندو ایٹم بم، نسلی مغائرت کا ایٹم بم یا شنٹو بم وغیرہ کا تذکرہ کیوں سننے میں نہیں آتا؟ عجیب بات یہ ہے کہ ہزاروں مذہبی بموں کا تذکرہ چھیڑنے کے امکان کے باوجود مغربی ذرائع ابلاغ نے صرف ایک مذہبی بم کو چنا ہے اور اس کے خلاف آواز بلند کر کے زمین و آسمان کے قلابے ملانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اور وہ ہے ان کا مزعومہ ''اسلامی ایٹم بم'' حالانکہ مسیحی اور یہودی ایٹم بموں کے مقابلہ میں جن کا وجود حتمی اور یقینی ہے اس مزعومہ ''اسلامی ایٹم بم'' کا وجود سرے سے ہی مشکوک اور غیر یقینی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی ملکوں میں تشدّد پر یقین رکھنے والے جو عناصر برسرِ کار ہیں وہ اپنے طرزِ عمل کے لحاظ سے حقیقی معنوں میں اسلامی ہیں ہی نہیں۔ تاہم سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب بھی اسلامی ملکوں میں بعض عناصر دہشت پھیلانے والی تخریبی سرگرمیوں میں ملوث

پائے جاتے ہیں تو صرف انہیں ہی مذہبی قرار دے کر اسلامی دہشت گرد کیوں ظاہر کیا جاتا ہے جبکہ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے دہشت گرد بھی دنیا میں موجود ہیں اور ان کے دہشت گردی کے واقعات اکثر و بیشتر سننے میں آتے رہتے ہیں۔ وہ طاقتیں جو ایران اور عراق کو مسلسل ہتھیار مہیا کر کے ان کے مابین جنگ کو طول دینے کے ذمّہ دار ہیں وہ جان و مال کے بے انداز ضیاع اور اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والے ناقابلِ بیان مصائب کی ذمّہ داری سے کیسے بچ سکتی ہیں۔ ان کے اپنے درپردہ مقاصد کچھ ہی ہوں وہ اپنی اس روش سے خمینی ازم کو تقویت پہنچانے میں اور اس کے زیادہ لمبا عرصہ تک زندہ رہنے میں اس کی مدد و معاون ہی ثابت ہوں گی۔ اگر متحارب ملکوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا اور انہیں اپنے محدود وسائل پر انحصار کرنے دیا جاتا تو خمینی ازم کا زوال و انحطاط بہت پہلے ہی شروع ہو جاتا۔

دوسری چیزوں کے علاوہ عراق ایران جنگ نے قومیت کے جذبہ کو بھی بہت تقویت پہنچائی ہے جس نے ایرانیوں کی توجہ کو داخلی مسائل سے ہٹا کر اسے ایک خارجی اور بیرونی دشمن کی طرف پھیر دیا ہے۔ اب اگر ایران میں زیادہ شکوک و شبہات نہ پھیلیں اور وہ خمینی ازم کے لئے ایک کھلے چیلنج اور بغاوت کی شکل اختیار نہ کریں تو یہ امر باعث تعجب ہوگا۔ ایران کے اندر انقلاب کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے اور اس کے مثبت و منفی پہلوؤں کو جانچنے کا زبردست رجحان پیدا ہو چکا ہے۔ ہر چند کہ ملک میں ممتاز مقام رکھنے والے اہل افراد کے ایک بڑے حصہ کا صفایا ہو چکا ہے پھر بھی جو دانشور زندہ بچ رہے ہیں وہ لازماً موجودہ انقلاب سے حاصل ہونے والے فوائد اور پہنچنے والے نقصانات کا ازسرِ نو جائزہ لینے پر مجبور ہوں گے۔ اس لحاظ سے ایران میں ایک نئے نظام کے قیام کی طرف حرکت کے فوری آثار کا نمودار ہونا بعید از امکان نہیں ہے۔

جنگ کے دوران ایرانیوں کے لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ عوام کا حوصلہ بلند رہے اور قوّتِ مقاومت میں کمی نہ آنے پائے۔ اس ضرورت کو جنگ کی آگ کو زیادہ سے زیادہ بھڑکانے کے ذریعہ پورا کیا گیا۔ جب ایرانیوں کا حوصلہ جواب دے جائے گا تو نتیجۃً غیر یقینی صورتِ حال کا پیدا ہونا ناگزیر ہوگا۔ موجودہ برسرِ اقتدار طبقہ کی بجائے خواہ بائیں بازو والے آگے آئیں یا دائیں بازو والے،

یا بین بین چلنے والے باقی ماندہ افراد آگے آنے کی کوشش کریں، غلبہ پانے اور آگے آنے کے لئے جنگِ زرگری کا چھڑنا یقینی بن جائے گا۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ جنگِ زرگری کا انجام کیا ہوگا اور یہ کہ ایران کے لئے ابھی اور کیا کچھ دیکھنا مقدر ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ایران میں حالات کیا رُخ اختیار کریں گے وہی علاّم الغیوب ہے۔ میں اہلِ ایران کے لئے صرف دعا ہی کر سکتا ہوں کہ ان کے مصائب و مشکلات کا دور جلد ختم ہو۔ ان کے لئے ایک نئے اور پُر امن دور کا آغاز ہو اور وہ ان کے لئے حقیقی خوش حالی کا دور ثابت ہو۔ اہلِ ایران بہت بہادر ہیں۔ قدرت نے انہیں اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ماضی میں بھی انہوں نے اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھائے ہیں اور اب بھی اٹھا رہے ہیں۔ ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ حالیہ دور میں دکھ اٹھانے کے سوا ان کے ہاتھ اور کچھ نہیں آیا۔ میری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ان پر رحم فرمائے اور جملہ مصائب و مشکلات سے انہیں نجات بخشے۔ آمین

اب ہم ایران میں آیت اللہ خمینی کے لائے ہوئے انقلاب کے ایک اور پہلو کی طرف آتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف ایرانی مسلمانوں کے اندازِ زیست کو بدلنے کا بیڑا اٹھایا بلکہ اس عزم کا بھی اظہار کیا کہ وہ ہمسایہ ملکوں میں بھی ایسا ہی انقلاب لانے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ انہوں نے دنیائے اسلام پر یہ بات بھی واضح کی کہ وہ فلسطینیوں کی مدد کرنے اور اسرائیلی فوجوں کو شکست دینے کی جدّو جہد میں زیادہ مضبوط اور موثر کردار ادا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان ممالک اور اسرائیل میں سے کوئی بھی اپنے ہاں ایرانی انقلاب کو خوش آمدید کہنے پر آمادہ نہ تھا اس لئے پُر امن اور قانونی ذرائع سے مسلم ممالک میں ایرانی انقلاب کو منتقل کرنا ممکن نہ ہو سکا اور ایران کو اس بارہ میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ فلسطین کے معاملہ میں وہ ایک حد تک کامیابی سے ضرور ہمکنار ہوئے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی واضح کر چکا ہوں علاقہ میں کی جانے والی دہشت پسند سرگرمیاں (خواہ وہ اسلام کے خلاف کی گئی ہوں یا مغربی طاقتوں کے نمائندوں کو ان کا نشانہ بنایا گیا ہو) اسلام کی رو سے درست قرار نہیں دی جا سکتیں کیونکہ اسلام دہشت پسند سرگرمیوں کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ ان سرگرمیوں کو اگر سند جواز عطا کی تھی تو صرف اور صرف ایرانی انقلاب کے فلسفہ نے عطا کی تھی۔

مسلم ممالک میں عسکری قوت اور طاقت کے استعمال کے تذکرے اکثر سننے میں آتے

ہیں۔قبل اس کے کہ ہم یہ سمجھیں کہ تشدد کے استعمال کا یہ انوکھا تصور ہے کیا حالات کا احتیاط سے تجزیہ کرنا ضروری ہے تقریباً تمام مسلمان ملکوں کے ملّاؤں میں تنگ نظری اور عدم رواداری کی طرف رجحان بہت بڑھ رہا ہے اور اس کے زیر اثر تشدد آمیز طرزِ عمل بہت زیادہ مقبول ہوتا جا رہا ہے۔اس کی ذمہ داری سعودی عرب کے کندھوں پر عائد ہوتی ہے۔وہ اپنے آپ کو پوری مسلم دنیا کا مرکز بنانے میں کوشاں ہے اور اس نے مذہب کی آڑ میں اپنے اثر ورسوخ کو وسعت دینے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ چونکہ اسے اسلام کے مقدس ترین شہروں (مکہ اور مدینہ) کا متولی ہونے کا منفرد اعزاز حاصل ہے اس لئے یقیناً وہ اس پوزیشن میں ہے کہ وہ اس صورتِ حال سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر اپنی اہمیت اور اپنے اثر ورسوخ کو زیادہ سے زیادہ وسعت دینے کی کوشش کرے۔

سعودیوں کے مذہبی فلسفہ کا ماخذ وہابیت ہے اور وہابیت وہ تحریک ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک کے محبت ومودت کے آئینہ دار اسلام سے بڑھ کر زمانۂ وسطیٰ کے غیر روادارانہ اسلامی تصورات پر مبنی ہے۔سعودی اثر ورسوخ کا پھیلاؤ مرہون منت ہے تیل کی آمدنی سے حاصل ہونے والی بے انداز دولت کا اور دنیا بھر کے بنکوں میں جمع شدہ بے حدو بے حساب سرمائے کا۔ سعودی عرب کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اپنے بے حدّ و بے حساب سرمائے سے اسے جو سود حاصل ہوتا ہے اس کا ایک حصہ وہ مسلمان ملکوں کو مالی امداد فراہم کرنے پر خرچ کرتا ہے لیکن اکثر و بیشتر یہ امداد ان ملکوں کی بیمار معیشت کو سنبھالا دینے پر خرچ نہیں کی جاتی بلکہ یہ خرچ کی جاتی ہے مسجدوں کی تعمیر اور ایسے دینی مدارس کے قیام پر جن پر سعودی چھاپ کے عالم تیار ہو کر نکلیں اور سعودی اثر ورسوخ کو پھیلانے اور وسعت دینے کی خدمت سرانجام دیں۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی آپ کو سعودی امداد پانی کی طرح بہتی نظر آئے گی وہاں آپ مسلمان ملاّؤں کے تنگ نظری اور عدم رواداری پر مبنی رویے اور طرزِ عمل کو خوب پنپتا اور پھلتا پھولتا دیکھیں گے۔ جب عیسائی دنیا ان تنگ ملاّؤں کو غیر اسلامی اقدار کی مذمت کرتے اور غیر مسلم حکومتوں کے خلاف جہاد جہاد کا شور ڈالتے دیکھتی ہے تو وہ یہ سمجھ بیٹھتی ہے کہ ان ملاّؤں کی جہاد! جہاد! کی پکار جلد ہی حالت جنگ میں تبدیل ہو کر ایک بھیانک روپ دھار لے گی لیکن ان

کے اس تصور کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا کیونکہ عملاً جو کچھ دیکھنے میں آتا ہے وہ اس تصور سے یکسر مختلف ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمان ملاّں غیر مسلم طاقتوں کی مکمل تباہی کا راگ بہت الاپتے ہیں اوران کی طرف سے جہاد! جہاد! کا شور بھی بہت سننے میں آتا ہے لیکن اس تعلق میں جب وہ غیر اسلامی طاقتوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد مسیحی، یہودی، بدھسٹ یا ناستک طاقتوں سے نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی دانست میں بعض مسلمان فرقوں کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں جو ان کے نزدیک مسلمان کہلانے کے باوجود غیر مسلم شمار کئے جانے کے قابل ہوتے ہیں۔ ملاّؤں کے نظریہ کے مطابق ان کے اپنے فرقے کے سوا تمام دوسرے مسلمان فرقے اپنی ماہیت کے اعتبار سے غیر مسلم ہوتے ہیں یا وہ ایسے عقائد کے حامل ہوتے ہیں جو بقول ان کے انہیں اللہ اوراس کے مقبول بندوں کے غیظ وغضب کا نشانہ بننے کا اہل بنانے والے ہوتے ہیں۔ اللہ کے مقبول بندوں سے ان کی مراد وہ خود اوران کے ہمنوا ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں غیر مسلم اسلام کے اصل دشمن نہیں ہیں بلکہ بقول ان کے اصل دشمن تو خود دنیائے اسلام کے اندر موجود بعض مخصوص مسلمان فرقے ہیں۔ ایک مسلمان فرقہ کے افراد کی طرف سے جب جنگجویانہ رجحانات کا اظہار ہوتا ہے تو ان کا رخ غیر مسلموں سے کہیں زیادہ دوسرے مسلمان فرقوں کے افراد کی طرف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرف سے مرتد کی سزا قتل کے مزعومہ عقیدے پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ یہ ان کا ایک بہت ہی مہلک ہتھیار ہے اُن مسلمانوں کے خلاف جو کسی ملک کی مسلمان اکثریت کے عقائد سے قدرے مختلف عقائد رکھنے والے ہوں۔ ایسے فرقوں کے افراد کو موت کی سزا دو مرحلوں میں دی جاتی ہے۔ پہلے مرحلہ میں ان کے عقائد کو غیر اسلامی عقائد قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ مرتدوں کے زمرے میں شمار کئے جانے کے سزاوار ہوجاتے ہیں۔ دوسرے مرحلہ میں اس امر پر زور دے کر کہ مرتد کی سزا قتل ہے انہیں قتل کئے جانے کا سزاوار ٹھہرایا جاتا ہے۔ ہر غیر جانبدار مبصر اس امر سے اتفاق کرے گا کہ یہ بڑھتا ہوا جنگجویانہ رجحان خود مسلمانوں میں فساد کے بیج بونے اور گڑبڑ پھیلانے کا موجب بنا ہوا ہے نیز یہ کہ یہ رجحان ہی ایک فرقہ کے ماننے والوں کے دلوں میں دوسرے فرقہ کے ماننے والوں کے خلاف انتہائی شدید نفرت پھیلانے کا اصل ذمّہ دار ہے۔

جہاں تک غیر مسلم طاقتوں کا تعلق ہے وہ بہر طور مطمئن رہیں کہ فی زمانہ اسلامی دنیا کے نام نہاد جنگجویانہ رجحانات سے انہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے اور اس طرف سے وہ بالکل محفوظ ہیں۔ اس کے ثبوت کے لئے مغربی ملکوں اور بالخصوص امریکہ کے ساتھ سعودی عرب کے تعلقات و روابط پر نگاہ ڈالنا ہی کافی ہے۔ اس بات کا تصور ہی ممکن نہیں کہ سعودی عرب اور اس کے زیرِ اثر ممالک امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی کبھی خواب میں بھی جرأت کر سکتے ہیں۔ سعودی نظامِ حکومت کی بقا کا سو فیصد انحصار امریکہ پر ہے۔ حکمران خاندان کی قریباً تمام کی تمام دولت امریکن بنکوں اور مغربی دنیا کے دوسرے بنکوں میں جمع ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ داخلی اور خارجی تحفظ کے لئے سعودی عرب کا امریکہ پر انحصار اس قدر ظاہر و باہر اور اظہر من الشّمس ہے کہ اس بارہ میں مزید کچھ کہنے کی حاجت ہی نہیں۔ مذکورہ بالا یہ دو عوامل ہی اس بات کی ضمانت کے لئے کافی ہیں کہ نہ تو خود سعودی عرب اور نہ اس کے زیرِ اثر اس کا کوئی اتحادی مسلم ملک مغرب کے غیر مسلم ممالک کے لئے خطرہ کا باعث ہو سکتا ہے۔ مزید برآں فی زمانہ مسلم ممالک میں سے کوئی ایک ملک بھی جنگی ساز و سامان کی تیاری میں خود کفیل نہیں ہے۔ ہر مسلمان ملک اپنی دفاعی اور دیگر جنگی ضروریات کے لئے مغرب یا مشرق کی کسی نہ کسی بڑی طاقت کا سہارا ڈھونڈنے اور اس پر انحصار کرنے پر مجبور ہے۔ یہ حقیقت بھی اس امر کی کافی سے زیادہ ضمانت ہے کہ غیر مسلم طاقتوں کے ساتھ ان مسلمان ملکوں کے تعلقات پُرامن بقائے باہمی کے ہی آئینہ دار نہیں ہیں بلکہ باہمی تحفظ کے احساس کو بھی اجاگر کرنے والے ہیں۔ یہی اصول لیبیا اور شام ایسے ممالک پر بھی صادق آتا ہے جن کے تعلقات مغربی ملکوں کی نسبت مشرقی طاقتوں کے ساتھ زیادہ دوستانہ اور فراخ دلانہ ہیں۔

کوئی ایک شخص بھی جسے جدید اندازِ جنگ کی تھوڑی بہت بھی سمجھ ہو ایسا نہیں ملے گا کہ جو اس نام نہاد اسلامی عسکری قوت کو مغربی طاقتوں کے لئے کسی لحاظ سے بھی خطرے کا باعث قرار دے سکے۔ البتہ ان بڑھتے ہوئے رجحانات سے ایک نوع کا خطرہ ضرور لاحق ہے اور اس کے بارے میں بعض لوگوں کا فکر مند ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ اسلامی عسکری قوّت سے وہ خطرہ خود عالمِ اسلام کو لاحق ہے بلکہ صرف لاحق ہی عالم اسلام کو ہے۔ یہ نجی نوعیت کا ایک ایسا خطرہ ہے جو خود عالمِ اسلام کے اندر

کی طرف جھانک رہا ہے اور ہر جگہ مسلمانوں کے اپنے امن کو برباد کر رہا ہے۔ آج عالم اسلام میں جس عدم رواداری، تنگ نظری، تنگ دلی اور تعصب کا دور دورہ ہے اس نے عالم اسلام کے امن کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔ افسوس! صد افسوس!!

مجھے اس حقیقت کا احساس ہے کہ اپنے محدود و مخصوص معنوں کی رو سے ''دہشت گردی'' کا لفظ ایسے افعال کے لئے بولا جاتا ہے جو خوف دلانے اور دہشت پھیلانے والے ہوں جیسے بموں کے دھماکے اور ان سے متعلق واقعات وغیرہ۔ لیکن میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ دہشت گردی کے لفظ کو صرف ایسے افعال و واقعات تک محدود سمجھا جائے۔ میرے نزدیک جب بھی بعض حکومتوں کی طرف سے خود اپنے اہل ملک کی مخالفانہ آواز کو دبانے کے لئے ظالمانہ اقدامات کئے جائیں تو ایسے ناروا اقدامات کو بھی دہشت گردی کے مفہوم میں شامل سمجھنا چاہیے اور ان کی بھی دیگر نوعیّتوں کی دہشت گردی کی طرح وسیع پیمانے پر پُرزور اور بھرپور مذمت ہونی چاہیے۔ میں حکومتوں کے تمام ایسے ظالمانہ اقدامات کو جو وہ خود اپنے ہی اہل ملک کے دائیں یا بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے افراد یا طبقوں کے خلاف کرتی ہیں بدترین قسم کی دہشت گردی سمجھتا ہوں۔ جب دہشت گردی کی کارروائیاں دوسرے ملکوں کی حکومتوں کے خلاف روا رکھی جاتی ہیں اور جگہ جگہ کئے جانے والے دھماکوں اور ہوائی جہازوں کے اغوا کی شکل اختیار کرتی ہیں تو ایسے واقعات کی طرف ہر کوئی توجہ دیتا ہے اور ان کی مذمت کرتا ہے۔ انتہائی سنگدلی کی آئینہ دار ایسی دہشت گردی کے جو لوگ شکار ہوتے ہیں عالمی رائے عامہ ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے اور اسے کرنا بھی چاہیے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ زبانی ہمدردی پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ آئندہ ایسے واقعات کے اعادہ کو روکنے والے تعمیری اقدامات کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے مؤثر ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ صحیح اور درست ہے اور ایسا کرنا ازبس ضروری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ سینکڑوں اور ہزاروں لوگ جو خود اپنی ہی سخت گیر اور بے رحم حکومتوں کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کر رہے ہیں کسی شمار قطار میں ہیں؟ کیا کسی نے ان کے دکھوں اور اذیتوں کے ازالہ کے لئے کچھ سوچا ہے؟ ان کی دکھ بھری چیخ و پکار شاذ کے طور پر ہی ملک کے باہر سنی جاتی ہے۔ ان کی احتجاج بھری آوازوں کو سنسر شپ

کے انتہائی سخت اقدامات کے ذریعہ دبا دیا جاتا ہے۔ اگر ایمینسٹی انٹرنیشنل اور فلاح عامہ کے دیگر بین الاقوامی ادارے ظلم وتشدّد، تعذیب وتعذیر اور حقوقِ انسانی کے برملا اتلاف کے ایسے اندوہناک واقعات کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہیں تو عالمی حکومتوں کی طرف سے ایسے واقعات کی بہت نرم لہجے میں مذمت کی جاتی ہے اور پھر اس کے بعد اس امر کے باوجود کہ ظلم بدستور جاری رہتا ہے، بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ کوئی اس طرف دھیان نہیں دیتا کہ مداوا کی کوئی صورت نکالی جائے۔ ایسے واقعات کو بالعموم متعلقہ ممالک کے اندرونی معاملات سمجھ کر نظر انداز کرنے کے بعد یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ ایسے مظالم کو دہشت گردی قرار دینے کی بجائے اُلٹا انہیں ایسا رنگ دیا جاتا ہے جس سے وہ دہشت گردی کو دبانے والی مساعی شمار ہو سکیں اور اس طرح دنیا کو یہ باور کرایا جا سکے کہ امن وامان کو برقرار رکھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ یہ روش بجائے خود ظلم کی پشت پناہی کے مترادف ہوتی ہے۔

میں پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ حکومتوں کے ایسے جملہ تعزیری اقدامات جو وہ عوامی سطح پر مقبول تحریکوں یا متوقع طور پر زور پکڑنے والی مخالفت کو دبانے اور اس کا گلا گھونٹنے کے لئے کرتی ہیں ہرگز بھی قانونی اقدامات نہیں ہوتے۔ اکثر صورتوں میں حکومتیں ایسے اقدامات جائز قانونی حدود میں رہ کر نہیں بلکہ انہیں عمداً توڑ کر اور ان سے تجاوز کر کے ہی بروئے کار لاتی ہیں۔ یہ اقدامات جلد ہی ایسے متشدّد اور ظالمانہ افعال کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن کا مقصد خود اپنے ہی لوگوں کے غیر مطمئن اور شاکی لوگوں کے دلوں میں دہشت بٹھانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اسی لئے حکومتوں کے ایسے اقدامات کو دہشت گردی کے زمرہ میں شامل کرنا ازبس ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نوع انسانی نے حکومتی سطح پر کی جانے والی اس دہشت گردی کے ہاتھوں عمومی تخریب کاری اور اغوا وغیرہ کے تمام تر واقعات سے کہیں بڑھ کر دکھ اٹھائے اور ظلم سہے ہیں۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ ہر قسم اور ہر نوع کی دہشت گردی کی مذمت کرتا ہے۔ وہ کسی بھی قسم کی دہشت گردی (وہ کسی فرد یا گروہ کی طرف سے کی جائے یا خود حکومتوں کی طرف سے ہو) کے جواز کا قائل نہیں ہے۔ دہشت گردی جس نوع کی بھی ہو اس کے نزدیک بہرحال قابل مذمت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلامی دنیا میں بعض اضطراب زدہ خطّے ہیں۔ وہاں کے بعض حلقے، تنظیمیں اور حتیٰ کہ بعض حکومتیں بھی دہشت گردی، تشدد اور تخریب کاری میں ملوث نظر آتی ہیں۔ فلسطین، لبنان، لیبیا اور شام کے بارہ میں اکثر اس نوعیت کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ دہشت گردی کے تعلق میں جن لوگوں کا ذکر آتا ہے اکثر مذہباً مسلمان ہی ہوتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ سارے کے سارے ہی مسلمان ہوں۔ مثال کے طور پر فلسطینیوں میں بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے اسرائیل کے خلاف دہشت گردانہ سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا عہد باندھا ہوا ہے لیکن مذہباً وہ ہیں عیسائی۔ کم علمی یا سہل پسندی کی وجہ سے مغربی ذرائع ابلاغ ان سب کو ہی اسلامی دہشت گرد کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح لبنان میں مسلمان دہشت گرد بھی ہیں اور عیسائی دہشت گرد بھی ہیں، پھر اسرائیلی ایجنٹس اور سپاہی بھی ہیں۔ یہ سب انسانی حسیات کو خوف زدہ کرنے والی دہشت پسند سرگرمیوں میں ملوث رہے ہیں لیکن لبنان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے تعلق میں آپ یہودی یا مسیحی دہشت گردی کا تذکرہ کبھی نہیں سنیں گے۔ تشدّد کے تمام واقعات کو اکٹھا کر کے اور انہیں ایک لپٹے لپٹائے پیکٹ کی شکل دے کر اور اس پر ''اسلامی دہشت گردی'' کا لیبل لگا کر دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

جہاں تک سلمان رشدی کا تعلق ہے کوئی صحیح الدّماغ شخص جو حقیقی علوم قرآنی سے کسی حد تک بہرہ ور ہو امام خمینی سے اس امر میں اتفاق نہیں کر سکتا کہ اس کے خلاف سزائے موت کا فتویٰ اسلامی احکام پر مبنی ہے۔ قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں گستاخی کی ایسی کسی سزا کا نام و نشان نہیں ملتا۔ جہاں تک خدا تعالیٰ کی شان میں گستاخی کا تعلق ہے اس کا ذکر قرآن مجید کی درج ذیل آیت میں آتا ہے:-

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام:۱۰۹)

ترجمہ: -اور تم انہیں جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں گالیاں مت دو، نہیں تو وہ دشمن ہو کر جہالت کی وجہ سے اللہ کو گالیاں دیں گے۔

اس سے بھی ظاہر ہے کہ کسی شخص کو یہ اختیار نہیں دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کی

کسی کو کوئی سزا دے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہودی حضرت مسیح علیہ السلام کی والدہ حضرت مریمؑ کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہوئے تھے اس کا ذکر قرآن مجید نے درج ذیل آیت میں کیا ہے:-

وَ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا۔(النساء:۱۵۷)

ترجمہ:-''نیز ان کے کفر کے سبب سے نیز ان کے مریم پر ایک بہت بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے''۔

یہاں بھی سوائے اس سزا کے جو خدا تعالیٰ خود دے گستاخی کی کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی۔

یہ امر افسوسناک ہے کہ امام خمینی نے ایسا فتویٰ دے کر اسلام کا دفاع کرنے کی بجائے غیر ارادی طور پر اسلام کو بدنام کیا ہے اور اس طرح آزاد دنیا میں اسلام کے مقدس نام کو بٹہ لگانے کا موجب ہوئے ہیں۔

جامعہ ازہر قاہرہ کی جامع مسجد کے امام صاحب پہلے ہی امام خمینی کے فتویٰ کو خلافِ شرع قرار دے چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے شیعہ مسلمان بھی ایسے ہیں جو اس معاملہ میں امام خمینی سے متفق نہیں ہوں گے۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس بارہ میں اصل مسئلہ کو نظر انداز کرنا انصاف کے منافی ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں یہ سراسر نامناسب ہے (اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض سیاستدانوں اور عالموں نے ایسا ہی کیا ہے) کہ سلمان رشدی کی بجائے صرف امام خمینی کو برا بھلا کہا جائے حالانکہ سلمان رشدی وہ شخص ہے جس نے انتہائی مبتذل اور گری ہوئی زبان میں ایک ایسی کتاب لکھی ہے جو دنیا بھر کے کروڑوں کروڑ مسلمانوں کے لئے دل آزاری اور قلبی اذیّت کا موجب ہوئی ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں اس کتاب نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان پائی جانے والی پُرامن فضا کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اور جیسا کہ قومی اخبارات میں شائع ہونے والے خطوط کے تبصروں سے اندازہ ہوتا ہے اس نے نسلی عدم رواداری کا پَٹ کھول کر کچھ کم قیامت نہیں ڈھائی ہے۔

یہ بات پورے طور پر واضح ہو جانی چاہیے اور اس بارہ میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہنا

چاہیے کہ میں دہشت گردی کا خواہ وہ کسی قسم اور نوعیت کی ہو ہرگز بھی حامی نہیں ہوں۔ ایک دہشت گرد خواہ کسی بھی رنگ و نسل اور مذہب سے اس کا تعلق ہو اور اس کا مقصد بظاہر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو وہ بہرحال قابلِ مذمّت ہے۔ اسلام کسی بھی نوع کے فساد کو پسند نہیں کرتا اسی لئے اسلام اور دہشت گردی میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہے۔

کرنل قذافی تیل سے حاصل ہونے والی دولت کے بل پر جس منظم دہشت گردی کے حامی و موید ہیں بھلا مذہب سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اسی طرح ماضی میں شام جس قسم کی دہشت گردی میں ملوث رہا ہے اس کی مذہبی حیثیت کیا ہے؟ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اسلام اور سائنٹیفک سوشل ازم میں مابہ الامتیاز کیا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ کرنل قذافی کی ''گرین بُک'' (سبز کتاب) صرف بیرونی جلد کی حد تک ہی سبز رنگ کی ہے؟ جہاں تک کتاب کے مندرجات کا تعلق ہے وہ از اوّل تا آخر ''سرخ'' ہیں۔

اگر ایران یا لیبیا کے بنیاد پرست مسلمانوں کی دہشت پسند سرگرمیوں کو ''اسلامی دہشت پسندی'' کے نام سے موسوم کیا جائے تو ان کے اسلام کا رنگ سیاہی مائل سبز قرار پائے گا یعنی ان کا مذہب اسلام اور کمیونزم کا عجیب وغریب آمیزہ ہوگا۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ اسلام کی کوئی بھی تصوراتی شکل خود اس کی اپنی شکل سے بنیادی طور پر مختلف کیسے ہوسکتی ہے؟ حیرت اس بات پر ہے کہ اسلام بیک وقت سبز بھی ہو اور سرخ بھی، یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر اور کچھ نہیں تو لیبیا کی دہشت گردی کو بھیس بدلی ہوئی قوم پرستانہ دہشت گردی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں کیوبا کے فیدل کاسترو FIDEL CASTRO یاد آئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ ظلم وتشدد اور قوم پرستانہ دہشت گردی کی دوڑ میں کرنل قذافی سے بہت آگے بلکہ ان کے پیشرو ہیں۔ لیکن ایسا کبھی سننے میں نہیں آیا کہ کسی نے ان کی دہشت گردی کو ''مسیحی دہشت گردی'' قرار دیا ہو۔

بات میں سے بات نکلتی ہے۔ دہشت گردی کی بحث کے دوران تاریخ کے بہت سے پہلو افقِ ذہن پر ابھرے بغیر نہیں رہتے۔ خود عیسائیت ہی کو لے لیں وہ ظلم وتشدد اور تعزیر وتعذیب کے آئینہ دار افعال میں ملوّث رہی ہے۔ بعض عیسائی بادشاہ تو اس گمراہ کن خیال کے پیش نظر کہ وہ

دین مسیحی کی خدمت کر رہے ہیں ظلم وتشدد اور تعزیر وتعذیب کے وحشیانہ افعال کا بے دریغ ارتکاب کرتے رہے۔ کیا ''بلیک ڈیتھ'' کے زمانہ (۴۹-۱۳۴۸ء) میں بہت سے یہودی اپنے گھروں میں زندہ نہیں جلا دیئے گئے تھے؟ سپین میں بے دینی کے خاتمہ کی مہم کے دوران بعض عیسائی پادریوں کی انگیخت پر اور انہی کی ہدایت ورہنمائی میں خوف اور دہشت کا ایک طویل دور مسلّط رہا جس میں کسی کی بھی جان محفوظ نہ تھی۔ مختلف اوقات میں بہت سی بے بس اور لاچار عورتوں کو جادوگرنیاں قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور کہا یہ گیا کہ جادو اور جادوگروں سے نمٹنے کا یہی مسیحی طریق ہے۔

اگرچہ ظلم وتشدد کے ایسے بہت سے واقعات کا عیسائیت سے براہ راست تعلق تھا اور اسی کے ایماء ومنشاء کے مطابق ظلم وتعدی کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انسانیت کے خلاف یہ جرائم ایک ایسے تاریک دور کی پیداوار تھے جس میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ آخر وہ وقت کب آئے گا کہ جب انسان ایک شخص کے کردار واعمال اور اس کے مذہب کے درمیان فرق کرنا سیکھے گا؟ اگر کوئی شخص ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کرنے کا مرتکب ہوتا ہے اور مذہب کو اس کے پیروکاروں کے عمل وکردار کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر بہت سے سوالات کا پیدا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ ہر مذہب کے ماننے والوں کا طرزِ عمل تو ملک بہ ملک، قریہ بہ قریہ اور زمانہ بہ زمانہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا چلا آیا ہے حتیٰ کہ بسا اوقات ایک شخص کا طرز عمل دوسرے شخص کے طرزِ عمل سے مختلف ہوتا ہے۔

کس قدر مختلف تھا مسیح علیہ السلام کے حواریوں کا عمل چلی کے پنوشے PINO CHEY یا جنوبی افریقہ کے حکمرانوں کے عمل سے۔ حالانکہ موخر الذکر بھی مسیح علیہ السلام کے حواریوں کی طرح اپنے دعوے کی رو سے مسیحی اقدار ہی کے علمبردار ہیں۔ اب ان دونوں میں سے مسیحیت کا ترجمان کس کو مانا جائے؟ کیا ہم اس بات کے مجاز ہیں کہ ہم پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کو جن میں لاکھوں آدمی مارے گئے انسانیت کے خلاف مسیحی جنگیں قرار دیں؟ صرف دوسری عالمی جنگ کے دوران ہی اکیلے روس کو جس جانی نقصان سے دوچار ہونا پڑا وہ اسکٹھ لاکھ نفوس سے متجاوز تھا۔ اُس جنگ میں بوسنیا کی مجموعی آبادی کا تین چوتھائی حصہ صفحۂ ہستی سے نابود ہو گیا، منقولہ اور غیر منقولہ جائیدادوں کی شکل میں جو

مالی نقصان ہوا وہ اس قدر زیادہ تھا کہ اس کا اندازہ لگانا ممکن ہی نہیں ہے۔ کیا اس درجہ بے حد وحساب نقصان کو مسیحیت کی عملی کارگزاری شمار کیا جائے یا پھر ہم مسیحیت کی قدر و قیمت اور عظمت کو ان ابتدائی مسیحیوں کے عمل و کردار کی روشنی میں پرکھیں جو ایک گال پر تھپڑ کھا کر مارنے والے کے سامنے اپنا دوسرا گال بھی پھیر دیا کرتے تھے۔ یہ ابتدائی مسیحی کون تھے؟ وہی جنہیں درندوں کے سامنے زندہ پھینک کر موت کے منہ میں دھکیل دیا جاتا تھا یا جنہیں ان کے گھروں سمیت زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ ان مصائب کو ان کے لئے جھیلنا آسان تھا لیکن یہ امر بے حد مشکل تھا کہ وہ تشدّد کا جواب تشدّد سے دیں۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے تو میں مسیحیت کی قدر و قیمت اور عظمت کو پرکھنے کے لئے ابتدائی مسیحیوں کے عمل و کردار کا ہی انتخاب کروں گا۔

یہ عجیب انصاف ہے کہ اگر کوئی مسلمان جنگ کرے تو مغرب میں اسے اسلامی دہشت گردی کا شاخسانہ قرار دیا جاتا ہے لیکن جب کسی اور ملک میں جنگ و جدال کی کیفیت رونما ہو تو اسے سیاسی تنازعہ قرار دے کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ آج کے اس ترقی یافتہ زمانہ میں آخر عدل کا یہ دہرا معیار کیوں رائج ہے اور اس کی وجہٗ جواز کیا ہے؟ ہر شخص حیرت زدہ ہو کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا کرسچین سویلیزیشن (مسیحی تہذیب) کی بظاہر پُرسکون سطح کے نیچے اسلام کے خلاف نفرت وحقارت کا لاوا کھول رہا ہے؟ کیا یہ سب کچھ مسلمان طاقتوں کے خلاف صدیوں پرانی مسیحی جنگوں کا ہی ایک نیا روپ ہے یا پھر یہ مستشرقین کی وہی پرانی زہر آلود شراب ہے جسے نئے پیالوں میں ڈال کر پیش کیا جا رہا ہے؟ یہ نظریہ کہ اسلام کو (نعوذ باللہ) تلوار کے زور سے پھیلایا گیا انتہائی غلط اور قابل اعتراض ہے۔ مسلمان حکومتوں کی جنگوں کو سیاست اور بین الاقوامی روابط کے مسلمہ اصولوں کے مطابق پرکھنا چاہیے نہ کہ مذہبی تعصب کی بنیاد پر۔

تشدد کا بار بار پھوٹ پڑنا اس امر کی علامت ہے کہ معاشرہ اس مریض کی طرح ہے جو بیک وقت متعدد امراض کا شکار ہو۔ آج مسلم دنیا حیران و پریشان اور سرگردان ہے کہ کس طرف رخ کرے اور کس سمت میں پناہ تلاش کرے۔ عوام بہت سے امور کے بارہ میں مطمئن نہ ہونے کے باعث بے چینی اور بے اطمینانی کا شکار ہیں لیکن یہ وہ امور ہیں جن پر ان کا سرے سے کوئی کنٹرول

نہیں ہے۔ وہ اپنے بدعنوان لیڈروں یا بیرونی طاقتوں کے ایجنٹوں اور پٹھوؤں کے ہاتھوں میں مردہ بدست زندہ کے مصداق ایک کھلونے کی طرح ہیں۔ وہ چاہیں تو انہیں اپنے ساتھ لئے پھریں اور چاہیں تو زمین پر پٹخ دیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ بہت سے مسلمان ملکوں کے لیڈر جب ظلم وتشدد پر اترتے ہیں تو اپنے ظالمانہ اقدامات کے حق میں سند جواز اسلام ہی میں سے ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کے زمانہ اقتدار میں ہوا۔ خونریز انقلابات اسلامی فلسفۂ حیات کے لئے بالکل اجنبی ہیں۔ اس مخصوص فلسفۂ حیات پر چلنے والے اسلامی ملکوں میں ایسے انقلابات کے لئے پاؤں جمانے کی کوئی جگہ نہیں ہوسکتی۔

ایک مذہبی آدمی ہونے کی حیثیت میں اور ایک ایسی جماعت کا روحانی سربراہ ہونے کی حیثیت میں جس کے متبعین ایک صدی تک دہشت گردی اور ظلم وتشدد کا نشانہ بنے رہے ہیں میں ہر قسم اور ہر نوع کی دہشت گردی کی انتہائی پُرزور مذمّت کرتا ہوں کیونکہ اس بات پر میرا پختہ ایمان ہے کہ صرف اسلام ہی نہیں بلکہ کوئی بھی سچا مذہب خواہ اس کا کوئی بھی نام ہو خدا کے نام پر بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو تشدد کا نشانہ بنانے اور ان کا خون بہانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

خدا سراپا محبت ہے، خدا امن ہی امن ہے۔
محبت سے کبھی نفرت جنم نہیں لے سکتی۔
اور امن کبھی جنگ کی طرف دھکیلنے کا موجب نہیں بن سکتا۔

اشاریہ

مذہب کے نام پر خون

مرتّبہ: نور اللہ خان مربی سلسلہ

آیات قرآنیہ

سورۃ البقرۃ

سورۃ آل عمران

سورۃ النساء

سورۃ المائدۃ

سورۃ الانعام

سورۃ الاعراف

سورۃالتوبۃ

سورۃیونس

سورۃیوسف

سورۃالنحل

سورۃالکہف

سورۃمریم

سورۃالحج

سورۃالشعراء

سورۃالاحزاب

سورۃالصافات

سورة الزمر

سورة المومن

سورة محمد

سورة الحجرات

سورة الذّٰريٰت

سورة النجم

سورة الممتحنة

سورة المنافقون

سورة الدهر

سورة المطففين

سورة البروج

سورة الاعلٰى

سورة الغاشية

سورة العصر

سورة الكافرون

احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

احادیث بالمعنی

اسماء

آ،ا

ب۔پ۔ت۔ث

ج ۔ چ ۔ ح ۔ خ

د۔ڈ۔ذ۔ر۔ز

س۔ش۔ص۔ض

ف۔ق۔ک۔گ۔ل

ن۔و۔ہ

مقامات

آ-ا-ب-پ-ت

ج۔چ۔ح۔خ۔د۔ذ۔ر۔ز

س۔ش۔ط۔ع۔غ

ف۔ق۔ک۔گ

ل۔م

کتابیات

کتب احادیث

صحیح بخاری ۸۹، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۹۸، ۲۰۹، ۲۳۷، ۲۴۸
صحیح مسلم ۲۰۸، ۲۰۹
صحیح مسلم مع شرح النووی ۲۰۹
جامع ترمذی ۱۹۰، ۲۳۷
سنن ابن ماجہ ۲۳۷
سنن ابوداؤد ۲۳۷
سنن النسائی ۲۳۷
مسند احمد بن حنبل ۱۸۷

کتب اسلامیات، تفسیر وفقہ

تفسیر القرآن (از محمد عبدہ) ۱۸۹
تفسیر کبیر (از امام فخر الدین رازی) ۱۸۹
تفسیر بحر المحیط (جلد دوم) ۲۲۶
تفسیر المنار (از محمد رشید رضا) ۱۸۹
المفردات فی غریب القرآن (از امام راغب اصفہانی) ۱۸۷
فتح القدیر (جلد چہارم) ۲۵۲
چیلپی شرح فتح القدیر ۲۵۲
الزرقانی شرح مواہب اللدنیہ ۲۰۱
شرح نہج البلاغہ (از ابی الحدید) ۲۰۵
البدایہ شرح الہدایہ (فقہ کی کتاب) ۲۲۸، ۲۵۲
انسان العیون (مصنفہ علی بن برہان الدین الحلبی) ۲۵۵
مقالات اشعری (جلد اوّل) ۲۰۸

کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام

آئینہ کمالات اسلام ۲۷۰، ۲۷۱
ازالہ اوہام ۱۵۵، ۲۷۰، ۲۷۱
توضیح مرام ۱۵۵، ۲۷۱

کتب تاریخ وسیرت

سیرت رسول اللہؐ (از عبد الملک بن ہشام) ۵۰، ۱۸۶
۱۹۵ تا ۱۹۷، ۱۹۹ تا ۲۰۲، ۲۰۸، ۲۵۵ تا ۲۵۷، ۲۶۱، ۲۶۳
سیرت محمد (از واشنگٹن ارونگ) ۲۷
دنیا کا ہادی اعظم غیروں کی نظر یں (مرتبہ سردار جوند سنگھ) ۲۸
برگزیدہ رسول غیروں میں مقبول (از مہاشہ فضل حسین) ۲۹ تا ۳۱
تاریخ محمدی (از ڈاکٹر اے سپرنگر) ۲۶
تاریخ الرسول والملک (از ابوجعفر محمد ابن جریر الطبری) ۲۰۴
کتاب الامّ (از امام محمد ادریس الشافعی) ۲۰۳، ۲۰۴
اہل عرب کی سپین کی تاریخ (مصنف ہنری کوپی) ۲۶

متفرق کتب

اخبارات ورسائل